عشق کا قاف
امجد جاوید

حرفِ چند

عشق کا شین (حصہ اوّل ودوم) نے قارئین محترم کی جانب سے پسندیدگی اور پذیرائی کی جو سند حاصل کی، بلاشبہ وہ بے مثال ہے۔اس کا ثبوت وہ سینکڑوں آراء اور تبصرے ہیں جو ہمیں مختلف ذرائع سے موصول ہوئے۔انہی آراء اور تبصروں سے جہاں ہماری حوصلہ افزائی ہوئی، وہاں اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی بھی خواہش کی گئی۔شروع میں تو یہ خواہش قدرے دھیمی محسوس ہوئی تھی،لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہش باقاعدہ اصرار میں تبدیل ہوگئی۔جس نے ہمیں نہ صرف سوچنے پر مجبور کردیا بلکہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔اب دو ہی صورتیں ہمارے سامنے تھیں کہ یا تو عشق کا شین حصہ سوم قارئین محترم کی خدمت میں پیش کیا جائے یا پھر ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے ''عشق کا قاف'' منظر عام پر لائی جائے۔سو پہلی آپشن ابھی زیرِغور ہے جبکہ عشق کا قاف تمام تر مراحل طے کرکے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جس طرح عشق کا شین کا موضوع، اسلوب اور طرزِ تحریر پوری طرح منفرد ہے، اسی طرح عشق کا قاف میں جو داستان بیان کی گئی ہے اس کا ماحول اور کردار بھی مثالی ہیں۔یہ کوئی تخلیقی یا ماروائے عقل نہیں بلکہ ہماری جیتی جاگتی زندگی سے لئے گئے ہیں۔داستان کے تانے بانے اور اس ماحول اور کرداروں کے تناظر میں جب ہم جدید دنیا کو دیکھیں تو نئی سوچوں کو بنیاد ملتی ہے۔ ہمارے نزدیک کسی بھی زندہ تحریر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس سے نئی سوچوں کو کی بنیاد ملے اور نئے خیالات کی تعمیر کا باعث بن جائیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں زندگی ہمکتی ہوئی دکھائی دے۔جس سے ہمیں اپنی زندگی کو سمجھنے کا موقع ملے۔ ''عشق کا قاف'' میں یہ ساری خصوصیات

بدرجہ اتم موجود ہیں۔

"عشق کا قاف" لکھنے والے جناب امجد جاوید اس سے پہلے "عشق کا شین" (حصہ دوئم) نہایت محنت، خوش اسلوبی اور لگن سے لکھ چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محترم قارئین کی خواہش اور اصرار میں جناب امجد جاوید کے طرزِ تحریر اور اسلوب کی پسندیدگی بھی پوری طرح شامل ہے۔ اسی لئے ہم نے عشق کا قاف تحریر کرنے کے لئے انہیں کہا۔ جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے نہ صرف قبول کیا بلکہ مزید محنت، لگن اور خوبصورتی سے لکھا۔ کیونکہ ان کی اس کاوش میں محترم قارئین کی محبتیں بھی شامل ہیں۔ اپنے خاص طرز اسلوب کے ساتھ جناب امجد جاوید نے اسے خوب نبھایا۔ ان ساری باتوں کا اندازہ آپ "عشق کا قاف" پڑھنے کے بعد بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اسی لئے ہم اسے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ آپ قارئین محترم کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ یہ بھی سند قبولیت حاصل کرے گی۔ (انشاءاللہ)

(گل فراز احمد)

ناشر

قافِ عشق

عشق، وحدت کی علامت ہے۔ یہ وہ باطنی کشش کا اثر ہے کہ جس میں نگاہ، جمالِ محبوب پر ہی لگی رہتی ہے۔ عاشق کا سارا دھیان، گیان اور وجدان فقط ایک ذات کے لئے مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عاشق کی اپنی ذات بھی معشوق کے تابع ہو جاتی ہے۔

عشق کا پودا، دل کی زرخیز زمین پر آشنائی کے بیج سے اُنسیت کا روپ لے کر پھوٹتا ہے۔ موافق ماحول میسر آجانے سے یہ پودا محبت کے تناور درخت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جس کا پھل عشق ہے۔ شدت طلب کے باعث اس پھل کو چکھنے والا، اسی لذت کا ہو کر رہ جاتا ہے کہ پھر کوئی اور ذائقہ اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ سارے ہی ذائقے حواس سے محو ہو جاتے ہیں۔

لفظ عشق کو اہل لغت "عشقہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو ایک بیل کا نام ہے۔ اور وہ شاداب درختوں پر بسیرا کر کے دن بدن پھلتی پھولتی اور پرورش پاتی ہے۔ یہاں تک کہ سرسبز درخت کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ یہاں ذکر یہ نہیں ہے کہ عشق کیا ہے؟ کیونکہ عشق کی شرح کوئی اور نہیں، خود عشق کرتا ہے۔ ہاں مگر ادب صوفیہ میں عشق مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور اپنی سمجھ خود عطا کرتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اہل صوفیہ کا طریق اور اعمال کی بنیاد عشق پر ہوتی ہے۔ سو حضرات صوفیہ کا اجماع ہے کہ عشق رب کائنات کے رموز میں سے ایک خاص اور اعلیٰ راز ہے، جسے وہی جانتا ہے جس پر عشق کا نزول ہوتا ہے اور عشق انہی پر اترتا ہے جو عشق کے لئے اہل ہوتے ہیں۔

جس طرح دل کو عرش الٰہی کہا گیا ہے۔ اسی طرح عشق کے لئے بھی ایسی خاص ذات

درکار ہوتی ہے جس میں نہ صرف جذب کی اعلیٰ صلاحیت ہو بلکہ تسلیم و رضا میں درجہ کمال تک پہنچا ہوا ہو۔ ان دونوں خصوصیات میں پاکیزگی شرطِ اول ہے۔ کہ نماز بغیر وضو کے نہیں ہوتی۔ اہل عشق وہی ہوتے ہیں جو پاکیزگی کو اپنا وطیرہ بناتے ہیں۔ یوں عشق اور تزکیہ لازم و ملزم قرار پاتے ہیں۔

جس طرح حقیقتِ عشق سے انکار نہیں ہو سکا، اسی طرح اہل علم نے اپنی سہولت کے لئے عشق کو اقسام میں بانٹ کر درجہ بندی کر دی۔ جبکہ عشق، عشق ہے۔ وہ حقیقی ہو یا مجازی، اختیاری ہے یا غیر اختیاری ہے، اس کی راہ میں رکاوٹیں لئے مقامات آتے ہیں لیکن......! اس کی منطقی منزل معرفتِ حق ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

عشق ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب یہ کسی من میں اتر جاتا ہے تو پھر ظاہری صفات و اثرات ہی سے عشق کا پتہ چلتا ہے کہ اس من میں قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جو فقط اور صرف اپنے معشوق کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ مبارک ہیں وہ من، جن میں عشق الٰہی اترتا ہے۔ تب پھر ان کے لئے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک وجہ تخلیق کائنات نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے عشق سے سرفرازی نصیب نہ ہو جائے۔ یہی عشق ہے جو انسانوں کو تمام تر دشواریوں سے نکال کر حضوری میں لا کھڑا کرتا ہے کہ وہ قبولیت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ راہِ عشق کی منطقی منزل قبولیت ہی تو ہے۔

عشق......! جو ع، ش اور ق کے تین حروف سے مل کر لفظ بنا ہے، اپنے حروف میں بھی جہان معنی لئے ہوئے ہے۔ جس طرح عشق کی شرح عشق ہی کرتا ہے، اسی طرح اس کے حروف میں چھپے معنی وہی بیان کر پاتا ہے۔ جو اہل عشق ہوں یا ان کی نسبت اہل عشق سے ہو۔ کیونکہ جس من نے عشق کو جس طرح محسوس کیا، اسی طرح عشق کے صفات و اثرات بیان کیے۔ وارداتِ قلبی ہو یا کیفیاتِ باطنی، منازل عشق کی سرگزشت ہو یا مقامات عشق کا احوال، جس نے عشق کو جیسا پایا، اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی۔

”عشق“ کو غور سے دیکھیں، عشق کے عین کا مطلب عمل ہے، جو کیا جاتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے نا کہ عشق وارد ہو اور بندہ بے عمل ہو جائے۔ کیونکہ وادات عشق کے بعد انسان میں نئی قوت، نئی تحریک اور نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے جو قرب معشوق کے لئے ہمہ وقت آمادہ رکھتا ہے۔ عشق کے شین کا مفہوم ہے، شدت۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ عشق بھی ہو اور اس میں تنزلی واقع ہو جائے۔ عشق تو محو پرواز

رکھتا ہے اور اڑان میں نگاہ افلاک پر ہوتی ہے۔ اور عشق کے قاف کا معنی ہے قبولیت، جب عمل میں شدتِ خلوص ہونے پر قبولیت کا درجہ پا لیتا ہے تو پھر عشق کے اثرات کا ظہور ہوتا ہے۔

عشق کا قاف......! کہانی ہے ان کرداروں کی جن کے اعمال میں شدتیں آئیں اور وہ قبولیت کے مقام تک جا پہنچیں۔ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا اور کیونکر ہوا؟ یہ سب بیان کرتے وقت میں بھی صحرا نوردی میں رہا۔ ظاہر ہے صحرا نوردی میں پیاس بھی بھڑک اٹھتی ہے اور آبلہ پائی سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ ہاں مگر......! وہ حیرتیں، جن سے میرا سامنا ہوا، دوران مطالعہ امید ہے کہ آپ بھی اسے محسوس کریں گے۔ کہیں پر بات کھولنا پڑی اور کہیں محض اشاروں تک کا حکم رہا۔ ممکن ہے بعض مقامات پر آپ مجھ سے متفق نہ ہوں۔ اور آپ مجھے کوئے ملامت تک لے آئیں، مگر یہ کوئی نئی اور انہونی بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ سچائی ہمیشہ کوئے ملامت میں ہی نکھرتی ہے۔ میں اس بات کی تائید میں الفاظ کا ڈھیر لگا سکتا ہوں مگر......! جان لیں، کبھی کبھی دیوانے کی بڑبڑاہٹ میں بھی معنی مل جاتے ہیں۔ اور یہ معنی انہی کی سمجھ میں آتے ہیں جو واقفِ راز ہوں۔

عشق کا قاف......! کے بارے میں محض اتنا کہوں گا کہ یہ مراقبہ کے بعد والی تاثراتی کیفیت کی مانند ہے۔ جس میں بہت کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ اور کچھ نہ کہنے کی سعی میں بہت کچھ سرزد ہو گیا۔ تاہم میں نے اس امید پر ان لفظوں کو جوڑا ہے کہ عقل مند را اشارہ کافی است۔ دعا گو ہوں کہ میری یہ کاوش قبولیت کا باعث بن جائے۔

طالب دعا
امجد جاوید
18۔ رانا ٹاؤن، حاصل پور
فون: 0333-6347166

عشق اولڑی پیڑ وو
لوکاں خبر نہ کائی

صحرائے چولستان میں ریوڑ چراتے ہوئے سانول کے ہونٹوں پر خواجہ غلام فرید سائیں کے یہ بول تھے۔ وہ ان بولوں کو پورے جذب سے یوں گا رہا تھا کہ جیسے یہ لفظ اس کے دل سے نکلنے والی فریاد ہو۔ اس پر تو جیسے وجد طاری تھا۔ اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی بلند آواز صحرا کی وسعت میں تحلیل ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اندر سے اٹھنے والے طوفان کی شدت کا اندازہ، اس کا چھڑی پکڑنے سے لگایا جاسکتا تھا۔ جو اس نے بہت مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ لمبے تڑنگے مضبوط جسم والے سانول کے معصوم چہرے پر سرخی نمایاں ہو رہی تھی۔ سفید کُرتے اور نیلی دھوتی کے ساتھ سر پر بڑا سا کپڑا بندھا تھا۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھا ہوا مستی میں گا رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ریوڑ کی بکریاں، گائیں اور اونٹ اپنی موج میں چر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سانول کی آواز اس طرح بلند ہوتی چلی جارہی تھی جس طرح مشرقی افق سے ابھرتا ہوا سورج اپنی تاب دکھانے کے لیے سرخ سے سنہری ہوتا چلا جارہا تھا۔

صحرائے چولستان کی بھوری ریت پر تاحدِ نگاہ صبح کی کرنیں پھیل چکی تھیں۔ صحرا کے فطری سناٹے میں دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا نے ایسی گونج کو جنم دے دیا ہوا تھا جس میں خوف تھا۔ اگرچہ صحرا کی صبح اور ڈھلتی ہوئی شام دل آویز ہوا کرتی ہے مگر اس صبح ویرانے کے حسن پر

کچھ اس طرح کا خوف طاری تھا کہ جیسے کوئی انتہائی خوشی کے عالم میں اپنے سامنے موت کا چہرہ دیکھ لے۔ وہ مارچ کے اوائل دن تھے۔ جب صحراؤں کی صبح روشن اور ٹھنڈی ہوا کرتی ہیں۔ پرندے اپنے رزق کی تلاش میں کب کے اپنے ٹھکانوں سے نکل چکے تھے۔ صحرا کی خوف ناک گونج میں جب بھی کوئی پرندہ بولتا، ایسے میں یہی آواز زندگی کا استعارہ معلوم ہوتی۔ گہری سبز جھاڑیوں اور اکادکا ببول (کیکر) کے درختوں میں سے بولنے والا پرندہ دکھائی تو نہ دیتا لیکن زندگی کا احساس ضرور دے دیتا۔ شاید وہ بھی اس ویرانے میں اپنی آواز کی بازگشت میں ڈر جاتا اور پھر سہم کر چپ ہو جاتا۔ ایسے میں سانول کی مضبوط اور دردناک آواز میں خواجہ غلام فرید سائیںؒ کی کافی نہ صرف من کے اظہار کا وسیلہ بن رہی تھی بلکہ اس ویرانے میں ان دیکھے خوف کا اثر زائل کر رہی تھی۔ سانول جذب سے گا رہا تھا۔

عشق اولڑی پیڑ وو
لوکاں خبر نہ کائی

(عشق انوکھا درد ہے جس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہے)

اس کی آواز میں درد کچھ مزید بڑھ گیا تھا۔ جیسے من میں لگی ہوئی آگ مزید بھڑک اٹھی ہو اور اس کے دھویں نے سانول کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا تھا۔ وہ اپنے ریوڑ سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا۔ جس جگہ سانول بیٹھا ہوا تھا وہ ریت کا ایک ایسا ٹیلہ تھا جس سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کا ریوڑ گہری سبز جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں کو چرتا ہوا کافی حد تک پھیل چکا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر نوعمر بھیرا رومال میں بندھی ہوئی روٹی لا رہا تھا۔ جس کی سانول کو خبر نہیں تھی۔ وہ تو بس پورے جذب اور خلوص سے گا رہا تھا عشق اولڑی پیڑ وو۔ لوکاں خبر نہ کائی۔

سانول کی محویت اس وقت ٹوٹی جب بھیرا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سانول نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور بھیرے کی طرف دیکھا۔ تب اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"تو نے بہت دیر کر دی؟"

"نہیں بھالا......! میں تو وقت پر ہی آیا ہوں۔ مگر یہ تیری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں۔ تو رو رہا ہے؟" بھیرے کے لہجے میں حیرت کے ساتھ دکھ بھی تھا تو سانول چونک گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پگڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے

ہوئے بولا۔

"ارے نہیں......! ریت پڑ گئی ہوگی آنکھ میں۔"

"نہیں بھالا......! کوئی اور بات ہے۔ مجھ سے تو جھوٹ نہ بولو" نوعمر بھیرے نے اپنے سے بڑے سانول سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔ اتنا چھوٹا سا لڑکا اور اتنی بڑی بات کہہ دی۔ تب وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔

"تم ابھی چھوٹے ہو، اس لئے اتنی بڑی باتیں مت کرو۔ لاؤ کیا لائے ہو۔"

"بھالا......! تم چاہے مجھے نہ بتاؤ، لیکن میں تھوڑا بہت جانتا ضرور ہوں۔ خیر یہ لے روٹی۔"

بھیرے نے رومال میں بندھی ہوئی روٹی اسے تھما دی اور اس کے ہاتھ سے چھڑی لے کر ریوڑ کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ سانول نے کاندھے سے صراحی اتاری، رومال کھولا اور روٹی کھانے لگا۔

اس وقت وہ روٹی کھا کر پانی پی رہا تھا جب بھیرا اس کے پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ سانول نے دیکھا اور پھر صراحی کا منہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھیرا، کیوں پریشان ہو؟"

"بھالا......! ادھر دیکھو......وہ ادھر......!" بھیرے نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سانول نے غور سے اس طرف دیکھا تو چونک گیا۔ سانول صحرائی باشندہ تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے پر بھی الجھن واضح ہو گئی۔

زمین پر بچھی ہوئی سنہری ریت، سورج کی کرنوں سے چمک کر جس قدر خوبصورت نظارہ پیش کرتی ہے، اس قدر یہ پیاسی بھی ہوتی ہے۔ اتنی پیاسی کہ بادل بھی اس کی پیاس بجھانے سے ڈرتے ہیں۔ تپتی ہوئی ترسی ریت میں اس قدر بے چینی ہوتی ہے کہ کوئی صورت برقرار رکھ ہی نہیں پاتی۔ یہاں تک کہ کوئی راستہ برقرار نہیں رہ پاتا۔ راستے ٹیلوں میں اور ٹیلے ہواؤں کی سازش سے اپنا وجود ختم کر بیٹھتے ہیں۔ شفاف نیلا آسمان دن بھر ریت کی بے چینی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر جب کبھی اسے اس ریت پر ترس آتا ہے تو بادل بھیج دیتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ریت کی بے چینی کو قرار آ جاتا ہے۔ مگر کب تک؟ ریت تو اس آنکھ مچولی کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ وہ کسی بھی نئے آنے والے مسافر کو الجھا کر رکھ دیتی ہے۔ سراب کی جھلکیوں میں مسافر چلتے رہنے پر مجبور ہوتا

ہے۔ یہاں تک کہ ریت کی بھل بھلیاں اسے جان ہار دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شاید صحرا کسی اجنبی کو قبول کرنے میں وقت لیتا ہے۔ یا پھر...... ! قبول ہی نہیں کرتا؟

سانول کی نگاہ دور تک پھیلی ہوئی سنہری ریت اور نیلے آسمان کے ملاپ کے درمیان ان گدھوں پر تھی جو تیزی سے پرواز کر رہے تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہاں کوئی زندہ وجود ہے لیکن موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنے طور پر فاصلے کا تعین کیا اور پھر تیزی سے بولا۔

”او بھیرے...... ! تم ریوڑ کا خیال رکھنا، میں ابھی آیا۔“

”مگر بھالا...... ! ذرا سنبھال کر......“ بھیرے نے خوف ملے لہجے میں خبردار کرتے ہوئے کہا۔

”تو فکر نہ کر......؟“ سانول نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے ریوڑ کو دیکھا۔ بکری، گائے اور اونٹ سبھی پرسکون تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے پسندیدہ اونٹ کے پاس پہنچا۔ اسے بٹھایا اور پھر اس پر سوار ہو کر اس جانب چل پڑا۔ جہاں گدھ منڈلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا۔

سانول کے سامنے ایک نوجوان لڑکا بے ہوش پڑا تھا۔ ٹیلے کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے ابھی تک وہ سائے میں تھا، لیکن دھوپ اس سے اتنی زیادہ دور نہیں تھی۔ تھوڑے سے وقت کے بعد دھوپ اسے جھلسانے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا میں تیزی آ رہی تھی۔ مگر اس وقت تک ریت نے اس نوجوان کے وجود کو ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ نیلی جین اور سفید ٹی شرٹ ریت میں اَٹے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوگر تھے۔ سر کے بال ریت سے سنہرے ہو رہے تھے۔ اور چہرے کے خدوخال ماتھے سے نکلنے والے اس خون کی وجہ سے واضح نہیں تھے جو جم کر سیاہ ہونے کو تھا۔ پہلی نگاہ میں یوں ہی لگ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ سانول کو بھی ایسے ہی لگا تھا۔ اس نے اونٹ کو بٹھایا، اترا اور اس نوجوان کے پاس جا پہنچا۔ تب اس نے غور کیا۔ اس کی سانسیں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ بے ہوش نوجوان کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ سانول نے اس کی نبض ٹٹولنے کے لئے اس کی کلائی پکڑی تو یوں لگا جیسے انگارہ اس نے ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اس نوجوان کو بہت تیز بخار ہو چکا تھا۔ اس ویرانے میں شاید کوئی اور ہوتا تو خوف زدہ ہو گیا ہوتا۔ مگر سانول نے تو آنکھ ہی اس صحرا میں کھولی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے وقت میں کیا کرنا ہے۔ اس نے اردگرد دیکھا، دور دور تک کوئی نہیں تھا، بہت دور اس کا ریوڑ چر رہا تھا۔ یہ بھی اس کا اندازہ ہی

تھا۔ سانول اس نوجوان کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے کاندھے پر سے صراحی اتاری اور پانی سے اپنا چلّو بھرا اور پھر اس نوجوان کے منہ پر دے مارا۔ بے جان سے وجود میں ایک ہلکی سی لرزش ہوئی تو سانول کو امید بندھ گئی۔ اس نے جلدی سے دوبارہ چلّو بھرا اور اس کے منہ پر مار دیا۔ اس کی یہ کوشش بار آور ہوئی۔ نوجوان کا وجود جیسے جاگ گیا۔

”پانی...... !“ اس نوجوان نے کسمساتے ہوئے دھیرے سے کہا تو سانول کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ اس نے نوجوان کو سیدھا کیا اور چند قطرے پانی کے اس کے لبوں پر ٹپکا دیئے۔ نوجوان کے پپڑی جمے ہونٹ پانی کا لمس پاتے ہی حرکت میں آ گئے جیسے کوئی نیند کی حالت میں پانی پینے کی کوشش کرتا ہے۔

”پانی...... !“ وہ نوجوان یوں بولا جیسے نقاہت کے باوجود شدت سے کچھ مانگنا چاہ رہا ہو......

”اٹھو...... ! آنکھیں کھولو...... !“ سانول نے اس کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بس اتنا ہی کہا۔

”پانی...... !“ نوجوان کے لہجے میں انتہائی بے بسی تھی۔

”پانی بھی ملے گا، مگر تم آنکھیں تو کھولو...... ہوش تو پکڑو“ سانول نے اسے اُمید دلائی تو اس نوجوان نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ ہونقوں کی مانند سانول کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر جیسے ہوش میں آتے ہی چونک گیا۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا اور پھر لق ودق وسیع صحرا کو پا کر اس کے چہرے پر خوف اتر آیا۔ مگر یہ خوف چند لمحے اس کے چہرے پر رہا۔ جیسے لاشعوری طور پر حیرت نے اسے خوف زدہ کر دیا ہو۔

”مم...... مم...... میں...... کہاں ہوں......“ نوجوان نے پورے جوش سے کہنا چاہا مگر شدتِ نقاہت کے باعث اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

”تم...... روہی میں ہو...... !“ سانول نے دھیرے سے کہا۔ پھر اس کی توجہ اس جانب سے ہٹاتے ہوئے اس نے نوجوان کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اٹھو...... ! تھوڑا سا پانی پی لی...... !“

نوجوان نے خود اٹھنا چاہا مگر بے بس ہو کر گر گیا۔ سانول نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سانول نے صراحی سے پانی کا چلّو بھرا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

جیسے نوجوان نے فوراً ہی پی لیا۔ وہ مزید پانی پینا چاہ رہا تھا، اس لئے ممنونیت بھری ترسی نگاہوں سے سانول کی جانب دیکھا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں......! ابھی نہیں، کچھ دیر بعد جی بھر کے پی لینا......''

''مجھے بہت پیاس لگی ہے۔'' نوجوان نے نقاہت بھرے لہجے میں بے بسی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے، لیکن ابھی نہیں......!'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا اور پھر بولا۔

''تمہارے زخم بھی ہیں، اور تجھے تیز بخار بھی ہے، کیا تجھے اس کا احساس ہے۔''

''ہاں......! میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ مجھ سے ہلا ہی نہیں جا رہا ہے۔ نوجوان نے آنکھیں موندتے ہوئے نقاہت سے کہا تو سانول بولا۔

''چلو......! میرے ساتھ چلو......!''

''کہاں......؟'' نوجوان نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہیں نزدیک ہی ہماری بستی ہے۔ تم گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا، اٹھ، کوشش کرو۔''

''کیا میں پیدل وہاں تک......'' نوجوان نے کہنا چاہا مگر اس کی نگاہ سانول کی اوٹ میں جگالی کرتے ہوئے اونٹ پر پڑی۔ تبھی اس کی آنکھوں میں جیسے روشنی چمک اٹھی۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں......چلو......''

نوجوان نے کہا تو سانول اس کو اٹھانے کے لئے سہارا دینے لگا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں طلبہ و طالبات کی آمد و رفت سے رونق بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے صبح کے وقت جو ہو کا عالم تھا، دن کا پہلا پہر ڈھل جانے کے بعد ہر طرف رنگین آنچل، قہقہے، دھیمی دھیمی باتیں اور چہل پہل سے ماحول بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ مارچ کے اوائل میں بہار اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ان دنوں میں بھاری ملبوسات کی جگہ ہلکے ہلکے لباس پہننے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور پھر لباس کو بھی اہمیت تبھی دی جاتی ہے جب خوبصورت لگنا اچھا لگ رہا ہو۔ بہار کے خمار آگیں دن اور اچھا لگنے کی لاشعوری خواہش نے ان طلبہ و طالبات میں ایک خاص قسم کی جولانی بھر دی تھی۔ جس سے ماحول تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ جس میں سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس دن باوجود یہ سب کچھ ہونے کے ابلاغیات کے شعبہ میں ایک عجیب قسم کا ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہر

چہرہ خاموش تھا اور اس پر تجسس کا ایک سوالیہ نشان تھا۔ گو مگو کی اس کیفیت میں نورین ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جیسے کسی اندر کے دکھ نے اسے خوشی سے دور کر دیا ہو۔ وہ بہت کچھ سوچتی چلی جا رہی تھی لیکن کسی بھی سوچ کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بظاہر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی مگر اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ساری سوچیں ایک نقطے پر آ کر ایک دوسرے سے الجھ گئی ہیں۔ جب اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے اپنا سر جھٹکا اور اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے فرزانہ خان نے آنا تھا اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور دھیرے سے بڑبڑائی۔

''اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔''

یہ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ سرخ رنگ کی نئی کرولا اسے آتی ہوئی دکھائی دی۔ سبز درخت، سیاہ تارکول کی سڑک جس پر پیلے پتے پھیلے ہوئے تھے، انہیں پیلے پتوں کو روندتی وہ دھیرے سے آ رہی تھی۔ پارکنگ میں گاڑی لگانے کے چند لمحوں بعد فرزانہ خاں گاڑی سے نکلی۔ پیازی رنگ کے کاٹن شلوار قمیض کے ساتھ کاندھے پر جھولتا ہوا آنچل، جس پر ہلکے سبز رنگ کا کام ہوا تھا۔ نازک سے سلیپر، جس میں اس کے گلابی پاؤں جھلک رہے تھے۔ کاندھوں سے اوپر تک کٹے ہوئے ریشمی بال، جنہیں بہت محنت سے سٹائل دیا ہوا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ کاگل، گلابی ہلکی لپ اسٹک، بڑے بڑے جھمکے، شفاف گلابی جلد...... براؤن پرس پکڑے وہ خراماں خراماں ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ ہر طرف سے بے نیاز یوں ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہی تھی جیسے اسے اپنے اردگرد کی خبر ہی نہ ہو۔ بس اس نے ایک نگاہ دوسری منزل پر کھڑی نورین کو دیکھا اور پھر اس دھیمی رفتار سے یوں چلتی گئی جیسے کوئی شہزادی اپنے محل سرا میں چہل قدمی کر رہی ہو۔

''آج تمہیں کچھ دیر نہیں ہو گئی۔'' نورین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو فرزانہ خان نے پہلے اپنے گاگلز اتارے اور اپنی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھوں سے نورین کی طرف دیکھا، قدرے مسکرائی اور پھر بولی۔

''ہاں......! دیر تو ہو گئی ہے مگر مجھے جلدی اور دیر سے کیا۔''

''ہوں......! تمہیں کیا، تم کون سا یہاں پڑھنے آتی ہو۔ ویسے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تمہیں یہاں آنے اور اتنی زحمت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آرام سے گھر میں رہو تمہاری ڈگری تو گھر میں بھی پہنچ سکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ارے نورین......! یہ حقیقت ہے کہ میں گھر میں بیٹھ کر بھی ڈگری لے سکتی ہوں۔ مگر گھر میں رکھا ہی کیا ہے، ماں ہے نہیں، باپ ہے، جسے اپنی جاگیرداری، بزنس اور سیاست سے فرصت نہیں۔ یہاں تم ہو، اور وہ دشمنِ جاں۔ دل بہل جاتا ہے یہاں پر۔'' فرزانہ خان نے خوشگوار لہجے میں نورین کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا تو نورین حیرت زدہ رہ گئی پھر قدرے سنبھلتے ہوئے بولی۔

''میں تو یہاں ہوں۔ لیکن تمہیں اپنے دشمن جان کی خبر ہے کہ نہیں؟''

''کیا ہوا ہے اسے؟'' فرزانہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''عجیب بے خبر ہو تم......! دشمن جاں پر مرتی بھی جا رہی ہو اور اس کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔'' نورین کے لہجے میں انتہائی درجے کا طنز تھا۔

''یہ تم آج اتنی شکل بگاڑ کر، اتنے کاٹ دار لہجے میں کیوں بات کر رہی ہو۔ کیا معلوم کرنا ہے اس کے بارے میں۔؟'' فرزانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تو سنو بے وقوف......!'' نورین نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''رات بوائز ہاسٹل میں اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ فائرنگ بھی ہوئی، دو لڑکے ہسپتال میں ہیں اور......''

''بہت بڑی خبر سنائی ہے تم نے'' فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ تو روزانہ کا معمول ہے، ان لڑکوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے۔ کسی بے چارے نے انہیں بھتہ نہیں دیا ہوگا۔ مزاحمت......''

''فضول بکے جا رہی ہو......'' نورین نے ڈانٹتے ہوئے کہا، پھر ایک لمحہ ٹھہر کر بولی۔ ''وہ تمہارا دشمن جان ہے نا علی صاحب......! اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ انہی کی لڑائی ہوئی ہے۔ افواہ یہی ہے کہ وہ اغواء ہو گیا ہے۔'' اس نے تیزی سے اپنی بات ختم کی۔

''علی......! اغواء......؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' فرزانہ نے لاپرواہی سے کہا اور پھر طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اسے کون اغواء کرے گا نورین۔ ہنگامے کی وجہ سے اِدھر اُدھر کہیں چھپا بیٹھا ہوگا بزدل......!''

''بزدل......!'' نورین نے حیرت سے کہا۔ پھر فرزانہ کے چہرے پر دیکھتی ہوئی بولی۔

''تم...... کیا فرزانہ تم اسے بزدل کہہ سکتی ہو......؟''

''ہاں......! میں کہہ سکتی ہوں اسے بزدل...... وہ شخص جو میرا سامنا نہیں کر سکتا۔ زندگی

کی ان راہوں پر چلنے کے لیے میرا ساتھ نہیں دے سکتا، جو پیار جیسے انمول جذبے کی قدر نہیں کر سکتا۔ وہ بزدل ہی ہے نا......'' فرزانہ دانت پیستے ہوئے غصے میں کہتی چلی گئی۔ جس پر نورین چند لمحے خاموش رہی پھر تھوڑا نرم لہجے میں بولی۔

''فرزانہ......! تم نے خواہ مخواہ اس سے دشمنی پالی ہوئی ہے۔ ایویں خواہ مخواہ کا محاذ جنگ شروع کیا ہوا ہے تم نے...... وہ بے چارہ تو......''

''وہ بے چارہ نہیں ہے......! ٹھیک ہے، اگر اسے میری دوستی، میرا پیار قبول نہیں ہے تو نہ سہی......! دشمنی تو رہے گی نا، دوستی ہو یا دشمنی...... تعلق تو رکھنا ہے اس سے نورین بی بی۔''

''تم غلط سوچ رکھتی ہو......! وہ عام لڑکوں کی طرح نہیں ہے۔ تم نے ہمیشہ اسے سمجھنے کی غلطی کی ہے۔ وہ مختلف ہے۔ تم فقط اپنی ذات......!''

''شٹ اپ نورین......! تم میری دوست ہو یا اس کی۔ جو اس کی وکالت کرتی چلی جا رہی ہو۔ کیا تم مجھے نہیں سمجھتی ہو۔ کیا اس کے لئے میرے جذبات میں کوئی کھوٹ ہے؟ تم تو سب جانتی ہو، پھر بھی......؟''

''میں جانتی ہوں۔ مگر میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم اسے غلط......''

''چلو...... چلیں......! کلاس کا وقت ہو رہا ہے، تمہاری وکالت تو سارا دن جاری رہے گی......!'' یہ کہتے ہوئے فرزانہ آگے بڑھ گئی۔ نورین چند لمحے کھڑی اس کی حالت دیکھتی رہی اور پھر وہ بھی اس کے پیچھے کلاس روم میں چلی گئی۔

لیکچر جاری تھا۔ سٹوڈنٹس بہت تھوڑے تھے۔ فرزانہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا رخ تو لیکچرار کی جانب دیکھا۔ لیکن ذہن وہاں نہیں رہا تھا۔ آج اسے کلاس بے حد سونی دکھائی دے رہی تھی۔ علی اپنی مخصوص نشست پر موجود نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے لیکچرار کی آواز معدوم ہوتی چلی جاری تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے علی کا چہرہ پوری جذبات کے ساتھ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ علی نجانے اس وقت کہاں ہوگا......؟

☆☆☆

کچے مکانوں سے بنی اس چھوٹی سی کچی بستی کے باہر جنڈ کا گھنا درخت تھا۔ جس کے چھاؤں تلے وہ بوڑھا سفید ریش شخص گدڑی بچھائے بیٹھا تھا۔ سفید کرتے اور سفید رنگ کی دھوتی کے ساتھ سفید رنگ کے بڑے سے رومال سے اپنا سر ڈھانپے ان لوگوں سے محوِ گفتگو تھا جو اس کے

سامنے بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔وہ سفید ریش بوڑھا شخص مضبوط قد کاٹھ اور سرخ چہرے والا تھا۔اس کے چہرے مہرے اور گفتگو میں رعب و دبدبہ تھا۔لیکن لفظوں میں اس قدر ملائمیت تھی کہ اس کی باتوں کا ایک ایک لفظ ان لوگوں کے من میں اترتا چلا جارہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔

”اللہ سائیں نے جو انسان کو زمین پر بھیجا ہے۔تو کیا اسے یونہی بھیج دیا؟ یہی ایک بات ہے جس پر ہمیں غور وفکر کرنا چاہیے۔دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو اس زمین پر کیوں بھیجا گیا......؟ ہم اگر اس بات پر سوچیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم یہاں اس دھرتی پر کیوں ہیں۔اسی سے ہماری سوچ کھلے گی۔یہ زندگی جو ہمیں دی گئی ہے۔ہمارے اردگرد جو اتنے سارے منظر ہیں،ہواؤں میں اڑتے ہوئے یہ پرندے،اوپر دیکھیں تو یہ نیلا آسمان،یہ سب ہم سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس ہمارے لئے کون سا پیغام ہے۔ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا۔پھر......!ان سب سے اہم ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ انسان خود اپنے آپ پر غور کرے۔اپنی عظمت کا احساس کرے،اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس زمین پر کیوں موجود ہے۔انسان کیا ہے؟اور انسانیت کیا ہے؟ایک انسان،دوسرے انسان کی دوا کیسے بن سکتا ہے۔ان سب باتوں کا ہمیں پتہ ہونا چاہیے۔یہ اس لئے بھی ضروری ہیں کہ اگر ان باتوں کے بارے میں ہم جانیں گے تو ہی انسان کہلانے کے حق دار ہوں گے۔“وہ اتنی بات کہہ کر خاموش ہوئے تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

”میاں جی......!ایک طرف تو انسان اتنا باعظمت ہے،اتنی طاقت رکھتا ہے اور دوسری جانب انتہائی مجبور بھی ہے،آخر یہ سب کیا ہے؟“

”اصل میں تم انسان کی فطرت بارے بات نہیں کر رہے ہو بلکہ اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کے تسلط کی بات کر رہے ہو۔درحقیقت یہ بھی تو انسان کا اپنا کیا دھرا ہے۔یہ سارے قانون،رسم و رواج اور رسومات انسان کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔جو بہر حال محدود عقل رکھتا ہے۔یہ فطرت ہمیں خود سکھاتی ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ہمیں نہ تو فطرت کو سمجھنا آتا ہے اور نہ ہی فطرت کے دیئے ہوئے پیغام سمجھ رہے ہیں۔کیونکہ ہم اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔اب دیکھو......بظاہر یہ معمولی سی بات ہے لیکن سوچنے کے لئے بہترین نکتہ آغاز ہے۔اس دنیا کا طاقت ور ترین انسان بھی اسی ہوا کا اتنا محتاج ہے جتنا کہ کوئی مجبور شخص......!اللہ سائیں نے سب کو ایک جیسا نوازا ہے۔یہی حال دھوپ کا ہے،یہی بارش کا۔“

”سبحان اللہ......!“اس شخص نے بے ساختہ کہا تو دوسرے لوگ بھی دھیرے سے اللہ کی شان میں کلمات کہنے لگے۔اس سے پہلے کہ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھتا۔ان کی نگاہ بستی کی طرف سے آئے ہوئے سانول پر پڑی جو تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آرہا تھا۔اس کی چال میں کچھ ایسی بے چینی اور گھبراہٹ تھی کہ سبھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔وہ قریب آیا اور آتے ہی انتہائی ادب سے سلام کیا۔میاں جی نے بہت شفیق نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

”سانول پتر......!خیریت تو ہے نا؟“

”وہ میاں جی......!ایک اجنبی لڑکا ملا ہے مجھے۔اچھا خاصا زخمی ہے اور اسے تیز بخار بھی ہے۔میاں جی آپ اسے دیکھ لیں۔“سانول کے لہجے میں پریشانی گھلی ہوئی تھی۔

”کہاں ہے وہ؟“میاں جی نے متانت سے پوچھا۔

”میرے گھر میں ہے میاں جی،اس کی حالت بڑی خراب ہے ورنہ میں اسے......“

”چلو......چلو......دیکھتے ہیں اسے“میاں جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔پھر اپنے اردگرد لوگوں کی طرف دیکھ کر بولے۔”کیوں بھائیو......!اجازت ہے نا؟“

”ہاں ہاں میاں جی کیوں نہیں......!“تقریباً سب نے یک زبان ہو کر کہا تو وہ اٹھ گئے۔

جنڈ کے اس درخت سے لے کر سانول کے گھر تک تھوڑا سا فاصلہ تھا۔دونوں ذرا سی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔سانول کا گھر خاصا بڑا تھا۔جس کے ایک طرف ریوڑ کے لئے باڑہ بنا ہوا تھا۔اس باڑے میں ایک طرف گوپا بنا ہوا تھا جس میں ایک چارپائی اور چند پیڑھے رکھے ہوئے تھے۔اس ایک اکلوتی چارپائی پر وہ نوجوان اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔میاں جی نے پیڑھا اس کی چارپائی کے نزدیک کیا اور اس کی نبض دیکھی۔چند لمحے یونہی گزر گئے اور پھر سانول سے کہا۔

”اسے سیدھا کرو......!“

اس سے پہلے کہ سانول آگے بڑھتا،وہ نوجوان کسمسایا اور بڑی مشکل سے خود ہی سیدھا ہوگیا۔میاں جی نے اس کے چہرے کی جانب بڑے غور سے دیکھا۔چند لمحے یونہی گزر گئے۔اس لڑکے کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی جس سے میاں جی محویت کے عالم میں چلے گئے۔پھر چونک کر شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"بیٹے......! کیا نام ہے تمہارا؟"

"علی......! علی رضا" اس نے بمشکل دھیرے سے کہا تو میاں جی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تب وہ اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے بولے۔

"بہت پیارا نام ہے" اتنا کہہ کر انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر دھیرے سے بولے۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ اب تم ہمارے پاس ہو۔ اللہ سائیں سب ٹھیک کر دے گا۔" میاں جی کے لہجے میں کچھ ایسا اثر تھا کہ علی نے آنکھیں موند لیں۔ جیسے اسے اطمینان ہو گیا ہو کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

☆☆☆

نگہت بیگم اپنے چھوٹے سارے صحن کے ایک کونے میں تخت پوش پر بیٹھی غم سے نڈھال تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا، اس کے قریب ہی کرسیوں پر اس کی بیٹی فائزہ اور بیٹا احسن بیٹھے ہوئے تھے جو اسے بار بار حوصلہ دے رہے تھے۔ لیکن ایک ماں کی مامتا کو کسی طرح بھی سکون نہیں آ رہا تھا۔ قدرے فربہ مائل نگہت بیگم پہلے ہی کئی بیماریوں سے لڑ رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس چھوٹے سے آنگن میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم اور پر سکون زندگی گزار رہی تھی۔ وہ صبح اس کے لئے روح فرسا پیغام لے کر آئی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا اغواء ہو چکا تھا۔ جس کی اب تک کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا علی یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا۔ وہ ذہین، لائق اور فرمانبردار نوجوان تھا جس سے گھر بھر کی امیدیں وابستہ تھیں۔ فائزہ ابھی کالج میں اور احسن سکول کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ یوں یہ خاندان زندگی کی نرم چھاؤں میں دن گزارتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس صبح تیز دھوپ نے انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ وہ تینوں خاموش تھے۔ انہیں کسی اچھی خبر کی امید تھی۔

دروازہ بجا تو فائزہ جلدی سے اٹھ کر لپکی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ باہر اس کا باپ غلام نبی تھا جو ڈھیلے کاندھوں کے ساتھ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"کچھ پتہ چلا ابو......!" فائزہ نے امید اور نا امیدی کے ملے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں......! اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔" غلام نبی نے انتہائی مایوسی میں کہا تو نگہت بیگم اونچی آواز میں رونے لگی۔ پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"میرا بیٹا علی......! نجانے کہاں ہو گا۔ کس حال میں ہو گا میرا بچہ۔ اب تک اس کا کوئی

پتہ نہیں چلا......! اے اللہ......! اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔"

اس کے یوں کہنے پر فائزہ تڑپ کر بولی۔ "امی پلیز......! آپ صبر کریں۔ بھائی کے لئے دعا کریں۔ انشاءاللہ بہت جلد ان کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔"

"کچھ پتہ تو چلے نا......! میرے بیٹے نے ایسا کون سا جرم کر لیا تھا جو اسے اغواء کر لیا ہے۔ میرے اللہ......اسے اپنی پناہ میں رکھنا۔" نگہت بیگم دل خراش لہجے میں روتے ہوئے بولی۔

"بیگم......! اب تک تو یہی معلوم ہوا ہے کہ علی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے دوستوں نے یہی بتایا ہے کہ وہ تو حملہ آوروں کو بھی نہیں پہچانتے۔ حالات اور واقعات سے اندازہ یہی لگایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ صرف علی ہی کو اغواء کرنے آئے تھے۔" غلام نبی نے دھیرے دھیرے سے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"انہیں کیا دشمنی ہو سکتی ہے بھائی سے؟" احسن نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں......! بہر حال۔ رات جو یونیورسٹی ہاسٹل میں ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے اس کی رپورٹ درج کر لی ہے۔ دولڑکے ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ زخمی ہیں۔ دونوں کو گولی لگی ہے، علی غائب ہے۔ پولیس اپنی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے تو یہی کہا ہے کہ بہت جلد حملہ آوروں کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ اسی طرح علی کے بارے میں......"

"اس طرح خالی خولی باتوں سے بھلا کیا ہو گا علی کے ابا......! آپ کیا یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ خدا کے لئے کچھ کریں میرے بچے کے لئے، میرا بیٹا نجانے کس حال میں ہو گا۔ وہ کم بخت نجانے کیا سلوک کر رہے ہوں گے میرے بچے کے ساتھ، آپ کچھ کریں، خدا کے لئے کچھ کریں۔" نگہت بیگم نڈھال ہوتے ہوئے آہ و زاری کرنے لگی۔ مامتا کو کسی پل سکون نہیں آ رہا تھا۔

"بیگم......! اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں...... کہاں جاؤں؟" غلام نبی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اگلے ہی لمحے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "خیر......! میں جاتا ہوں ملک صاحب کے پاس۔ ان سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیا مدد کرتے ہیں۔"

"ہاں......! آپ ان کے پاس جائیں۔ اثر و رسوخ ہے ان کا۔ آپ بہر حال کچھ بھی کریں، مجھے میرا بیٹا چاہیے۔" نگہت بیگم نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لہجے میں انتہائی حسرت سے غلام نبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر باہر کی طرف چل دیا۔ آنگن میں ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ فائزہ اور احسن بھی کچھ دیر تک اسی خاموش ماحول میں بیٹھے رہے۔ تبھی احسن نے کہا۔

"فائزہ......! ابھی تک امی نے ناشتہ نہیں کیا، ان کے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔"

"نا......نہیں......! میرے لئے کچھ مت لانا، میرا جی نہیں چاہ رہا۔ تم لوگ کرلو ناشتہ۔"

یہ کہہ کر وہ روتے ہوئے بولی۔ "تم جاؤ......! تم بھی تو کچھ کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے امی......! میں بھی کوشش کرتا ہوں۔" احسن نے کہا اور اٹھ کر باہر جانے لگا تو فائزہ تیزی سے بولی۔

"بھائی......! کچھ کھالو......! پھر چلے جانا......پلیز۔"

"میرا ابھی جی نہیں چاہ رہا۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف چل دیا۔ آنگن میں پھر خوف سے بھری خاموشی طاری ہوگئی۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ سارے دن کا تھکا ہارا سورج مغربی افق میں ڈوب جانے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا۔ سنہری ریت کی چمک مدہم ہوگئی تھی۔ پرندے تیزی سے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس جا رہے تھے۔ سارا دن سرمستی میں سر پٹختے رہنے والی مست ہوا، شام ہوتے ہی یوں ساکت ہوگئی تھی جیسے تھکن سے چور چور ہوگئی ہو۔ ساکت سی ہوا کے باعث ماحول جیسے کچھ وقت کے لئے ایک جگہ تھم گیا ہو۔ اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے منظر عجیب قسم کی اداسی کا باعث بن رہے تھے۔ ایسے میں گوپے کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ علی نجانے کتنی دیر تک سویا تھا، اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا۔ مگر اس وقت وہ خود کو بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ صبح والی نقاہت اور زخموں سے اٹھتی ہوئی ٹیس بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔ شاید بخار بھی کم ہوگیا تھا کیونکہ اس پر جو مدہوشی طاری تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے لمحوں میں اسے سب سے پہلے اپنے محسن کا خیال آیا جس نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ اس کا یہ پختہ ایمان تھا کہ زندگی اور موت دینے والی فقط ایک ہی ذات ہے اور وہ ہے اللہ......! مگر وہی اللہ انسانوں کے روپ میں یا پھر کسی طرح بھی وسیلہ پیدا کر دیتا ہے۔ سانول اس کے لئے زندگی کا وسیلہ ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کا محسن تھا۔ کسی بھی محسن کے لئے اس کے دل میں بے انتہا قدر رہا کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا، اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر عجب

بے بسی تھی۔ وہ گوپے میں موجود گھپ اندھیرے میں پڑا اس کا فقط انتظار کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اسے دوسرا خیال اپنی ماں کا آیا تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کس قدر پریشان ہو رہی ہوگی۔ اس کا باپ، فائزہ، احسن......! سب کس قدر پریشان ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھنے لگا تو شدتِ درد سے وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے سوئے ہوئے درد کو اس نے پھر سے جگا دیا ہو۔ وہ گھٹے گھٹے انداز میں کراہنے لگا۔ اس نے خود پر غور کیا تو اسے محسوس ہوا جیسے درد کی لہریں پورے وجود میں پھیل گئی ہوں۔ تبھی اس نے اپنی قوت ارادی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ جو بکھر رہا تھا خود کو سمیٹنے لگا۔ سوئے ہوئے درد کو پھر سے تھپکنے لگا۔ تھوڑی سی دیر بعد وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اسے شدتِ سے میاں جی کی طلب ہونے لگی جو دوپہر کے وقت اس کی مرہم پٹی کے بعد دوائیں دے گئے تھے۔ جس سے وہ بہت سکون کے ساتھ اب تک سو رہا تھا۔ مگر وہ بے بس تھا۔ گوپے سے باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ سو اس نے اپنا وجود پھر سے چارپائی پر ڈھیر کر دیا۔ تنہائی کے ان لمحات میں اس کے پاس سوچیں تھیں جو اسے بے چین کئے دے رہی تھیں۔ اس نے اپنا دھیان کسی اور طرف لگانا چاہا تو فطری طور پر اسے رات والا واقعہ یاد آ گیا جس کے باعث وہ اس گھپ اندھیرے سے بھرے گوپے میں پڑا تھا۔

اس وقت تقریباً مغرب کا وقت تھا جب وہ اپنی بائیک پر یونیورسٹی کے بوائز ہاسٹل جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ اس شام اس کے کلاس فیلو اطہر کی سالگرہ تھی۔ اطہر آزاد کشمیر کے علاقے میرپور سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی یہ پہلی سالگرہ گھر سے باہر تھی۔ پچھلے سال وہ گھر پر تھا اور اس سال امتحانات کی تیاری کی وجہ سے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ سو اس کی تنہائی شیئر کرنے کے لئے اطہر کے قریبی دوستوں نے یہ چھوٹی سے پارٹی کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ یوں بھی وہ کھانے پینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیا کرتے تھے۔ علی اپنے وقت پر ہی گھر سے نکلا تھا۔ اسے راستے میں کیک بھی لینا تھا۔ کیک لانے کی یہ ذمہ داری دوپہر کے وقت اس پر ڈال دی تھی، جب انہوں نے ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے پارٹی کا پروگرام بنایا تھا۔

"تم لوگ یہ پارٹی کسی ہوٹل وغیرہ میں کیوں نہیں رکھ لیتے، ہم بھی شامل ہو جائیں۔" ان کی کلاس فیلو نبیلہ نے کہا۔

"بالکل اب ہم لڑکیاں بوائز ہاسٹل میں آنے سے رہیں۔" فاریہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو اطہر نے جواب دیا۔

"میں تو یہ پارٹی کرنا ہی نہیں چاہ رہا تھا، مگر یہ..... "اس کا جواب ابھی ادھورا تھا کہ جمشید نے کہا۔

"یہ کوئی اس سطح کی پارٹی نہیں ہے جس میں سب کو دعوت دی جا سکے، یہ تو ہم دوستوں کے مل بیٹھنے کا بس ایک بہانہ ہے، آپ پریشان نہ ہوں، کوئی اچھا سا فنکشن سوچتے ہیں۔"

یوں اس موضوع پر تھوڑی دیر گفتگو کے بعد بات تو ٹل گئی لیکن پوری کلاس کو معلوم ہو گیا کہ اطہر کی سالگرہ ہے، جسے بوائز ہاسٹل میں منایا بھی جائے گا۔ چند لڑکوں نے اسے وش بھی کیا۔ اس میں لڑکیاں بہر حال آگے رہیں، انہوں نے کہیں سے ایک خوبصورت سا کارڈ منگوایا اور اسے نوٹس بورڈ پر لگوا دیا۔

علی کیک لے کر وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے باقی تینوں دوست ہاسٹل کے ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ وہ سیدھا ان کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ پانچواں درویش دکھائی نہیں دے رہا۔" علی نے میز پر کیک رکھتے ہوئے کہا اور پھر جواب کا انتظار کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"سدا کے سستی کے مارے کو ابھی تھوڑی دیر پہلے جگا کر آئے ہیں۔ سو رہا تھا وہ۔ اب تیار ہو کر آئے گا۔" جمشید نے اسے بتایا۔

"میں ایویں تو نہیں اسے درویش کہتا۔ ظالم کو وقت کی قدر ہی نہیں ہے۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اچھا "باقی سب تیار ہے نا۔"

"بالکل...... ! وہ آ جائے تو...... اب پتہ نہیں وہ کتنا وقت لے گا۔ خیر...... ! میں ویٹر سے کہتا ہوں وہ لوازمات میز پر لگا دے۔" اطہر نے کہا اور پھر اٹھ کر کاونٹر کی جانب چل دیا۔ اور وہ تینوں باتیں کرنے لگے کچھ ہی دیر میں سب کچھ تیار تھا، بس اشفاق کی آمد کے انتظار میں وہ بیٹھے تھے۔

"جاؤ یار اسے خود ہی لے آؤ...... ! بال بنانے میں وہ تین دن لگا دے گا۔" جمشید نے علی کی طرف دیکھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو علی اٹھنے لگا۔ اسی لمحے اشفاق ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ وہ آ کر بیٹھا تو حنان نے تلخی سے کہا۔

"تو کسی فلم کی شوٹنگ میں جا رہا ہے یا فیشن شو میں جو اتنی تیاری کر کے آیا ہے۔"

اس پر وہ تھوڑا سا مسکرایا اور نیم باز آنکھوں سے بولا۔ "ارے بندے کو ہمہ وقت تیار

رہنا چاہیے کبھی بھی، کوئی بھی ہم پر عاشق ہو سکتی ہے، ہماری محبت میں گرفتار ہو سکتی ہے۔ تیری طرح تھوڑی ہیں کہ سیدھے بستر سے نکل کر کلاس میں چلا جاتا ہے۔"

"لیکن فرق تو کبھی نہیں پڑا۔ نہ لڑکی اس سے بات کرتی ہے نا تم سے۔" جمشید نے ہنستے ہوئے کہا تو حنان چڑ گیا اور اشفاق کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ذرا اس کا سٹائل دیکھو، کس قدر نیم باز آنکھوں سے یہ ڈائیلاگ مار رہا ہے۔ اسے دیکھ کر تو وہ شعر یاد آ رہا ہے کہ میران نیم باز آنکھوں میں۔ ہماری مستی بے غیرتی کی ہے۔"

"اے چل جگتیں نہ مار...... ! چل یار تو کیک کاٹ۔" اشفاق نے مزید کسی "بے عزتی" سے بچنے کے لئے جلدی سے کہا تو اطہر ہنستے ہوئے کیک کاٹنے لگا۔ عین اس وقت جب اس نے کیک کاٹنے کے لئے چھری اٹھائی تھی اچانک بجلی چلی گئی۔ وہ بھی دم بخود رہ گئے۔ ایک لمحے کے لئے تو انہوں نے یہی سمجھا کہ بجلی اتفاقیہ گئی ہے لیکن اگلے ہی لمحے ڈائننگ ہال میں بھگدڑ سی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی دو ہوائی فائر ہوئے۔ علی سمیت کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے لوگ ہیں انہیں تو پتہ ہی اس وقت چلا جب ان کے آگے رکھا ہوا میز الٹ دیا گیا اور علی کی گردن پر ہاتھ ڈالا گیا۔

"کون ہو تم...... ! اور یوں...... ! علی نے کہنا چاہا تو اس پر گرفت مزید سخت کر دی گئی۔ انہوں نے آتے ہی ہاتھ علی پر ڈالا تھا۔ اس کے دوستوں نے مزاحمت کی تو وہ لوگ ان سے بھڑ گئے۔ بمشکل چار سے پانچ منٹ تک یہ دھینگا مشتی چلی۔ جس میں جمشید اور اشفاق زمین بوس ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ مگر اس دوران علی پر گرفت سخت رہی اور اسے کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے جاتے چلے گئے۔ علی نے اپنی پوری قوت سے اپنا بچاؤ کرنا چاہا لیکن بھرپور مزاحمت کے باوجود اس کی پیش نہیں جا رہی تھی۔ شاید انہیں بھی دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ اس لئے ان میں سے کسی نے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارا، جس سے علی ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔

اسے جب ہوش آنا شروع ہوا تو اسے آوازیں کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دھیرے دھیرے جب اس کے حواس ساتھ دینے لگے تو اسے لگا جیسے وہ کسی جیپ میں ہے جو اونچے نیچے راستوں پر چلتی چلی جا رہی ہے۔ وہ یہی سب کچھ اچھی طرح سمجھنے کی کوشش میں یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد! اسے آواز سنائی دی۔

"کب تک یونہی چلتے رہیں گے...... ! اس کا کام تمام کریں اور چلیں واپس۔"

"چپ کر......! جب کسی بات کا پتہ نہ ہو تو یوں بکواس نہیں کرتے......!" ایک رعب دار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"لیکن یہ کہتا تو ٹھیک ہے۔ کب تک چلتے رہیں گے اور کدھر جا رہے ہیں ہم۔" ایک تیسری آواز اس کے کانوں میں پڑی تو علی کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔

"دیکھ......! ہمیں اس سے جان تو چھڑانا ہے، اسے واپس لے کر تو نہیں جا سکتے نا۔ بس اس سے جان چھڑالیں تو دوسری طرف سے شہر چلے جائیں گے۔" رعب دار آواز نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اسے زندہ نہیں چھوڑنا، صرف اس نے ہی نہیں، دوسروں نے بھی ہمارے چہرے دیکھے ہوں گے، یہ بتادے گا تو...... کسی اور نے......"

"تو فضول بکواس کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں کسی نے ہمارا چہرہ نہیں دیکھا، اس سے پہلے کہ یہ ہمارا چہرہ دیکھے ہم اس سے جان چھڑالیں گے۔ گولی ضائع کیے بغیر بھی اگر ہم اسے یہاں پھینک دیں گے تو روہی میں پتہ نہیں کتنے ایسے جانور ہیں جو اس کی زندگی چھین لیں گے۔" رعب دار آواز نے کہا تو علی کو ایک جھرجھری آ گئی۔ پتہ نہیں وہ لوگ کیا چاہتے تھے۔

"تو پھر اسے گولی کیوں نہیں مارتے ہو۔ جان چھڑاؤ اور واپس چلیں۔" تیسری آواز نے تیزی سے کہا۔ اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی جیسے وہ اس کھیل سے اکتا گیا ہو۔ علی کو اپنی موت بالکل سامنے دکھائی دینے لگی۔ تب اچانک ہی اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ کیونکہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ایسا ہوتا ہے۔ نجانے اس میں کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھولی اور ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ جیپ میں سیٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ دولڑکے اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک اس کے پاس جس کے پاؤں اس کے پیٹ کے قریب تھے۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر انتہائی پھرتی سے اٹھا اور پاس والے کی گردن دبوچ کر اس پر پل پڑا۔ اس اچانک افتاد پر اسے کچھ سمجھ نہیں آئی لیکن اگلے لمحے ہی وہ اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ جیپ نے ہچکولے لئے تو علی نے اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ جب تک اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا اسے پکڑتا۔ علی نے ریوالور چھین لیا تھا۔ مگر اسے ریوالور سیدھا کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔ ان دونوں نے علی کو جیپ سے نیچے پھینک دیا۔ وہ ریت پر گرا جس کے ساتھ ہی فائر ہوا۔ جیپ چند گز آگے جا چکی تھی۔ علی نے فوراً اپنی جگہ بدلی، تب تک مزید دو فائر ہو گئے۔ علی اٹھا اور ان کے پیچھے

بھاگا، اس نے فائر کیا، تو سامنے سے دو فائر ہوئے۔ علی ریت پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا جیپ کی ہیڈ لائٹیں بہت دور دکھائی دے رہی تھیں اور پھر دھیرے دھیرے وہ بھی معدوم ہو گئیں۔ اس نے ریوالور اڑسا اور اندھیرے میں کھڑا سوچنے لگا کہ یہ سب کیا ہے۔ خواب ہے یا حقیقت؟ پھر اسے یقین ہو گیا کہ یہ حقیقت ہے۔ اس نے خود کو انتہائی بے بس محسوس کیا۔ علی کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے جانا کس طرف ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور اوپر سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ ممکن ہے کسی اور وقت اسے یہ منظر بہت خوشگوار دکھائی دیتا لیکن دور تک پھیلے ہوئے ان ستاروں کو دیکھ کر وہ مایوس ہونے لگا۔ اس وقت وہ سوچنے لگا کہ لوگ ستاروں کی مدد سے راستوں کا اندازہ کر لیا کرتے تھے مگر اسے تو وہ بھی طریقہ نہیں آتا تھا۔ کہاں جائے اور کدھر جائے...... یا پھر یہیں بیٹھا رہے......؟ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو یہ سمجھنے کی بھی فرصت نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوا کیوں؟ یہ تو وہ وقت تھا جب اس کے ذہن میں فقط یہی بات تھی کہ وہ اپنی جان کیسے بچا سکتا ہے؟ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا۔

وہ وہیں بیٹھے بیٹھے جب اکتا گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت سمجھ چکا تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جائے۔ صحرا کی ٹھنڈی ہوا نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اسے اپنا جسم اکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ سر کا زخم ٹیس میں بدل گیا تھا۔ وہ وہیں جم کر نہیں بیٹھ سکتا تھا، اس لئے وہ ایک طرف چل پڑا۔ اسے ہر طرف دیکھ کر بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ وہ چلتا چلا گیا۔ اسے درندوں اور سانپوں سے خطرہ تو تھا ہی، سنی سنائی وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو صحرا اور خصوصاً چولستان کے بارے میں سنی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تو ان باتوں پر سوچتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ذہن سے محو ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ ایک سناٹے نے لے لی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ بے حس سا ہو گیا۔ پھر پتہ نہیں وہ کب تک چلتا رہا اور کب گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

"علی......! تم جاگ رہے ہو......؟" سانول کی دھیمی آواز پر اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ میں دیا روشن تھا جس کی روشنی میں اسے سانول ایک فرشتہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں......! جاگ رہا ہوں......" اس نے کہا تو دیئے کی روشنی اس کے عقب میں کھڑے میاں جی پر پڑی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ علی نے

ہمت کر کے اٹھنا چاہا تو اس کا پورا بدن ٹیسوں سے جھنجھنا اٹھا۔ تبھی اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔

''لیٹے رہو پتر لیٹے رہو......!'' یہ کہہ کر میاں جی اس کی چارپائی کے قریب پڑے ہوئے پیڑھے پر بیٹھ گئے۔ اور پھر بڑے ہی نرم لہجے میں پوچھا۔ ''اب کیا حال ہے بیٹا؟''

''پہلے سے بہت بہتر ہوں، بس اٹھا نہیں جا رہا۔'' علی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میاں جی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند لمحے یونہی ساکت سے خاموشی سے بیٹھے رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور کہا۔

''کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جاؤ گے، ایک دو دن مزید لگیں گے۔ تم چلنے پھرنے لگو گے۔ مجھے امید ہے کہ آج رات میں کسی وقت تمہارا بخار اتر جائے گا۔'' ان کے لہجے میں تسلی کے ساتھ امید افزاء حوصلہ بھی تھا...... یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے ایک پوٹلی سی نکالی، اسے کھولا اور پھر اس میں سے دو پڑیاں نکال کر الگ کر لیں۔ اپنی پوٹلی کو دوبارہ باندھا اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔ ''لے یہ دو پڑیاں کھا لے، انشاء اللہ صبح تک تمہارا بخار اتر جائے گا۔ اٹھو اور یہ لے لو۔''

میاں جی کے یوں کہنے پر سانول آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا کٹورا تھا۔ وہ اس نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو......! یہ بھی لو......''

اس کے لہجے میں گہری اپنائیت تھی۔

علی نے اس کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے وہ پڑیاں کھولیں، انہیں پھانکا اور پھر دودھ کا کٹورا پکڑ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ نیم گرم دودھ کا وہ ذائقہ ہی منفرد تھا۔ کٹورا بھر دودھ پینے کے بعد علی کا دل چاہا کہ وہ پھر لیٹ جائے۔ مگر جی کڑا کر کے وہ بیٹھا رہا۔ تبھی سانول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''علی......! یہاں ڈاکٹر وغیرہ تو ہوتے نہیں ہیں۔ یہ میاں جی کی پڑیاں ہی ہمارے علاج کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ ہم اسی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا بھئی سانول......! میں چلتا ہوں۔'' میاں جی نے کہا اور اٹھ گئے۔ اس پر سانول نے دھیرے سے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی میاں جی......!''

انہوں ایک گہری نگاہ علی پر ڈالی اور پھر سلام کرتے ہوئے گوپے سے نکلتے چلے گئے۔ تو کئی لمحوں تک ان کے درمیان خاموشی رہی۔ تب اس خاموشی کو علی نے توڑا۔

''سانول......! یہ میاں جی......؟''

''یہاں مسجد میں امام ہیں۔ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ کبھی کبھار شہر جاتے ہیں اور وہاں سے دوائیاں لے آتے ہیں۔ ادھر ان کی دوائی سے لوگ چنگے بھلے ہو جاتے ہیں۔ ان کی دعا میں بھی بڑا اثر ہے۔ بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ شاید دوائی وغیرہ تو ایک بہانہ ہے، لوگ ان کی دعا سے ہی ٹھیک ہوتے ہیں۔''

''کیا میاں جی، یہیں کے ہیں، مطلب یہاں بستی میں شروع سے رہتے ہیں۔'' علی نے یونہی بات بڑھائی۔

''ہم نے تو ہمیشہ انہیں یہیں دیکھا ہے، بچپن سے ہی۔'' سانول نے قدرے الجھتے ہوئے کہا جیسے یہ جواب دینا اس کے لئے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ تبھی علی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''سانول......! یہاں سے شہر کتنی دور ہے؟''

''یہی کوئی پندرہ سے بیس کلومیٹر......! کیوں تمہیں یہ......'' سانول کے لفظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ علی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''پندرہ بیس کلومیٹر......؟ ارے میں اتنا...... میں واپس کیسے جا سکوں گا......''

''یار......! یہ کوئی اتنا لمبا سفر نہیں ہے۔ میں تو کئی بار پیدل شہر سے ہو آیا ہوں۔ اور جہاں تک تمہاری واپسی کی بات ہے تو میں تمہیں واپس پہنچا دوں گا۔ کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہوگا یار۔'' سانول نے ہنستے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

''یار میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' علی نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''چلے جانا......! ابھی تم سفر کرنے کے قابل تو ہو جاؤ۔'' سانول ہنس دیا۔

''تمہیں شاید نہیں پتہ میرے والدین کس قدر پریشان ہوں گے۔'' علی کے لہجے میں تڑپ تھی۔ اس پر سانول نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھ......! مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہیں یہاں اپنے گھر میں رکھنے کا۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ چور ہو یا سادھ ہو۔ جس حالت میں تم مجھے ملے ہو، اس پر

تمہارے بارے میں کچھ بھی گمان کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہماری روایت یہ ہے کہ مہمان کی قدر کرتے ہیں۔"

"سانول تم تو ناراض ہو گئے ہو......! میں سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہ تم یقین رکھو، میں کوئی چور نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کوئی مجرم ہوں۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ بہاول پور شہر میں رہتا ہوں اور یہاں تک میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔" علی نے وضاحت سے کہا تو سانول نے انتہائی تحمل سے ریوالور اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں کس وقت وہ سانول کے ہاتھ لگا تھا اور شاید ایسے ہی کسی وقت کے لئے سنبھال رکھا تھا اس نے۔

"میں تمہاری بات مان بھی لوں تو یہ پڑھاکو لڑکوں کے پاس نہیں ہوسکتا۔" اس کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔

"یہ میرا نہیں ہے۔" علی نے اطمینان سے کہا اور پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس میں کوئی گولی ہے بھی یا نہیں۔"

"تو پھر یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟" سانول نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم میری بات پر یقین کر لوگے......؟" علی کے لہجے میں وہی اطمینان تھا جو ایک سچے شخص کے لہجے میں جھلک رہا ہوتا ہے۔

"یقین نہ کرنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔" سانول نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"شک......! جو یقین کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں جو کہوں گا، سچ کہوں گا اور تمہیں اگر میری بات جھوٹ لگے تو شک کرنے سے پہلے تصدیق ضرور کر لینا۔" علی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ جس پر سانول خاموش رہا۔ تب علی نے شام سے لے کر اس کے ملنے تک کی تمام روداد کہہ دی۔ اس دوران وہ لیٹ چکا تھا۔

"ہوں......!" سب کچھ سننے کے بعد سانول نے ایک طویل ہنکارا بھرا۔

"سانول......! تم میرے محسن ہو میری زندگی کا وسیلہ بنے ہو۔ اس لئے میرے دل میں جو تمہاری قدر ہے شاید میں اس کا بدلہ نہ دے سکوں، مگر یہ وقت بتائے گا کہ میں احسان کا بدلہ چکانے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔" علی نے شکر گزار لہجے میں، بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں نے ایسا کچھ بھی نہیں سوچا ہے علی۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سانول نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سانول......! جہاں تم نے مجھ پر اتنی مہربانی کی ہے۔ ایک احسان اور کردو......! کسی طرح مجھے شہر پہنچا دو۔ کہتے ہیں کہ بندہ صحرا میں راستہ بھول جاتا ہے اور میں ایسی حالت میں پیدل......"

"ہاں......! صحرا اور صحرائی باشندوں کی سمجھ بہت دیر میں آتی ہے علی......! تم اپنے گھر ضرور واپس جاؤ گے۔ لیکن ابھی نہیں، پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر......!" سانول یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو......؟" علی نے پوچھا

"تم آرام کرو......؟" سانول نے کہا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

علی گوپے میں تنہا رہ گیا۔ ڈھلتی ہوئی شام کے ساتھ اب وہ تھا اور اس کے اپنے خیالات، وہ سوچتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے لڑکیوں کے قہقہے سنائی دیئے۔ اسے یہ اپنا وہم لگا۔ مگر یہ تسلسل بڑھتا ہی گیا۔ لڑکیوں کے قہقہے باتیں اور پھر ان کے گیت۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ اس کے کہیں قریب ہی ہو رہا ہے۔ اس کا دھیان اپنی سوچوں سے ہٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر نیند کا غلبہ بھی ہونے لگا۔ اپنی سوچیں، لڑکیوں کے گیت اور نیند کے جھونکے، یہ گڈمڈ ہو گئے تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

روہی کی اس کچی بستی پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں غیر محسوس انداز میں سمٹ رہی تھیں۔ اک انجان سناٹا پوری بستی پر پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں واپس آتے ہوئے ریوڑ کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی آواز، جھانجھروں کی جھنکار اور چرواہے کی ہکل......! یہ سب مل کر اک نئی دنیا اور زندگی کا نیا پہلو واضح کر دینے کا احساس لیے ہوا تھا۔ اسی کچی بستی کے ایک آنگن میں چولہے کے پاس بیٹھی بکھاں مائی جلدی جلدی روٹیاں بنا رہی تھی۔ صحن کے ایک گوشے میں بنے ہوئے چولہے میں سے اٹھتا ہوا دھواں بھی زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ کھلے صحن کی دوسری جانب گامن تھوڑی سی بکریوں کو چارہ ڈالنے میں مصروف تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں میں خاموشی کے ساتھ مصروف تھے۔ چولہا جلاتے ہوئے بکھاں اچانک کسی خیال کے تحت چونک گئی اور پھر روٹی بناتے ہوئے ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے، وہ چند لمحے سوچتی رہی اور پھر کچے کوٹھے کی جانب منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔

"مہرو.....! اری او مہرو......! کدھر ہے تو؟"

"آئی اماں......!" اس پکار کی بازگشت میں اندر کچے کمرے میں سے آواز آئی اور چند لمحات میں مہرو باہر آ گئی۔ بلاشبہ وہ چولستانی حسن کا شاہکار تھی۔ بھرا بھرا جسم، لمبا قد، گورا رنگ جس پر جوانی سرخی بن کر دمک رہی تھی۔ سنہری مائل سیاہ بال، جس کی چوٹی کس کر باندھی گئی تھی اور پراندہ کمر پر یوں جھول رہا تھا جیسے حسن کے خزانے پر کوئی سانپ پہرہ دار ہو۔ ریشمی گلابی کلائیوں میں سفید روایتی پلاسٹک کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں درسی کتاب تھی، جسے اس نے بڑی مضبوطی اور احترام کے ساتھ پکڑا ہوا تھا۔ صحرا میں سنہرے پن کی بہتات اور سیاہی مائل اجزا ہوا سبز رنگ ماحول کو انتہائی پھیکا کر دیتا ہے۔ ہلکا نیلا آسمان بھی اس پھیکے پن کو دور نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لئے صحرائی خواتین تیز اور تیکھے رنگوں کا لباس پہنتی ہیں اور صحرا کے پھیکے پن کو دور کرنے کی یہ لاشعوری کوشش ہے۔ مہرو نے بھی براؤن رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر پیلے رنگ کے دائرے اور لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آئی اور اپنی غلافی آنکھیں اس پر ٹکاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔

"ہاں ہاں......! بول کیا بات ہے؟"

"شام ڈھل رہی ہے گھر میں اتنے کام پڑے ہوئے ہیں اور تم اندر کمرے میں گھسی ہوئی ہو۔"

"اماں......! بھلا بتاؤ، کون سا کام رہ گیا ہے۔ سارے گھر کے کام تو میں نے کر دیئے ہیں۔ پانی بھر لائی ہوں۔ بکریاں میں نے باندھ دی ہیں۔ اور کچھ......؟" مہرو نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس کی ماں کے پاس کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس لئے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تو اندر اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہے۔" بکھاں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماں......! میں پڑھ رہی تھی۔ سبق یاد کر رہی تھی جو میاں جی نے دیا ہے۔" مہرو نے اپنے فطری بھولپن سے کہا۔ بکھاں اسی بات پر چڑ سی گئی اور پہلے سے بھی زیادہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ تیرا کیا پاگل پن ہے۔ یہ تیری عمر ہے پڑھنے کی، تیری عمر کی لڑکیاں تو اپنے اگلے گھر کا سوچتی ہیں کوئی سینا پرونا، گھر داری سیکھتی ہیں اور تو نے خود کو کس مصیبت میں ڈالا ہوا ہے؟"

"یہ مصیبت نہیں، میرا شوق ہے اماں......تو سمجھتی کیوں نہیں ہے۔"

"میری بجائے خود کو سمجھا میری دھی......! یہاں کی لڑکیاں پڑھتی نہیں ہیں۔ قرآن پاک پڑھ لیا ہے، وہی بہت ہے، اب اس عمر میں......"

"اماں......! اگر کوئی اور نہیں پڑھی یا نہیں پڑھتی، اس سے مجھے کیا؟" مہرو نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کو سمجھایا تو صحن کے دوسرے کونے سے اس کے باپ گامن نے ہانک لگائی۔

"او نیک بخت......! تجھے کیا پتہ ہے زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔ میری دھی اگر چار لفظ پڑھ لے گی تو اس میں تیرا کیا جاتا ہے بول......" گامن کے لہجے میں اپنی بیٹی کے لئے محبت گھلی ہوئی تھی۔

"چھوٹی عمر کی تھی نا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اب اس کی عمر پرائے گھر جانے کی ہے، تو اس کی فکر کر......!" بکھاں کے لہجے میں خوف لرز رہا تھا۔

"وہ اللہ سائیں ہے نا، اس پر یقین رکھ۔ جو اس کی قسمت ہے، اسے مل جائے گا۔ تو روزانہ یہ بحث لے کر نہ بیٹھ جایا کر۔" گامن نے بکریوں کے آگے چارہ ڈالتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ مہرو بھانپ گئی کہ بات اگر آگے بڑی تو بحث میں بدل جائے گی۔ سو اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا چل چھوڑ اماں......! یہ بتا مجھے بلایا کیوں تھا۔" اس کے یوں کہنے پر بکھاں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"لو......! میں تو بھول ہی گئی......!" یہ کہہ کر اس نے توے پر پڑی ہوئی روٹی کو پلٹا اور پھر بولی۔ "عثماں کی شادی پر جو کپڑوں کے جوڑے دینے ہیں، وہ کیا نکال لئے ہیں تم نے......؟"

"ابھی تو ایک ہفتہ پڑا ہے اس کی شادی میں، ابھی سے نکال کر رکھ دوں۔" مہرو نے ہلکی سی حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں میری دھی......! ابھی سے نکال دو......رات "جاگے" میں جائیں گے نا تو دے دیں گے۔ رشتے داری کا معاملہ ہے، انہیں دینا تو ہے، آج نہیں تو کل۔"

"مگر اتنی جلدی کیوں؟" مہرو کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی تھی تو بکھاں نے پیار سے سمجھایا۔

''جب دھی دھیان کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے تو اس سے پہلے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے انہیں بھی پتہ ہو کہ شاں کو دینے کے لئے کیا کچھ ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے......!'' مہرو نے سمجھتے ہوئے کہا۔'' چل ٹھیک ہے، میں ابھی نکال دیتی ہوں۔ اور وہ روپے......!''

''ہاں ہاں وہ بھی......!'' بکھاں نے توے پر سے روٹی اتارتے ہوئے کہا تو مہرو اٹھ گئی۔ اس کا رخ واپس کمرے کی طرف تھا۔ اس کے ذہن میں وہ ساری چیزیں آنے لگیں جو اس نے شاں کو دینے کے لئے سوچی ہوئیں تھیں۔ آخر وہ اس کی گہری سہیلی تھی اور واحد رازدار بھی......! یہ سوچتے ہی مہرو دھیرے سے مسکرا دی۔ وہ سب سے بڑھ چڑھ کر اسے دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

مدہم روشنی کے خواب ناک ماحول میں فرزانہ خان اپنے کمرے میں جہازی بیڈ پر نیم دراز تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے اردگرد کا احساس ہی نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کمرے سے باہر شام اتر آئی ہے، سورج ڈھل گیا ہے اور گہرے نیلے آسمان پر ٹانواں ٹانواں تارہ دکھائی دینے لگ گیا ہے۔ وہ تو اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اس کے اندر کھو دینے کا احساس پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ لحہ لحہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ یہ احساس اس پر بے چینی طاری کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی حالت اس جواری کی مانند تھی جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے اور پھر اس انتظار میں ہوتا ہے کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ سب کچھ ہار جائے گا یا پھر سب کچھ پا لے گا۔ یہ درمیانی کیفیت، جو نتیجے کے انتظار میں جاں گسل لحات ہوتے ہیں، وہ بھی ایسی کیفیت میں اٹکی ہوئی تھی۔ ہاں اور ناں کے درمیان والی کیفیت جہاں انسان خلا میں ہوتا ہے اور اس کا من مختلف سوچوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تھک کر چور ہوئی جا رہی تھی لیکن پھر بھی وہ سوچتے رہنے پر مجبور تھی۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف علی تھا۔ جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ انہی لحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے سکرین پر نمبر دیکھے اور پھر بے تابانہ فون اٹھا لیا۔

''ہیلو......! بولو......! کہاں ہے وہ؟'' اس کے لہجے میں صدیوں کی بے تابی چھلک رہی تھی۔ تبھی دوسری طرف سے ٹھہرے ہوئے گھمبیر لہجے میں کہا گیا۔

''جس طرح تم نے کہا تھا، بالکل ویسے ہی میں نے اسے عین صحرا میں لے جا کر چھوڑ

دیا۔ اب اُدھر ہی کہیں ہوگا۔''

''اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ ادھر کہیں نزدیک ہی ہے نا......؟'' فرزانہ کے لہجے میں بے تابی کے ساتھ اب خوف بھی تھا۔

''پتہ نہیں۔'' لاپرواہی سے جواب دیا گیا تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس لئے تیزی سے بولی۔

''کیا مطلب ہے، پتہ نہیں؟''

''اچانک ہی اس نے مزاحمت شروع کر دی تھی۔ اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ مشکل اس لئے کہ اسے زندہ چھوڑنا تھا، ورنہ اسے ختم کر دینا تو بہت ہی آسان تھا۔''

''مزاحمت......! تمہارا کیا مطلب...... میں نے پوچھا ہے اسے کوئی چوٹ......'' اس نے پوچھنا چاہا تو دوسری طرف اس کی بات کاٹ دی گئی۔

''اسی لئے تو کہا کہ پتہ نہیں......! اندھیرا تھا، گولیاں بھی چلیں، پھر اسے پھینک دیا۔ اب میں یہ دیکھنے کے لئے وہاں رک جاتا کہ اسے چوٹ لگی ہے یا نہیں......! ویسے وہ بندہ بڑا جی دار نکلا ہے......!'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر اگلے ہی لمحے پریشان لہجے میں بولا۔

''ویسے فرزانہ جی......! اسے یوں زندہ چھوڑ دینا بڑا رسک ہے۔''

''عامر......! میں نے اسی رسک کے لئے تمہیں نوٹ دیئے ہیں......!'' فرزانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ہاں......! یہ تو ہے......! خیر...... اپنا کام ختم...... تمہارے نوٹ ہضم......!'' عامر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......! اب تم اور تمہارے ساتھی ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں رکھو گے۔ سمجھے تم لوگ......؟'' فرزانہ نے درشت لہجے میں انتہائی رعب سے کہا۔

''میرے علاوہ کسی کو پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ معاملہ کس کا ہے اور کیوں ہے......! نوٹ لے کر کام کر دینے کے بعد میں سب کچھ بھول جاتا ہوں، ٹینشن نہیں لیتا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام......! بائے بائے۔'' عامر نے گھمبیر آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ فرزانہ ابھی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن کال بند ہو چکی تھی۔ اس نے ایک نگاہ فون پر ڈالی اور ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں یہی بات گونجنے لگی کہ پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہوگی۔ چند لمحوں بعد اسے خود پر غصہ آنے لگا کہ یہ گھناؤنا خیال اس کے ذہن میں کیسے آیا۔ اور اگر آ بھی گیا تھا تو اس پر عمل کیوں کر لیا۔ کہیں وہ

علی کو کھو تو نہیں دے گی۔ یہ سوچتے ہی وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر ایک طرف جھک گئی جیسے اس کے بدن میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب علی نے اس سے بڑے واضح انداز میں اپنا موقف کہا تھا۔

اس دن علی یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کے لان میں ایک سنگی بینچ پر بیٹھا ہوا کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور میں سے دیکھا تو اس دن اسے علی بہت ہی اچھا لگا۔ نیلی جینز پر آف وائیٹ کلر کی شرٹ، سلیقے سے سنوارے ہوئے بال جو دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا میں ذرا ذرا لہرا رہے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں کتاب پر ٹکی ہوئیں تھیں۔ گھنی مونچھوں کے تلے ہونٹ خاموش تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں، اپنے اردگرد سے بے نیاز کتاب پڑھنے میں محو تھا۔ اس وقت وہ فرزانہ کو اتنا اچھا لگا کہ اس سے رہا نہ گیا اور وہ اس کے پاس جا پہنچی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

''علی......! آخر تم مجھ سے اس قدر بھاگتے کیوں ہو۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے جو۔''

''کمی نہیں، تم میں زیادتی ہے۔'' علی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زیادتی......! کیا مطلب ہے تمہارا۔'' فرزانہ نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے پوچھا تو علی نے تحمل سے بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''دولت، مقام، عزت......ان سب کی زیادتی......!''

''اوہ......!'' فرزانہ نے سب کچھ سمجھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ جس کا اظہار بھی میں نے تم سے کر دیا ہے۔'' اس کے یوں کہنے پر علی چند لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''فرزانہ......! جو تم چاہ رہی ہو نا۔ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ جو پیار، محبت اور عشق کا معاملہ ہے نا؟ یہ کوئی فارمولا قسم کی چیز نہیں ہے کہ جس کسی پر بھی یہ فارمولا اپلائی کیا جائے تو وہاں سے من چاہا نتیجہ حاصل ہو جائے۔ عشق و محبت کی بنیاد تو جذبات اور احساسات پر ہوتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔ وہ آپ کی توقع کے عین مطابق ری ایکٹ کرے۔''

''میں نے تم سے اپنے دل کا حال کہہ دیا ہے، اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہے اور تم جانتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ شاید اسی لئے تمہیں میری محبت کی قدر نہیں ہے۔'' فرزانہ نے تیزی سے کہا۔

''تم بالکل غلط سوچ رہی ہو فرزانہ......! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہاری محبت سے مجھے انکار نہیں ہے۔ لیکن میں جواب میں تم سے محبت کروں، ایسا ناممکن ہے؟ جب میرے اندر وہ جذبات اور احساسات ہی نہیں......مطلب......! ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس ہم میں اچھے کلاس فیلوز سے زیادہ کوئی دوسرا تعلق نہیں ہونا چاہیے۔'' علی نے بمشکل الجھتے ہوئے اس سے کہا تو فرزانہ جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔

''تم میری توہین کر رہے ہو علی......! یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے......یعنی فرزانہ خان نے تم سے محبت کی ہے اور......''

''فرزانہ......! ہو سکتا ہے کہ میں خوش قسمت ہوں کہ تم جیسی لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن یہ تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ ہمارے درمیان اتنی بڑی خلیج ہے، اتنی اونچی اونچی دیواریں ہیں، جنہیں ہم پار نہیں کر سکتے، طبقاتی فرق......''

''کیا مطلب......! ایک جاگیردار، بزنس مین اور دولت مند باپ کی بیٹی ہونا ہی جرم ہے میرا......؟''

''یہ جرم نہیں ہے......میں پھر کہوں گا کہ تم غلط ٹریک پر سوچ رہی ہو......!'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ''سنو......! مجھے اس پر کوئی ملال نہیں ہے کہ دولت کی یہ تقسیم کیوں ہے کہ ایک طرف تم جیسے دولت مند گھرانے میں اور دوسری طرف ہم جیسے غریب۔ جو بمشکل اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دولت کی اس تقسیم نے ہم انسانوں کو طبقات میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ یہ دیواریں اس قدر مضبوط ہیں کہ ہم انہیں توڑ نہیں پائیں گے۔ پھر اپنا سر پھوڑنے کا فائدہ۔''

''ہوں......!'' فرزانہ نے ہنکارہ بھرا اور پھر بولی ''دیکھو علی......! یہ ناممکن عمل تو نہیں ہے نا، میں لڑکی ہو کر یہ ہمت کر رہی ہوں، تم بھی حوصلہ کرو۔''

''بات ہمت حوصلے کی نہیں ہے فرزانہ......! اور نہ ہی تمہاری اور میری ذات کی ہے جو ہم ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کریں۔ ہمارے ساتھ بہت سارے لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے

تمہارا تو نہیں پتہ، لیکن میرے ساتھ بہت سارے لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔ میں ان کی امیدوں......" علی نے کہنا چاہا تو فرزانہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"بات اگر امیدوں ہی کی ہے تو میں ان کی امیدیں ٹوٹنے نہیں دوں گی۔ تمہاری کلاس کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ اور امید یہی ہے نا کہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔ تم خود سوچو، اگر تمہیں میرا ساتھ مل جاتا ہے تو پھر کون سا ایسا مسئلہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ کے یوں کہنے پر علی دھیرے سے مسکرایا اور پھر بڑے تحمل سے بولا۔

"بات اس طرح کی مسائل کی نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ بات ہے کہ مسائل ہی حل ہو جائیں۔ رشتے ناطے، تعلق، عزت اور بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو ہمارے طبقے کے لوگوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔ پھر میری ذات، میری انا...... تم نہیں سمجھ پاؤ گی فرزانہ۔ میں خود کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر سکتا مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" علی نے صاف لفظوں میں کہا تو فرزانہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کے چلا گیا۔ اس نے اپنی شدید توہین محسوس کی۔ تب اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے دبے دبے غصے میں کہا۔

"مگر میں تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور ضرور کروں گی۔"

"یہ محبت نہیں خود غرضی ہے فرزانہ...... خیر......! تمہارا حق ہے تم کوشش کرو۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارا وقت ضائع ہو گا۔ میں خواب ضرور دیکھتا ہوں لیکن خوابوں میں نہیں رہتا۔"

"میں اس خواب کو حقیقت میں بدل دوں گی۔ تم نہ بھی کہو مگر میری کوشش یہی ہو گی کہ تمہیں اپنا بنا لوں۔ تم جسے نہیں روک سکتے۔" فرزانہ کے لہجے میں مایوسی، غصہ اور قہر گھلا ہوا تھا۔

"میں تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔"

"علی......! اگر پتھر نہ پگھلیں تو پتہ ہے کیا ہوتا ہے، انہیں ٹوٹنا پڑتا ہے۔ میں پتھر کو پگھلاؤں گی، نہ پگھلا تو خود توڑ دوں گی۔ یہ میری ضد ہی نہیں، فیصلہ بھی ہے۔" فرزانہ نے انتہائی غصے میں آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔" علی نے لاپرواہی سے کہا اور کتاب پر نگاہیں جھکا لیں۔

فرزانہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر آندھی اور طوفان کی طرح وہاں سے اٹھ گئی۔ اب اگر وہ ڈیپارٹمنٹ میں رہتی تو اپنے غصے کی وجہ سے تماشا بن جاتی۔ اس لئے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور وہاں سے گھر چلی آئی۔

یہی وہ واقعہ تھا جو اس کی سوچ کی بنیاد بنا۔ وہ علی کو اپنے سامنے جھکا دینا چاہتی تھی۔ تبھی وہ خوفناک منصوبہ اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ علی کو ایک زبردست جھٹکا دے اور پھر خود ہی سنبھال لے۔ جھٹکا دینے اور سنبھالنے میں وہ اس پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اگر اس کی بات سیدھے سبھاؤ مان جائے تو ٹھیک ورنہ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یا پھر وہ اسے اپنی محبت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ وہ اس منصوبے کے پہلے مرحلے میں تو کامیاب ہو گئی تھی، اب اگلے مرحلے میں اسے اپنے باپ کی مدد چاہئے تھی اور وہ اس کے آنے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔

اس کا باپ سردار امین خاں ایک روایتی جاگیردار ہی نہیں، اس علاقے میں اپنی سیاسی ساکھ بھی رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کی زمین شہر سے ملحقہ گاؤں میں تھیں مگر وہ شہر میں رہتا تھا اور جس علاقے میں وہ سیاست کرتا تھا، وہ شہر، اس کا آبائی گاؤں اور اس کے علاوہ بھی کچھ علاقہ تھا۔ اس کا شہر میں بزنس ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا لیکن اس علاقے میں جہاں چولستان کا بہت بڑا علاقہ بھی تھا، وہاں پر لوگ اس کا فقط نام ہی جانتے تھے۔ کیونکہ وہاں پر اس کا ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان کا روایتی حریف پیر سیدن شاہ کا اثر و رسوخ تھا۔ وہ ہمیشہ اس علاقے کی بنیاد پر الیکشن جیت جاتا تھا۔ پیر سیدن شاہ بھی نرا سیاست دان یا روایتی جاگیردار نہیں تھا بلکہ اس کا ایک روحانی مقام بھی اس علاقے میں سمجھا جاتا تھا۔ سردار امین خان باقی سارے توڑ کر لیتا مگر اس کا وہ روحانی اثر زائل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔ یوں ایک زبردست روایتی حریف ہونے کی وجہ سے پورا علاقہ سردار امین خاں کو جانتا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ پیر سیدن شاہ کے مقابلے میں کبھی نہیں جیتا تھا۔ شہر پر گرفت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس نے روایتی جاگیرداروں کی طرح صرف زمینوں پر انحصار نہیں کیا تھا بلکہ بہت بڑا بزنس بھی پھیلایا ہوا تھا۔ اس باعث اعلیٰ سطح پر تعلقات سے ایک خاص حلقہ رکھتا تھا۔ بس ایک خاص علاقے کی وجہ سے وہ الیکشن ہار جاتا۔ اس کا توڑ اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

فرزانہ خاں اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بے تحاشا پیار، بے جا لاڈ اور من مانی کی وجہ سے وہ خود سر ہو چکی تھی۔ موروثی طور پر ضد اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ شعور کی آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی اس نے دولت سے ہر شے حاصل کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس باعث وہ سمجھتی تھی کہ دولت ہی تمام مسائل کا حل ہے۔ یہ فرزانہ خان ہی تھی جس نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ورنہ پرکھوں سے ان کے خاندان میں عورتوں کو تعلیم تو کیا انہیں گھروں میں پابند کر کے رکھا جاتا تھا۔ اس

کی ماں مریم بی بی ایسے ہی خاندانی جبر کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ ان پڑھ، دبی ہوئی اور روایتی گھر دار خاتون تھی۔ جسے اپنے شوہر کے سامنے بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ اسی ماحول میں فرزانہ اور پھر بعد میں اسد خاں کو جنم دے کر دنیا ہی چھوڑ گئی تھی۔ اسد خاں بہت چھوٹا تھا، سوائے بچپن ہی میں اس کی پھوپھی برطانیہ لے گئی تھی اور وہ وہیں پر پرورش پاتے ہوئے جوان ہو چکا تھا۔ اس کی پھوپھی نے چاہا تھا کہ فرزانہ کو بھی اپنے پاس لے جائے مگر امین خان نے گوارا نہ کیا اسے اپنے پاس رکھنا اور پھر شادی نہیں کی۔ فرزانہ جتنی مرضی بے باک، ضدی اور خود سر تھی لیکن اپنے باپ کا رعب اور احترام بہر حال وہ مانتی تھی۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر اس کے باپ نے اکلوتی ہونے کے ناطے آزادی دی ہوئی ہے تو اس پر باپ کی نگاہ بھی اتنی ہی سخت ہے۔ سو وہ بہت محتاط رہا کرتی تھی۔ بس یہ ایک علی کا معاملہ ایسا آ گیا تھا جس میں وہ خود سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی۔ وہ اسے اچھا ہی اتنا لگا تھا کہ اسے حاصل کرنے کی دھن اس پر سوار ہو گئی۔ اس پر علی کا انکار اس خواہش کو مزید بھڑکا رہا تھا۔ شاید اگر علی اس کی بات مان لیتا اور اس کے قرب کی حامی بھر لیتا تو فرزانہ بہت جلد اس سے اکتا جاتی۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی کہ علی جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے اور درست ہے لیکن یہ دل...... ! کسی طور پر بھی مان نہیں رہا تھا۔ اب تو یہ خواہش اسے اس نہج پر لے آئی تھی جہاں وہ اپنی ہی نگاہوں میں خود ذلیل ہو کر رہ گئی تھی کہ ایک مڈل کلاس طبقے کا لڑکا، جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس کی بات ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ علی کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ علی اس کی ضد بن گیا تھا۔

"بی بی سئیں...... ! خان سائیں تشریف لے آئے ہیں اور ابھی بڑے کمرے میں ہیں" ملازمہ نے اسے بتایا تو وہ چونک گئی۔ اپنے ہی خیالوں میں نجانے وہ کب سے کھوئی ہوئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے اٹھتے ہوئے خود کو سمیٹا اور پھر اپنے باپ کے سامنے جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

سردار امین خان رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ اونچا لمبا قد، بھرا بھرا بدن اور سرخ و سفید چہرہ، جس پر ایک خاص قسم کا تاثر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اس باعث سامنے والا شخص بات کرتے ہوئے جھجک جایا کرتا تھا۔ فرزانہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے وہاں کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اس کا باپ صوفے پر پھیل کے بیٹھا ہوا تھا، جبکہ اس کا مقرب خاص ملازم اللہ بخش پاس کھڑا تھا۔ امین خان غصے میں دھاڑ رہا تھا۔

"نورو نے یہ کیا حرکت کی ہے، اپنے دشمنوں سے ہمارے بغیر ہی سمجھوتہ کر لیا۔ ایسے لوگوں کو تم قریب ہی کیوں آنے دیتے ہو۔ ٹھیک ہے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، دوبارہ ادھر کا رخ کریں تو پھر انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ اور پھر علاقے سے بھی کوئی اچھی خبریں نہیں آ رہی ہیں۔ چوریاں کچھ زیادہ ہی نہیں بڑھ گئی ہیں۔"

"سائیں...... ! ڈیرے پر جو لوگ پڑے ہیں، ان کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے نا۔ وہ بے کار پڑے کیا کرتے ہیں وہاں پر، لوگ مسئلے مسائل بھی تو لے کر آتے ہیں۔ الیکشن......"

"اوئے اللہ بخش...... ! میں نے تمہیں سمجھایا بھی ہے کہ اب وہ پہلے والا دور نہیں رہا کہ لوگوں کو خوف میں رکھ کر ان سے ووٹ لئے جائیں۔ اب سوال اٹھتے ہیں، میڈیا ہم پر نگاہ رکھتا ہے۔ اب بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے ہم نے الیکشن جیتنا ہے اس بار...... اور ہر قیمت پر جیتنا ہے۔ ان لوگوں کو بھگاؤ یہاں سے۔"

"پر خان سائیں...... ! انہی لوگوں کی وجہ سے تو علاقے پر اپنی دھاک ہے۔ پیر سیدن شاہ کا مقابلہ آسان تو نہیں ہے نا۔"

"جو کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ اب ہمیں کچھ اور سوچنا ہے، اس بار پیر سیدن شاہ کو ہر حال میں الیکشن سے باہر کرنا ہے۔ لیکن اب روایتی طریقوں سے نہیں کچھ اور ہی کرنا ہوگا۔ اب جاؤ...... !"

"جیسے حکم سائیں" اللہ بخش ہاتھ جوڑتے ہوئے پچھلے قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ تبھی فرزانہ اندر داخل ہو گئی۔

"السلام علیکم بابا...... !" اس نے انتہائی لاڈ سے کہا۔

"وعلیکم السلام...... !" امین خان نے بہت ہی پیار سے کہا اور پھر اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھاتے ہوئے چہکنے والے انداز میں کہا۔ "آج ہماری بیٹی نے ہمیں وقت کیسے دے دیا۔"

"اچھا...... ! یہ گلہ بھی مجھ سے، حالانکہ مصروفیت آپ کی اتنی زیادہ ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی یاد نہیں رہتی۔ سیاست، میٹنگز، لوگوں کے مسئلے، زمین، فنکشن بزنس اور نجانے کیا کیا۔"

"ارے نہیں میرے بچے...... ! میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ایک تمہارا ہی تو خیال رہتا ہے۔ خیر...... ! بولو آج کیا بات ہے۔" امین خان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بات تو کوئی اتنی اہم نہیں ہے۔ وہ رات ہماری یونیورسٹی کے بوائز ہاسٹل میں ہنگامہ

ہو گیا تھا اور......"

"مگر تمہیں اس سے کیا؟" امین خان نے ماتھے پر تیوریاں لاتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"بات تو سنیں......!" فرزانہ نے لاڈ سے کہا اور پھر فوراً ہی بولی۔ "اس ہنگامے میں ہمارا ایک کلاس فیلو ہے علی......! وہ اغواء ہو گیا ہے شاید۔ شاید مطلب، اس کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ آپ پلیز پولیس اسٹیشن فون کر دیں تو......" فرزانہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا تم سے کسی نے سفارش کی ہے؟"

"نہیں......! میں نے خود سے کہا ہے۔ آخر وہ ہمارا کلاس فیلو ہے۔ سبھی افسوس کر رہے تھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" امین خان نے کچھ سوچتے ہوئے فون پر نمبر ملائے اور چند لمحے انتظار کے بعد کہا۔ "ہاں پولیس اسٹیشن......! اوے وہ رات یونیورسٹی ہاسٹل میں ہنگامہ ہوا تھا اور اس میں کوئی لڑکا علی نامی اغواء ہوا ہے اس کے بارے میں فوراً پتہ کر کے مجھے اطلاع کرو۔ ٹھیک ہے۔" پھر ادھر سے چند لمحے باتیں سننے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

"تھینک یو بابا......" فرزانہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو امین خان اٹھ گیا۔

"آؤ......! کھانا کھائیں۔"

"جی بابا......!" فرزانہ بھی ساتھ ہی میں اٹھ گئی۔ دونوں باپ بیٹی اکٹھے ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب چل دیئے۔

☆☆☆

شہر پر رات سایہ فگن ہو چکی تو برقی قمقمے اندھیرا دور کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ ایسے میں غلام نبی گھر میں داخل ہوا تو اس کی چال اور انداز میں بہت امید تھی۔ تخت پوش پر بیٹھی ہوئی نگہت بیگم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تو آس کا دیا بھڑک اٹھا۔ وہ کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھی۔ اس لئے غلام نبی کے بیٹھنے سے پہلے ہی بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا میرے بیٹے کا؟"

غلام نبی نے تخت پوش کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "نہیں نیک بخت......! اس کا کچھ پتہ نہیں چلا، ہاں مگر اُمید ضرور ہو گئی ہے، بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا۔ شاید صبح یا کل تک۔"

"میں سمجھی نہیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" نگہت بیگم نے پریشانی سے پوچھا۔ اتنے میں فائزہ بھی اندر سے آ گئی اور احسن بھی ڈھیلے قدموں سے آ کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"میں گیا تھا پولیس اسٹیشن......!" غلام نبی نے دھیمے سے کہا، پھر ایک لمحہ رک کر بولا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ وہ میری بات ہی نہیں سن رہے تھے۔ میرے ساتھ دو لڑکے بھی تھے علی کے کلاس فیلو......! مگر انہوں نے پہلے تو ٹرخا دیا۔ وہ تو انہی لڑکوں پر شک کرنے لگے تھے۔ پھر......"

"پھر کیا ہوا......" نگہت بیگم بے تابی سے بولی۔

"پھر پتہ نہیں کسی کا فون آیا تھا۔ میری تو پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ وہ کون تھا، اس نے علی کے بارے میں پوچھا، اور پھر جھٹ پٹ ایف آئی آر کاٹ دی۔ اور مجھے پورا یقین دلایا کہ ہر ممکن حد تک وہ علی کو تلاش کریں گے۔"

"کون تھا، کس کا فون تھا......؟" وہ حیرانگی سے بولی۔

"میں نے کہا نا کہ میری تو ہمت ہی نہیں پڑی، پہلی بار پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ اور پھر ان کا رویہ بہت برا تھا۔ میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ انہوں نے ایف آئی آر تو لکھ لی۔" غلام نبی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"ابا......! میں نے بھی علی بھائی کے دوستوں سے پوچھا کہ انہیں تھوڑا بہت معلوم ہو۔ وہ خود حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہوا۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ علی بھائی کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ اب یہ کیا معاملہ ہے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"خیر......! میں نے سوچا ہے کہ اپنے باس سے بات کروں گا۔ ان کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ آج تو اسی پریشانی میں آفس ہی نہیں گیا۔ تم لوگوں نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"نہیں......!" فائزہ جلدی سے بولی۔

"ایسا کب تک چلے گا۔ چلو اپنی ماں کا منہ ہاتھ دھلواؤ۔ اور پھر کھانا لگاؤ۔ اللہ مالک ہے، وہ ہمارے لئے بہتر کرے گا۔ چلو شاباش۔" غلام نبی نے دھیمے لہجے میں کہا اور خود بھی اٹھ گیا۔ نگہت بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆

اگرچہ رات کے گہرے اندھیرے کو اک ننھا سا دیا روشن ہو کر سیاہی دور کرنے کی

کوشش کررہا تھا مگر اس کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ گوپے میں پڑی چارپائی پر علی اپنی سوچوں میں گم تھا۔ وہ یوں ساکت بیٹھا ہوا تھا جیسے اس میں زندگی کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ بڑے غور سے ٹمٹماتے ہوئے دیے کو دیکھ رہا تھا مگر اس کا ذہن بہت دور کہیں شہر کی گلیوں اور بازاروں میں سے ہوتا ہوا اپنے گھر کے صحن میں تھا۔ ایسے ہی وقت میں سارا گھر رات کے کھانے سے فارغ ہو کر خوش گپیوں میں مصروف ہوا کرتا تھا۔ وہ یہ مسلسل سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے۔ وہ اپنے طور پر بھی کوئی بندوبست کر سکتا تھا۔ دوپہر سے ذرا بعد اسے یہ خیال بھی آیا تھا مگر وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو نہ صرف احسان مانتے ہیں بلکہ اپنے محسن کو کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ اس کے خیال میں وہ مرد ہی نہیں ہو سکتا جو محسن کشی کرے یا اپنے محسن کا احسان بھول جائے۔ وہ سانول کی اجازت سے ہی یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ سانول شام سے ذرا پہلے آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی علی کے نہانے دھونے کا بندوبست کیا، پھر اپنے کپڑے دیئے، جب تک وہ کپڑے پہن چکا تھا، اس وقت وہ اسے کھانا دے کر چلا گیا۔ اس دوران باوجود کوشش کے علی اس سے بات نہیں کر سکا تھا۔ اب رات دھیرے دھیرے سرکتی چلی جا رہی تھی لیکن سانول ابھی تک پلٹ کر واپس نہیں آیا تھا۔ اور علی اپنے خیالوں میں نجانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ وہ چونکا اس وقت جب اسے میاں جی کی آواز سنائی دی۔

''برخوردار......! اتنی گہری سوچ میں کہاں ڈوبے ہوئے ہو۔''

وہ چونک کر سیدھا ہو گیا اور پھر قدرے شرمندہ سے لہجے میں بولا۔ ''وہ بس......

میں...... کچھ نہیں؟''

''کوئی تو سوچ چل رہی ہوگی دماغ میں۔ مجھے اگر نہیں بتانا چاہتے ہو تو وہ تمہاری مرضی۔'' میاں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ میاں جی پاس پڑے ہوئے پیڑھے پر بیٹھ چکے تھے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے میاں جی، بس یہی سوچ رہے تھا، میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔''

''ہاں پریشانی تو ہوتی ہے۔ مگر تمہاری حالت بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا۔'' میاں جی نے سنجیدگی سے کہا۔

''میاں جی......! میرے گھر والے بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں سانول کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اگر وہ بروقت مجھ تک نہ پہنچتا تو شاید...... شاید میں اب تک مر گیا ہوتا۔'' علی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو میاں جی نے مسکراتے ہوئے بولے۔

''پہلی تو بات یہ ہے کہ برخوردار کہ زندگی اور موت اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہ کسی کو موت دے سکتا ہے اور نہ زندگی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ تم خود سوچو......! اگر تم اسی صحرا میں زندگی ہار گئے ہوتے تو پھر تمہارے گھر والوں تک خبر کون پہنچاتا؟''

''ہاں......! یہ تو ہے میاں جی......!''

''تو بس پھر ذرا صبر کرو......! ایک دو دن میں تم واپس چلے جاؤ گے انشاءاللہ......!'' یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ''لاؤ ذرا نبض دکھاؤ، تمہارا بخار دیکھوں'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس پر علی نے اپنی کلائی ان کے ہاتھوں میں دے دی۔ میاں جی یونہی چند لمحے ساکت بیٹھے رہے، پھر کلائی چھوڑتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''الحمدللہ......! اب بخار تو نہیں ہے۔ میں سانول سے کہوں گا کہ وہ تمہیں بھجوانے کا بندوبست کر دے۔''

یہی وہ لمحات تھے جب علی نے انتہائی تشکر سے میاں جی کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ گوپے میں مدہم روشنی تھی۔ اس میں میاں جی کا چہرہ سفید براق داڑھی میں اسے نورانی لگا۔ سر پر سفید پگڑی، سفید لبادہ، اس کے گرد جیسے نور کا ہالا۔ میاں جی بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ علی کا من انتہائی تشکر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن ایک لفظ بھی نہیں کہہ پا رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے چلتے ہوئے لمحے اچانک ساکت ہو گئے ہو۔ تبھی میاں جی کے لب وا ہوئے۔

''علی پتر......! کیا دیکھ رہے ہو؟''

''ک...... کچھ...... کچھ نہیں......! بس یونہی میاں جی۔''

''کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''نہیں میاں جی......!''

''تو پھر سنو......! یہ دنیا ایک غبار کی مانند ہے، جس کی اصل کچھ بھی نہیں ہے۔ جب یہ غبار تھمے گا نا تو سوائے مٹی میں لتھڑے ہوئے چہروں کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا۔ بس اس غبار سے بچنے کی کوشش کرنا۔ ورنہ لتھڑے ہوئے چہرے کو صاف کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں میاں جی......! علی نے بے تابی سے کہا تو میاں جی جیسے چونک گئے اور

پھر مسکراتے ہوئے بولے۔"

"ہاں......!تم ابھی نہیں سمجھو گے......!ابھی تم میں وہ سمجھ ہی بیدار نہیں ہوئی۔ خیر......! سمجھ جاؤ گے اور بہت خوب سمجھو گے......!وقت آنے دو......!" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر توقف کے بعد بولے۔"لو میاں، میں چلتا ہوں، پھر ملاقات ہو گی۔" میاں جی نے کہا اور اٹھ گئے۔ وہ تو وہاں سے چلے گئے لیکن اپنی مہکتی ہوئی بات کا اثر چھوڑ گئے۔ علی اسی میں کھو گیا۔ مگر کتنی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے علی نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ یوں وہ چند لمحے لاخیال سا ہو گیا تھا۔

سانول کوپے میں آیا تو اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا کانسی کا بڑا سا کٹورا تھا۔ اس نے آتے ہی وہ کٹورا علی کی جانب بڑھایا اور عام سے انداز سے کہا۔

"لے یہ پی لے۔"

"ارے اتنا دودھ......!میں نہیں پی سکوں گا۔" وہ گھبراتے ہوئے انداز میں بولا۔

"چل جتنا دل چاہے پی لے، باقی میں پی لوں گا۔ میں تو تیرے لئے اس میں گڑ ڈال کے لایا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کٹورا علی کو تھما دیا اور خود پیڑھے پر بیٹھ گیا۔ علی نے تھوڑا سا دودھ پیا اور باقی سانول کو دے دیا۔ اس نے چند گھونٹ میں وہ پی لیا اور کٹورا ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تو جانا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے علی کے چہرے کی طرف دیکھا، اسے خاموش پا کر کہا۔"میاں جی نے بتایا ہے مجھے۔ ٹھیک ہے میں کل تیرے لئے کوئی بندوبست کر دیتا ہوں۔"

"تمہاری مہربانی ہو گی۔" علی نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ تب سانول نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ایک بات پوچھوں علی......؟"

"ایک نہیں، جتنی تمہارا دل چاہے اتنی باتیں پوچھو۔" علی نے خوش دلی سے کہا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"تو بہت مطمئن ہے علی......!ذرا بھی گھبرایا ہوا نہیں ہے، ورنہ جو مجرم ہوتے ہیں نا، وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ لیکن ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، وہ حملہ آور کون تھے؟"

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، مگر مجھے پوری طرح اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔

اور انہوں نے یہ میرے ساتھ کیوں کیا......؟ سانول......!کیا تم یقین کرو گے، میں کسی کی محبت کا مارا ہوا ہوں۔" علی نے انتہائی بے دلی اور نفرت سے کہا۔

"محبت کا مارا ہو......؟ یہ کیا بات کہہ دی ہے تم نے علی۔" سانول نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ایسا ہوتا ہے سانول......!جب کوئی امرت کو بھی زہر بنا دیتا ہے۔" علی نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ سانول کچھ کہتا، کہیں قریب ہی سے لڑکیوں کا قہقہہ گونجا اور پھر پرات بجانے کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ چند لمحوں بعد سرائیکی میں عورتوں نے گیت گانے شروع کر دیئے۔ علی چونک گیا تھا۔ رات کے پرسکون سناٹے میں اچانک قہقہے اور گیتوں کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ سو علی نے سانول کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ......یہ کیا ہے سانول......؟"

"تمہیں نہیں پتہ......! شادی والے گھر میں عورتیں اکٹھی ہو کر گیت گاتی ہیں۔ ہم اسے "جاگا" کہتے ہیں۔"

"کسی کی شادی ہے؟" علی نے اطمینان سے پوچھا۔

"ہاں......!میری شادی ہے۔"

"تمہاری......!" علی نے حیرت سے مسکراتے ہوئے کہا۔"کب ہے تمہاری شادی؟"

"چند دن بعد......!ممکن ہے تین دن بعد......!"

"تاریخ کنفرم نہیں کی میرا مطلب ہے، طے نہیں ہوئی تاریخ؟" علی نے تیزی سے پوچھا۔

"طے ہے۔" سانول نے یوں کہا جیسے شادی کے بارے میں بات کرنا اسے اچھا نہ لگا ہو۔ علی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ایک بات پوچھوں سانول......؟"

"پوچھو......؟"

"لگتا نہیں ہے تمہاری شادی......تم خوش...... میرا مطلب تمہاری باتوں...... چہرے......"

"تم ٹھیک سمجھے ہو علی......!میں خوش نہیں ہوں، ذرا سا بھی خوش نہیں، بلکہ یہ شادی تو میرے لئے صدیوں کی جدائی کا پیغام لے کر آ رہی ہے، میں اُس سے بچھڑ کر رہ جاؤں گا۔ اس سے

...نا دور ہو جاؤں گا کہ وہ میرے سامنے بھی ہوگی تو میرا اور اس کا فاصلہ ہزاروں سال کے فاصلے پر ...وں گا۔" سانول یہ کہتے ہوئے انتہائی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس پر علی خاموش رہا۔ پھر دھیرے سے کہا۔

"عشق کر بیٹھے ہو کسی سے؟"

"عشق ......! وہ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ میری رگ رگ میں، میرے جسم کے ہر حصے میں، میری روح میں سمائی ہوئی ہے۔ اگر انسان کی انسان سے عبادت کرنا جائز ہوتی نا تو میں اس کی پوجا کرتا......! مگر...... عشق اولڑا درد ہی ایسا ہے نہ جان چھوڑتا ہے نہ جینے دیتا ہے۔ وہ خواجہ سائیں نے کہا ہے نا کہ عشق اولڑی پیڑ وو۔ لوکاں خبر نہ کائی......!"

"یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے سانول......! عشق بھی ہے اور وہ بھی انتہا کا عشق، پھر......!"

"میں تیری بات سمجھتا ہوں علی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو......! مگر شاید میرا عشق ابھی سچا نہیں ہے، میرے عشق کی راہ میں میری ماما کھڑی ہے۔ میں وہ حد نہیں پھلانگ سکتا......! نہیں پھلانگ سکتا میں۔" سانول نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں یوں بند کیں جیسے اندر کہیں بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہونے لگ گئی ہے۔

"ہوں......! تمہارے عشق کی راہ میں تمہاری ماما ہے......" علی نے سوچنے والے انداز میں کہا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "لیکن کیا وہ بھی واقف ہے تمہارے حال سے جس سے تم عشق کرتے ہو؟" اس کے یوں کہنے پر سانول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گومگو کی سی حالت میں بیٹھا رہا۔ چند لمحے یونہی اس حالت میں گزر گئے تو بولا۔

"پتہ نہیں یار......! وہ جانتی بھی ہے یا نہیں...... پر میرا سوہنا اللہ سائیں ضرور جانتا ہے۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہے وہ......! اس روہی کی ہرنی ہے وہ...... پتہ نہیں میرے رب سائیں نے اسے سب سے مختلف کیوں بنایا ہے۔ ہزاروں میں بھی ہوتی ہے نا تو الگ نظر آتی ہے۔"

"کاش میں تم سے پوچھ سکتا کہ وہ کون ہے......؟ خیر......! تم نے کوشش بھی نہیں کی، اسے بتایا بھی نہیں؟" علی نے تجسس سے پوچھا۔

"یار پتہ نہیں کیوں، میں نے کبھی اپنا حال دل اس سے کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اور پھر میں نے اسے کبھی خود سے الگ بھی نہیں سمجھا ہے۔ وہ میرے پاس، یہاں دل میں

رہتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ بس میری ماں کی ضد......" سانول انتہائی جذباتی انداز میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی میں کہیں سے آتی ہوئی گیتوں اور قہقہوں کی آواز سارے ماحول پر چھا گئی۔ وہ دونوں پتہ نہیں کتنی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے، سانول اپنے عشق کے بارے میں سوچتا رہا اور علی اس کے بارے میں۔ تب اچانک سانول اٹھا اور اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

"تو آرام کر علی......! میں چلتا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے علی کے کسی جواب کا انتظار کیے بنا گوپے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ علی چند لمحے یونہی ساکت سا بیٹھا رہا اور پھر اس نے دیئے کی جلتی لو کو پھونک مار کے بجھایا تو اندھیرا چھا گیا۔ وہ سونے کے لئے لیٹ گیا۔

☆☆☆

شہر کی سڑکوں پر اتنا رش نہیں تھا۔ فرزانہ خاں اپنی قیمتی گاڑی میں پھیلی ہوئی مدہم موسیقی میں ڈرائیورنگ کرتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی ساری توجہ علی کی طرف تھی لیکن کھلی آنکھوں سے گاڑی بھی چلا رہی تھی۔ وہ کل سے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ اس نے علی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ محض اس کی محبت میں اسے سمجھانے کے لئے کیا تھا، صرف ایک جھٹکا دینا مقصد تھا۔ خدا نخواستہ وہ اس کی جان کے درپے نہیں تھی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مزاحمت بھی کر سکتا ہے اور صورت حال یوں بھی سامنے آ سکتی ہے۔ آج وہ یونیورسٹی گئی بھی تھی لیکن ایک لمحے کے لئے بھی اس کا دل نہیں لگا۔ اس لئے جلد ہی وہاں سے واپس آنے کے لئے پر تولنے لگی تھی۔ ایسے میں نورین نے اس کی بے تابی سے متعلق وجہ پوچھی۔

"تم اتنی بے چین کیوں ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہو اور اب واپس جانے کی بھی جلدی ہو گئی ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"مجھے لائبریری جانا ہے میری جان، کچھ کتابیں لوں گی اور پھر گھر......!" فرزانہ خاں کو اور کچھ نہیں سوجھا تو جلدی سے بہانہ تراش دیا۔

"چلو پھر میں بھی چلتی ہوں۔ آج تو ڈیپارٹمنٹ میں بھی ہو کا عالم ہے۔ بے چارہ علی......! اس بے چارے کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ بوائز بتا رہے تھے کہ اسے کچھ غنڈوں نے اغواء کر لیا ہے۔ یہ کنفرم ہو گیا ہے۔" نورین نے اپنی ہی دھن میں کہا تو فرزانہ کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا تم اس کا راگ ہی لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ بابا اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ ورنہ کون ایسے کرتا ہے بھلا۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔ تب نورین نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صرف میری ہی نہیں، سب کی یہی رائے ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے نہیں ہوگی۔ مان لیا......! ویسے میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔" فرزانہ نے کس قدر ڈرامائی انداز میں کہا یوں جیسے خود کو مطمئن کر رہی ہو۔

"وہ کیسے؟" نورین حیرت سے بولی۔

"میں نے بابا سائیں سے کہا ہے۔ انہوں نے اسی وقت پولیس اسٹیشن فون کر دیا تھا۔ اب دیکھیں اگر وہ زندہ ہوا تو مل جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے، اسے کچھ ہوا ہو...... تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہ واقعتاً...... خیر......! تمہاری یہ مدد کوئی اتنی فائدہ مند نہیں ہوگی۔ یہ تو پولیس پر دباؤ ڈالا جائے تو ہی بات بنتی ہے۔ اس طرح کہہ دینے سے بھلا پولیس کہاں دلچسپی لیتی ہے۔" نورین کا لہجہ شکوہ بھرا تھا۔ اسے فرزانہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس وقت تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ سو نورین بھی اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ جب تک گاڑی چلی نہیں دونوں میں خاموشی رہی۔ تب نورین نے ہی بات بڑھائی

"پتہ نہیں کسے اس کے ساتھ دشمنی ہوگی۔"

"دشمنی نہ ہوگی تو کسی کو ستایا ہوگا۔" فرزانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اگر ایسی بات ہے تو سارا شک تم پر ہی جائے گا۔ تمہاری اس کے ساتھ کب بنی ہے۔ تم ہی تو کہتی ہو کہ وہ تیری محبت کے معاملے میں تجھے بہت ستا رہا ہے۔"

"کرلو شک، میں نے کب روکا ہے۔ تمہیں پتہ ہے نورین، میں اپنی مرضی کرتی ہوں۔ جب ضد پر آ جاؤں تو میں اپنے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔" وہ نخوت سے بولی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں فرزانہ......! تمہارا دولت مند ہونا، مغرور ہونا، یہ سب تمہارے دماغ میں منفی سوچیں ابھارتا ہے۔ اپنے آپ پر قابو رکھا کرو۔" نورین نے تحمل کے ساتھ اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے دولت مند ہونے کا غرور ہوتا نا نورین......! تو پھر تم کبھی بھی میری دوست نہ ہوتی۔ تم بھی تو ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا نا کہ میرا پرابلم کیا

ہے۔ تو سنو......! میرا پرابلم یہ ہے کہ مجھے کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے۔"

"کوئی تمہیں کیا سمجھے......! تم ہو ہی اتنی مشکل شے......! ضدی، اکھڑ، بدمزاج، بدتمیز۔"

"تم جو بھی کہہ لو......! علی نے اگر میری محبت قبول نہ کی تو...... تو...... خیر......! میں اگر چاہوں نا تو اسے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دوں۔ وہ جن مسائل کی بات کرتا ہے وہ سب چٹکیوں میں حل ہو جائیں۔ بس......! وہ میرا ہو جائے۔" فرزانہ نے خواب ناک لہجے میں کہا تو نورین اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ پھر مایوس لہجے میں بولی۔

"ابھی تو اس بے چارے کی واپسی کی دعا کرو۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور پھر کہتی چلی گئی۔ "جو تم نے زمین سے آسمان والی بات کی ہے نا، یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ محبت اگر دولت سے خریدی جا سکتی نا تو ساری محبت دولت مندوں کے پاس ہوتی۔ محبت کو دولت سے ناپنا چھوڑ دو......! پھر تمہیں سمجھ آسکے گی کہ دراصل محبت ہوتی کیا ہے؟"

"میں...... میں...... جو...... اس سے...... محبت کرتی ہوں۔ کیا...... کیا یہ رائیگاں عمل ہے۔" فرزانہ نے انتہائی جذباتی انداز میں تیزی سے کہنے کی کوشش میں اٹکتی چلی گئی۔

"محبت رائیگاں نہیں جاتی...... مگر شرط یہ ہے کہ وہ واقعی محبت ہو۔" نورین نے تحمل سے کہا۔

"تم پتہ نہیں کس محبت کی بات کر رہی ہو۔ میری سمجھ میں تو بالکل تمہاری بات نہیں آ رہی ہے۔"

"ہاں......! تمہیں سمجھ آئے گی بھی نہیں......! جب تمہیں محبت ہوگی نا، پھر سمجھ آئے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا۔ "گاڑی ذرا تیز چلاؤ، لائبریری میں وقت لگ سکتا ہے پھر گھر بھی جانا ہے۔"

اس وقت وہ نورین کو ڈراپ کر کے اپنے گھر کی جانب جا رہی تھی اور اس کے دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ وہ واقعی علی سے محبت نہیں کر رہی ہے یا اس سے کوئی بہت بڑی بھیانک غلطی ہوگئی ہے۔ وہ اسی کشمکش میں تھی اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے اپنی کار پورچ میں رہنے دی اور گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

سردار امین خاں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی فرزانہ خاں نے اپنے چہرے پر خوشگوار تاثر لانے کی انتہائی کوشش کی، جو بہت حد تک کامیاب بھی

رہی۔ اب وہ فرزانہ خاں نہیں رہی تھی جس کے چہرے پر مایوسی اور انتشار تھا، بلکہ ایک خوشگوار چہرہ لئے وہ اپنے باپ کے سامنے گئی۔ اس نے بہت احترام سے اپنے بابا کو سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی......!" امین خاں نے کہا اور پھر اس کے ہاتھوں میں کتابیں دیکھتا ہوا بولا۔ "اتنی کتابیں کیا تم پڑھو گی......؟"

"جی بابا سائیں......! میں یونیورسٹی کے بعد لائبریری چلی گئی تھی۔ مجھے ریسرچ رپورٹ لکھنا ہے۔ اس کے نوٹس لکھنے کے لئے کتابوں کی ضرورت تو پڑتی ہے نا۔" فرزانہ خاں نے بڑے احترام سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے تمہاری پڑھائی زوروں پر جا رہی ہے۔" امین خاں نے ہنستے ہوئے کہا اور اچانک ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "وہ......وہ......تم نے کہا تھا نا......وہ کیا نام ہے تمہارا کلاس فیلو......"

"علی ہے اس کا نام بابا سائیں۔" فرزانہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا تو وہ بولا

"ہاں ہاں وہی......! اس کے بارے میں پولیس کے پاس صرف اتنی سی انفارمیشن ہے کہ اسے اغواء کیا گیا ہے۔ انہوں نے پوری دیانت داری سے تفتیش کی ہے۔ دوسرے سٹوڈنٹس سے، طلبہ رہنماؤں سے سب سے پوچھا ہے۔ خاص بات جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی وہ سیاسی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی ہے......! خیر بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کلاس میں اس کا کسی سے جھگڑا تو نہیں چل رہا تھا؟"

امین خاں اپنی دھن میں کہے چلا جا رہا تھا لیکن فرزانہ خاں کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے علی کے بارے میں تفتیش اور تحقیق سے اس کا اپنا پول کھل جائے گا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اگر اس کے بابا سائیں کو معلوم ہو گیا تو......؟ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی۔ پھر فوراً ہی بولی۔

"بابا سائیں......! میری کلاس کے معاملات میں اتنی دلچسپی نہیں ہوتی، میں نے تو آپ سے یونہی کہہ دیا تھا۔ اگر آسانی سے اس کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ آپ اتنی دردسری نہ لیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، بس میں نے پولیس کو کہہ دیا ہے وہ جانیں اور ان کا کام......! تم جاؤ آرام کرو......! تھک گئی ہوگی۔" امین خاں نے کہا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس لئے وہ بغیر کچھ بولے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں گئی۔ کتابیں ایک طرف پڑے

صوفے پر پھینکیں اور خود کو بیڈ پر گرا لیا۔ وہ عجیب قسم کے انتشار میں آ گری تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شاید اس نے اپنی بازی خود ہی اپنے ہاتھوں ہار دی ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا، کب دو آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے ہیں۔ اس نے ان آنسوؤں کی تپش جب اپنے گالوں پر محسوس کی تو چونک گئی۔ یہ کیا ہوا......؟ کیا وہ رو رہی ہے، اپنی حالت پر رو رہی ہے یا ہار جانے کا دکھ اسے اندر سے توڑ پھوڑ رہا ہے یا پھر......! علی کے کھو جانے کا اسے دکھ ہے؟ اسے کوئی سمجھ نہیں آئی تو اس نے خود کو پھر سے آزاد چھوڑ دیا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ تب ایسے لمحات میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے یہ بارش برسنے دی۔ شاید اس سے غبار ڈھل جانے کی اُمید ہو۔

☆☆☆

جس طرح روہی اور لوک گیتوں کا آپس میں اٹوٹ رشتہ ہے بالکل اسی طرح صحرائے چولستان میں چلنے والی ہواؤں میں عشق و مستی اور جنوں کو ابھارنے والی کیفیات کے تاثر موجود ہوتے ہیں۔ یہاں پہلی نگاہ میں ویرانی دکھائی دیتی ہے لیکن جیسے ہی دل کے اندر عشق اپنی جگہ بناتا ہے تو یہ بھی ویرانی خوبصورتی میں ڈھل جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ عشق کی چنگاری کہاں سے آتی ہے اور دل میں موجود ساری محبتوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ پھر وہاں بسیرا ہوتا ہے تو فقط عشق کا۔ وہ چنگاری کوئی حسین چہرہ بھی ہو سکتی ہے۔ سانول کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے دل کی وادی میں عشق کی حکمرانی تھی۔ اور یہ آگ اس قدر بھڑک اٹھی تھی کہ اسے خود کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ بچپن سے وہ خواجہ سائیں کی کافیاں سنتا آ رہا تھا۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ عشق میں گرفتار ہے لیکن بارگاہ عشق میں کس طرح رہا جاتا ہے۔ اس کا اسے قطعاً علم نہیں تھا۔ بس ایک چہرے کا طواف ہی اس کے سکون کا باعث تھا مگر یہی اس کی نا سمجھی تھی۔ ہر طواف کے بعد آتش عشق مزید بھڑک جایا کرتی، پھر وہ ہوتا اور ویرانے۔ خواجہ سائیں کی سنی سنائی کافیوں کے بول اس کے لب پر ہوتے۔ اسے اپنی ہی آگ میں جلنے کا مزہ آنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا آپ مار لیا اور قربان گاہ ممتا پر خود کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنی بھینٹ دے کر سرخرو ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ماں کا مقام بہرحال اعلیٰ و ارفع تھا۔ اور وہ شام آ گئی تھی جب اس نے خود کو مقتل میں پیش کر دیا تھا۔ سورج غروب ہوا تو رات کے سائے پھیل گئے۔

اس کے گھر کا صحن بستی کی خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ میٹھے چولستانی گیتوں کی پھوار میں

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شہید عشق ہے اور اس کے سفر آخرت کی تیاری میں وہاں کی خواتین نوحہ خواں ہے۔ ایک عجیب تضاد تھا جس میں وہ پھنسا ہوا تھا۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے دل میں رو رہا تھا۔ اس وقت وہ عین صحن میں رنگین پیڑھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر کے اوپر سرخ آنچل تانا گیا تھا۔ گانہہ باندھ دینے کی رسم ہونے والی تھی۔ عورتیں گیت گا رہی تھی۔ اور اس کی نگاہیں اس چہرے کو تلاش کر رہی تھیں جو اس کا سب کچھ تھا۔ جدائی کا وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ جونہی اس کے گانہہ باندھ دیا گیا۔ تو وہ اس سے صدیوں کے فاصلے پر چلی جائے گی۔ مگر وہ چہرہ اسے دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ جب اس کی کلائی پر گانہہ باندھا جانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک تیر اس کے دل میں آ کر لگا ہے۔ ہر جانب لبوں پر مسکراہٹ تھی اور اس نے خود کو مار لیا۔ زعفرانی رنگ پھینکا جانے لگا۔ قہقہے اور مسکراہٹوں سے اس کا صحن بھر گیا۔ جس میں کسی نے بھی اس کے من کے اندر بچھے ماتم کو محسوس نہ کیا۔ اس سے پہلے کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر اس کا راز فاش کر دیں۔ وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے وہیں بیٹھا رہنے کے لئے بہت کہا گیا، مگر وہ نہیں بیٹھا۔ انہی لمحوں میں اس کی نگاہ اپنی ماں پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں آنسو تھے۔ شاید اسے اپنے بیٹے کے من کی خبر ہو گی تھی یا پھر یہ کوئی روحانی تعلق تھا کہ اس کا جگر گوشہ کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔

"فیضاں بہن مبارک ہو......!" کسی نے اس کی ماں سے کہا تو وہ اس طرف متوجہ ہو گئی اور سانول تیزی سے گوپے کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہی اس کی جائے عافیت ہوا کرتی تھی۔

گوپے میں اندھیرا تھا۔ سانول جب اندر آیا تو اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس لئے پریشانی سے بولا۔

"علی......! اُو علی......! کدھر ہو تم؟"

"میں یہیں ہوں......!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"دِیا نہیں جلایا تم نے......؟" سانول نے پوچھا۔

"بس دل نہیں کیا۔ تیرے انتظار میں تھا۔ نجانے تو کب آ جائے اور......" علی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس پر سانول سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا۔ سو وہ بولا۔

"مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹٹول کر ماچس اٹھائی اور پھر دیا سلائی رُوشن کرتے ہوئے کہا۔ "میرا دل نہیں مانتا کہ میں تمہیں کسی اور کے ساتھ شہر بھیجوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دِیا جلا دیا۔ گویا روشن ہوا تو اس کے ہاتھ میں باندھا ہوا گانہہ بھی صاف دکھائی دینے لگا۔ دِیئے کی لو تیز ہونے لگی تو اس نے کہا۔ "میں تجھے خود شہر چھوڑ کے آؤں گا۔ وہ بھی آج رات......!"

"تم......! خود...... مطلب تم مجھے چھوڑ کے آؤ گے۔" علی نے اس کی کلائی پر بندھے ہوئے گانہے کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......! میں چھوڑ کے آؤں گا۔" سانول نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی نے اس کے گانہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ......! یہ گانہہ......! تمہاری...... بلکہ تم لوگوں کی رسم کے مطابق تو جس کو گانہہ باندھ دیا جاتا ہے، وہ گھر سے نہیں نکلتا......اور......"

"چھوڑ اس گانہے کو......! تمہیں کیا پتہ کہ یہ کیا ہے۔ یہ تو جدائی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سرد سانس لیا اور پھر کہا۔ "جب تک یہ سونے کے لئے جائیں گے نا، تب تک تو میں تمہیں شہر کے پاس چھوڑ کے آ جاؤں گا۔ تو پریشان نہ ہو۔ آج رات وقت ہے، پھر شاید کئی دن تک مجھے وقت نہ ملے۔ تو ایسا کر یہاں سے نکل اور بستی کے باہر کھڑا ہو، میں آتا ہوں اونٹ لے کر۔ تو چل......!" سانول نے کہا اور علی کو حیران سا چھوڑ کر گوپے سے باہر نکل گیا۔ اگرچہ علی کو اپنے گھر جانے کی بہت جلدی تھی لیکن سانول کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس کی ساری بے چینی ایک دم سے ختم ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنے کپڑے وہیں پر رہنے دیئے۔ انہیں اٹھانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ اس نے سرہانے رکھا ریوالور اٹھایا اور گوپے سے باہر نکل گیا۔ سانول کے کپڑوں میں وہ وہیں کا باشندہ دکھائی دے رہا تھا۔

سانول باڑے میں اونٹ کو بٹھا کر اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اونٹ کو اٹھاتا، اس نے چاروں جانب دیکھا۔ اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اطمینان کر لینے کے بعد اس نے اونٹ کو اٹھایا اور باہر کی جانب لپکا۔ اسے بستی کے درمیان سے گزر کر ہی باہر جانا تھا۔

☆☆☆

اس وقت مہرو اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ بستی کی ایک گلی میں چلی آ رہی تھی۔ چاند نکلنے میں ابھی وقت تھا۔ اس لئے ان میں چند لڑکیوں کے ہاتھوں میں لالٹین پکڑی ہوئی تھی۔ اسی کی روشنی میں تیز اور تیکھے رنگوں کے لباس پہنے، دھیمے قہقہوں، مدہم باتوں اور میٹھی سرگوشیوں میں وہ

چلتی چلی آرہی تھی۔

''بھئی شماں کے چہرے پر کتنی خوشی چمک رہی تھی، تم نے دیکھا تھا؟'' کسی ایک لڑکی نے کہا تو مہرو بولی۔

''تم کیا سمجھتی ہو۔ کیا اسے خوشی نہیں ہوگی......! سانول جیسا لڑکا اس بستی میں ہی نہیں، پورے علاقے میں نہیں ہے۔ معصوم، بھولا بھالا...! صاف گو اور اتنا خوبصورت......!'' مہرو یہ کہتے ہوئے نجانے کہاں کھوگئی۔

''ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا، تمہیں اتنا اچھا لگتا ہے تو...۔'' ایک لڑکی نے سرگوشی میں کہا تو مہرو بجائے شرمانے کے جلدی سے بولی۔

''سانول جیسا شوہر پاکر ہر لڑکی اپنی قسمت پر ناز کرسکتی ہے۔ لیکن میرا اور اس کا سنجوگ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''وہ کیوں، سانول تیرا پھوپھی زاد نہیں ہے؟''

''ہے، لیکن میرے بھائی کے لئے ان کے پاس وٹہ تو نہیں ہے نا۔ شماں کا کوئی بھائی نہیں ہے، اس لئے ان کی شادی طے ہوگئی۔ ورنہ سانول بے چارہ کب تک ایسے رہتا۔'' مہرو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہے بہت اچھا، مگر تیرے بھائی رب نواز کی وجہ سے......''

''اچھا تو ہے، میں چاہے جتنا مرضی اس کے ساتھ مذاق کرلوں، جتنا مرضی تنگ کرلوں، نہ وہ کبھی گھبرایا اور نہ ہی کبھی ناراض ہوا ہے۔'' مہرو نے انتہائی فخر سے کہا۔ تو دوسری لڑکیاں ہنس دیں۔

''چل جلدی چل، پتہ نہیں سانول کے گانہ باندھ دیا گیا ہوگا۔ بڑی رونق ہوگی ان کے گھر۔'' ایک لڑکی نے کہا تو ان میں سے ایک لڑکی کی نگاہ علی پر پڑی جو بہت اطمینان سے ان کے قریب سے گزر گیا تھا۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں۔ ایک نگاہ بھی ان لڑکیوں پر نہیں ڈالی۔ یوں جیسے ان سے چھپ کر جانا چاہ رہا ہو۔

''ارے یہ وہی شہری نہیں ہے جو سانول کا مہمان ہے۔'' کسی نے سرگوشی کی۔

''ہے تو وہی......! پر یہ جا کدھر رہا ہے؟'' دوسری سرگوشی ابھری۔

''کہیں بھی جائے ہمیں کیا، تم چلو دیر ہو رہی ہے۔'' مہرو نے کہا اور وہ سب تیز تیز

قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔ پھر جیسے ہی وہ لڑکیاں گلی کے موڑ پر آئیں تو انہیں سامنے سے اونٹ پر سوار سانول دکھائی دیا۔

''ارے یہ سانول......! یہ کدھر جارہا ہے۔'' ایک لڑکی نے حیرت سے کہا تو مہرو جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑی ہوگئی۔ اگر سانول فوراً ہی اونٹ کو نہ سنبھالتا تو شاید مہرو لتاڑی جاتی۔ سانول کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا وہ ایک ٹک مہرو کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مہرو نے اس کے چہرے پر دیکھا اور پھر ان ہاتھوں پر اس کی نگاہ گئی جن میں کس کر مہاریں پکڑیں تھیں اور گانہ چمک رہا تھا۔

''اے سانول......! تیرے تو گانہ باندھ دیا ہے اور پھر تم اس وقت کہاں جارہے ہو؟'' مہرو نے تیز لہجے میں پوچھا تو سانول کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''کہیں نہیں......!''

''ہائیں......! اونٹ پر سوار ہے، اور کہتا ہے کہیں نہیں جارہا۔'' مہرو نے مسکراتے ہوئے حیرت سے کہا۔ تب سانول نے پیار بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی حسرت سے کہا۔

''مہرو......! بڑی ساری ایسی منزلیں ہوتیں ہیں جو سامنے بھی ہوں تو ان کے بارے میں اظہار نہیں کیا جاتا۔ ورنہ راستے کھوٹے ہوجاتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم......! میرے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا۔'' مہرو نے حیرت سے کہا۔

''ساری عقل سمجھ تو میرے لئے چھوڑ دے، تو کچھ بھی نہ سمجھ۔ چل راستہ چھوڑ۔'' سانول نے مایوس لہجے میں کہا۔

''مگر میں تم سے پوچھ رہی ہوں، تم جا کدھر رہے ہو۔ آخر میں تیری سات (کزن) ہوں۔ پوچھ سکتی ہوں تم سے......''

''بہت ساری باتیں نہ بتانے والی ہوتی ہیں اور نہ پوچھنے والی۔ ورنہ بہت کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ تم میرا راستہ چھوڑ دو۔ جانے دو مجھے۔'' سانول اپنی ہی جھونک میں کہتا چلا گیا تو مہرو نے غصے میں کہا۔

''لگتا ہے تو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ کسی جن کا سایہ ہوگیا ہے تم پر۔ کیا بہکی بہکی باتیں کررہا ہے۔ بتا کدھر جارہا ہے، ورنہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

"ایسی باتیں مت کر مہرو، جو ناممکن ہوں۔ دکھ ہوتا ہے۔ شاید اب ہوش آجائے مجھے۔ تم جاؤ مجھے جانے دو......!"

"نہیں جاتی......! اور تجھے بھی نہیں جانے دوں گی۔" مہرو نے غصے میں کہا اور پاس کھڑے ایک شخص سے لاٹھی لے کر زمین پر اس سے لکیر ڈال دی۔ اور پھر بڑی شوخی سے کہا۔

"جب تک مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کدھر جا رہے ہو، اس لکیر سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔ یا پھر واپس چلے جاؤ۔"

"مہرو......! تیرے ساتھ میرا کیا مقابلہ......! میں تو پہلے ہی ہار گیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم بہت ضدی ہو۔ مگر اس وقت کچھ مت پوچھو۔ اس وقت مجھے جانے دو۔ میں کل تجھے بتا دوں گا۔" سانول نے پیار سے کہا تو مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں جانے دوں گی۔ بتا...... کدھر جا رہا ہے۔ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو شماں......" مہرو بولی۔

"تمہیں میرا خیال نہیں، اپنی سہیلی کی فکر ہے۔" سانول نے پوچھا۔

"ہاں ہے......!" مہرو نے ڈٹ کر کہا تو سانول نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر دور کھڑے علی کے ہیولے کو دیکھا اور اپنا اونٹ ہانک دیا۔ اونٹ ابھی دو قدم بھی نہیں چلا تھا۔ اس سے پہلے کہ مہرو کی کھینچی ہوئی لکیر پار کرتا۔ مہرو آگے بڑھی۔ اس نے ایک خاص تکنیک سے لاٹھی اونٹ کے اگلے پیروں میں پھنسا دی۔ تبھی اونٹ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔ وہاں پر موجود لڑکیاں قہقہہ مار کے ہنس دیں۔ سانول سنبھلتا ہوا جب گرا تو مہرو نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ دونوں انتہائی پاس تھے۔ مہرو کا چہرہ سانول کے عین سامنے تھا۔ تیز سانسیں، گہری آنکھیں اور مسکراتے لب۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار وہ اتنے قریب آئے تھے۔ اتنے قریب کہ مہرو کی سانسیں سانول کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ سانول کے چہرے پر کئی ایسے رنگ اتر آئے تھے جنہیں دیکھ کر مہرو حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ قدرت نے عورت کو دیکھنے میں ایک ایسا وصف دیا کہ ہے کہ وہ مرد کی آنکھ میں ابھرنے والی ہر بات کو پہچان سکتی ہے۔ اگر وہ پہچان نہ بھی سکے تو احساس ضرور کر لیتی ہے۔ اس وقت مہرو نے جو سانول کی آنکھوں میں دیکھا تو اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس کا اندر تک لرز گیا۔ سو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں روک لیا نا......؟"

"اچھا کیا جو تو نے مجھے روک لیا۔ تیرے لئے میرے دل میں جو محبت ہے نا، ان لمحوں میں وہ، بھانبڑ بن گیا ہے۔ میں نے تیری محبت کو تھپک کر سلا دینا چاہا مگر تو نے اسے جگا دیا۔ تو میری ہے مہرو......! میں تم سے عشق کرتا ہوں۔" سانول نے کہا تو مہرو کا دماغ جیسے ہوا میں اڑ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اگلے ہی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے......؟ جھوٹ کہتا ہے تو......! اگر ایسا تھا تو پھر اظہار......"

"تو جانتی ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔" سانول نے انتہائی دکھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی بول رہی تھی۔ تب مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم میں ہمت ہوتی نا تو مجھے بھگا لے جاتا۔ محبت کرتا ہے نا مجھ سے!" مہرو کے لہجے میں نخوت سے زیادہ ہتک تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے خود کو سانول سے الگ کرنا چاہا لیکن سانول اسے پکڑ چکا تھا۔ اس نے مہرو کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔

"تو میری ہے مہرو......! چل ابھی لے چلتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ مہرو کی سمجھ میں کچھ آتا۔ سانول نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈال دیا۔ پھر ایک ہی جھٹکے میں اسے اونٹ پر لاد دیا۔ مہرو کی تیز چیخ گونجی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مزاحمت کی۔ وہ مچھلی کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ لیکن سانول نے مضبوط بازوؤں میں آتے ہی اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ ارد گرد کھڑی لڑکیاں حیرت سے گنگ ہو گئیں۔ وہ اس سارے واقعے کو مذاق ہی سمجھ رہی تھیں۔ سانول اپنے اونٹ کو کھڑا کر چکا تھا۔ تبھی پاس ہی کھڑے ہوئے شخص نے بھاگ کر سانول کا پاؤں پکڑ لیا۔ تا کہ اسے کھینچ کر روکنے کی کوشش کرے۔ یہ صورت حال دیکھ کر لڑکیاں چیخنے لگیں۔ مہرو زور زور سے چیخ رہی تھی۔ "بچاؤ بچاؤ......!" لیکن سانول نے زور سے لات اس شخص کے رسید کی۔ وہ لڑھک کر گر گیا۔

دور کھڑا علی یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب تک ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہی وہ صبر سے کھڑا رہا۔ لیکن جونہی چیخ پکار ہوئی علی بھاگ کر وہاں آ پہنچا۔ تب تک وہ شخص زمین پر گر چکا تھا۔ لڑکیاں شور مچا رہی تھیں، سانول اونٹ کو بڑھانے کے لئے پر تول رہا تھا اور اس کے آگے اوندھے منہ لڑکی اونٹ پر لدی ہوئی تھی جس کا چہرہ علی دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہا ہے سانول......؟" علی نے چیخ کر پوچھا۔

"یہ ہی میرا عشق ہے علی......! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں لے جا رہا ہوں

اسے......‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے اونٹ بڑھا دیا۔ تبھی گرا ہوا شخص اٹھا اس نے لاٹھی پکڑ کر وار کرنا چاہا لیکن علی نے اس کی لاٹھی پکڑ لی، لڑکیاں اونٹ کو روکنے کے لئے بڑھیں۔ تب علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ ایک لمحہ کے بعد وہاں پر خاموشی چھا گئی۔ سب سہم کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ اتنے میں سانول مہرو کو لے کر گلی کا موڑ مڑ گیا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ ہر جانب سناٹا طاری تھا۔ شہر کے لوگ سکون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسے میں غلام نبی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بہت ساری سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک علی کیا اغواء ہوا تھا اس کی تو دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ دکھ اپنی بیوی نگہت کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ پچھلے تین دنوں میں وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ آج شام تو اس کی حالت اچھی خاصی غیر ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا تھا۔ اس وقت وہ سکون آور دوا کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے کسی انجانے خوف سے سہم کر رہ گئے تھے۔ وہ کالج جانا تو کیا، کھانا پینا تک بھول گئے تھے۔ اور وہ خود تھانے اور بااثر لوگوں کے پاس جا جا کر تھک چکا تھا۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اگر علی نے کچھ بھی نہیں کیا تو وہ اغواء کیوں ہو گیا؟ اگر اغواء کاروں کا کوئی مقصد تھا تو وہ اب تک سامنے کیوں نہیں آیا۔ ایک ذرا سی اُمید بندھی تھی جب وہ ملک صاحب کے ساتھ تھانے گیا تھا۔ وہاں سے بنیادی معلومات لے کر وہ دونوں ڈی ایس پی کے دفتر میں گئے تھے۔ پہلی بار غلام نبی کو محسوس ہوا کہ پولیس والے بھی نرم مزاج اور بات سننے والے ہوتے ہیں۔ ڈی ایس پی رفاقت باجوہ بہت تپاک سے ملا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے معاملہ پوچھا تو ملک صاحب نے کہا۔

’’یہ غلام نبی صاحب ہیں اور ان کا بیٹا علی اغواء ہوا ہے۔ آپ کے جو ایس ایچ او صاحب ہیں وہ ان سے کوئی تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ خصوصی تعاون کریں تا کہ ان کا بیٹا انہیں مل جائے۔‘‘

’’ملک صاحب......! آپ کے فون آنے کے بعد میں نے پوری تفصیل معلوم کی ہے۔ دراصل وہ بھی اندھیرے میں ہیں۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ پولیس کو پوری بات نہیں بتائی جاتی۔ جس سے بہت ساری غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور تحقیقات درست سمت میں نہیں ہو پاتیں۔‘‘

’’لیکن باجوہ صاحب......! میں نے تو وہ ساری باتیں گوش گزار کر دی تھیں جو مجھے

معلوم ہیں۔‘‘ غلام نبی نے تحمل سے کہا۔

’’ممکن ہے کوئی بات ایسی سامنے نہ آئی ہو جس سے کوئی سراغ مل سکتا ہو۔ اور وہ بہت اہم ہو۔ دیکھیں...... ! بعض دفعہ اصل واقعہ کچھ اور ہوتا ہے لیکن ہمیں دکھائی کچھ دیتا ہے۔ آپ نئی جنریشن کے بارے میں جانتے ہی ہوں گے۔ ان کے پاس کیسے مقاصد ہیں۔ آپ اس سے بھی واقف ہوں گے۔ ممکن ہے علی کے بارے میں جو کہانی ہمیں سننے کو ملی ہے وہ نہ ہو۔ آپ کسی دباؤ کے تحت یا کسی اور وجہ سے کوئی اہم بات نہ بتا پا رہے ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ علی خود ایسے معاملے میں ملوث ہو جس کے بارے میں آپ کو علم ہی نہ ہو۔ اگر ہے تو آپ ظاہر نہیں کر رہے ہیں۔‘‘

’’دیکھیں جناب......! میں اچھی سمجھ گیا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، ہمیں پورا یقین ہے کہ میرا بیٹا کسی بھی ایسی غلط طرح کی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہم کسی دباؤ کے تحت کوئی بات چھپا رہے ہیں۔ مجھے جو معلوم تھا وہ ایف آئی آر میں درج ہے۔‘‘ غلام نبی نے بھی پوری تفصیل سے اپنی بات کہہ دی۔

’’اچھا......! کسی نے رابطہ کیا ہوا......؟‘‘ ڈی ایس پی نے پوچھا۔ وہ براہ راست غلام نبی کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ جس پر اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

’’نہیں......! کسی نے بھی رابطہ نہیں کیا، کوئی اطلاع تک نہیں ہے۔‘‘

’’اب سنیں غلام نبی صاحب......! آپ کو شاید معلوم بھی نہیں ہوگا۔ لیکن آپ کے بیٹے والے معاملے میں سردار امین خان جیسا بندہ دلچسپی لے رہا ہے، پوچھ سکتا ہوں کیوں؟‘‘ ڈی ایس پی نے انکشاف کیا تو ملک صاحب سمیت غلام نبی بھی چونک گیا تھا۔ پھر اس نے بمشکل کہا تھا۔

’’مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔‘‘

’’بہر حال...... ! ہم اپنے فرائض سمجھتے ہیں اور پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کو اگر ذرا سی بھی معلومات ملے تو پلیز ہمیں بتائیے گا۔‘‘ ڈی ایس پی نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ اس ملاقات کے بعد غلام نبی کسی اور ہی نہج پر سوچنے لگا تھا۔ یہی سوچ اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی کہ آخر سردار امین خان کو اس کے بیٹے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ یہ بات اپنی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس کی طرح پریشان ہو جاتی۔ یہ دُکھ اس نے اکیلے ہی سہنا تھا اور اپنے گھر والوں کو حوصلہ دینا تھا۔ اس پر دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی جسے اس نے بہر حال نبھانا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے کروٹ بدلی اور سونے کی

کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ چولستان میں موجود اس کچی بستی پر وہ صبح بہت سوگوار تھی۔ سانول ایک مہرو کو لے کر ہی نہیں بھاگا تھا۔ بلکہ اس نے کئی رشتوں کو ایک جھٹکے میں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس بستی میں موجود شماں کا گھر جو رات تک خوشیوں سے بھرا ہوا تھا، اب وہاں کی فضا ماتم کناں تھی۔ سانول کا گھر جہاں خوشیوں بھرے گیت گائے جا رہے تھے، وہاں سانول کی ماں آنکھوں میں آنسو لئے شرم سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چند عورتیں اس کے گرد جمع تھیں، جن کی نگاہوں میں دکھ کی بجائے حیرت، طنز اور نفرت تھی۔ جن کا سامنا اماں فیضاں نہیں کر پا رہی تھی۔ اور مہرو کا گھر ویران تھا۔ صحن میں بندھے ہوئے جانوروں کے سوا کوئی انسان نہیں تھا۔ وہ سب پیر سیدن شاہ کی حویلی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بستی کے چند لوگ بھی تھے۔

پیر سیدن شاہ کی حویلی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ وہ سب ایک ہال نما کمرے میں موجود تھے اور ان کے درمیان رسیوں سے بندھا ہوا علی پڑا تھا۔ وہ بے بس تھا اور کچھ بھی نہیں کہہ پا رہا تھا۔ ان سب کو پیر سیدن شاہ کا انتظار تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اندرونی کمرے سے وہ نمودار ہوا اور بڑے ہی کروفر اور شاہانہ انداز میں ایک طرف دھری ہوتی سفید مسند پر بیٹھ گیا۔ لمبا قد، کالا کرتا، سفید شلوار، گلے میں موتیوں کی مالا اور سونے کی موٹی زنجیر، سر پر سبز پگڑی، چھوٹی چھوٹی کھچڑی ڈاڑھی اور آنکھوں میں خمار بھرا جلال......! اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ اپنے مرید خاص پیراں دتہ پر آ رکی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور نہایت ادب سے بولا۔

''پیر سائیں......! رات ان کی بستی میں ظلم ہو گیا ہے یہ سامنے گامن کھڑا ہے، اس کی بیٹی کو سانول اغواء کر کے لے گیا ہے۔''

''اور یہ کون ہے......؟'' سیدن شاہ نے نگاہ کا اشارہ کرتے ہوئے علی کے بارے میں پوچھا۔

''پیر سائیں......! تین دن پہلے یہ سانول کو اسی صحرا میں ملا تھا۔ وہ ہی اس کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ کون ہے اور کدھر سے آیا ہے۔ یہ باندھ کر آپ کی خدمت میں اس لئے لایا گیا ہے کہ اس نے سانول کو بھاگنے میں مدد دی ہے۔ اس کے پاس سے ریوالور بھی برآمد ہوا ہے۔''

''کیوں......!'' سیدن شاہ نے ہنکارا بھرا اور پھر اس کی نگاہ رب نواز پر ٹک گئی تو وہ

بولا۔ ''تم مہرو کے بھائی ہو نا رب نواز......!''

''جی سائیں......!'' وہ قدرے جھکتے ہوئے بولا۔

''تو یہاں کیا کر رہے ہو...... جاؤ واہر لے کر جاؤ سانول کے پیچھے۔ وہ یہاں سے کہاں جا سکتا ہے۔ اسے تلاش کرو اور مہرو کو لے آؤ۔''

سیدن شاہ نے جیسے ہی کہا رب نواز کے چہرے پر یوں رنگ بدلے جیسے اسے اب کھلی اجازت مل گئی ہے۔ وہ بے چین ہو گیا۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پلٹ کر واپس جانا چاہتا تھا، لیکن وہاں کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔ سیدن شاہ کہہ رہا تھا۔

''اسے قید خانے میں ڈال دو......! اس کے معاملے کو بعد میں دیکھیں گے۔ اب جاؤ۔'' سیدن شاہ نے کہا تو سب الٹے قدموں واپس جانے لگے۔ پھر جیسے ہی حویلی سے باہر آئے تو رب نواز نے کہا۔

''میں سانول کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

گامن نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا جس کے ارادے بہت خطرناک دکھائی دے رہے۔ کچھ بھی تھا بہر حال سانول اُس کی بہن کا بیٹا تھا اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کہتا۔ اندر سے سیدن شاہ کے چند لوگ آ گئے۔ گامن اس کی بیوی اور چند لوگ بستی کی طرف چل پڑے جبکہ کھوجیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ واہر نکل پڑی۔ پیراں دتے نے اپنے آدمیوں کو اس کے ساتھ خصوصی طور پر بھیجا تھا۔

اگرچہ صحرا میں ہوائیں راستہ تک بدل دیتی ہیں۔ لیکن صحرائی باشندوں کو قدموں کے نشانات سے کسی کا سراغ لگانے میں بہت مہارت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں میں یہ مہارت تو اس قدر ہوتی ہے کہ وہ میٹھے پانی کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ پیر سیدن شاہ کی حویلی سے انہیں بڑی آس تھی۔ وہ شخص ہی اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ روہی میں انسان تو کیا جانور تک اس کی نگاہ میں رہتے تھے۔ ذرا ذرا معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کا فیصلہ اس حویلی میں ہوا کرتا تھا۔ اس حویلی میں ایسے ماہر سراغ رساں موجود تھے۔ جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ سانول اور مہرو کا سراغ اس صحرا میں لگا لیں گے۔ وہ لوگ تیزی سے آگے نکل گئے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں تھا۔ رب نواز بھی ان میں شامل تھا جس کے ہاتھ میں کلہاڑی پکڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

صحرائے چولستان کے دور افتادہ علاقے میں وہ جگہ بستی سے خاصی دور تھی۔ وہ خان محمد کا ڈیرہ تھا، جہاں وہ کبھی کبھی شکار کے لئے نکلتا تو چند دن بسیرا کرتا تھا۔ وہاں پر اس کا ایک ملازم کبھی کبھی آتا اور صفائی ستھرائی کر کے چلا جاتا تھا۔ چند کمرے، دو گوپے اور کافی کشادہ صحن جس کی دیواریں نہیں تھیں۔ وہاں سے دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ٹیلوں کی اونچ نیچ میں وہ جگہ کافی حد تک چھپی ہوئی بھی لگتی تھی۔ خان محمد اس علاقے کا بااثر آدمی تھا۔ وہ شکاریوں اور بہادروں کی بہت قدر کرتا تھا۔ سانول کی اس سے دوستی صرف اس لئے تھی کہ وہ اونٹوں کے معاملے میں خاصا ہنر مند سمجھا جاتا تھا۔ سانول رات کے پچھلے پہر خان محمد کی بستی میں چلا گیا تھا۔ وہ اسی وقت بیدار ہوا اور سانول کی ساری روداد سنی۔ مہرو نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور جس وقت وہ خان محمد کی بستی میں داخل ہوئے تھے، اس وقت تک مہرو بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے سانول کو ڈیرے پر چلے جانے کے لئے کہا تھا۔ جہاں نہ صرف وہ کئی دن تک محفوظ رہ سکتا تھا بلکہ اتنے دنوں میں کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سو اسی وقت سانول خان محمد کے ڈیرے پر چلا گیا۔ جہاں پر مہرو کو ہوش آیا۔

دوپہر ہونے کو آ گئی تھی لیکن ان دونوں میں ایک لفظ کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ مہرو کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔ جبکہ سانول ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اس نے مہرو کو یوں لا کر اچھا کیا ہے یا غلط......؟ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مہرو اس قدر آزردہ اور بے حال کیوں ہو رہی ہے۔ ان دونوں کا ساتھ تو بچپن کا ہے۔ وہ ایک ساتھ پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوگا جب وہ مہرو کی کسی بات، شوخ جملے یا شرارت سے محفوظ رہا ہو۔ وہ اس کے ساتھ بدتمیزی کی حد تک مذاق کر جایا کرتی تھی اور سانول نے کبھی برا نہیں منایا تھا۔ نجانے کتنی یادیں اس کے دماغ میں آ کر چلی گئی تھیں۔ وہ مسلسل سوچتا چلا جا رہا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ مہرو کو چپ ہی کرا دے۔ اور مہرو تھی کہ مسلسل آنسو بہائے چلی جا رہی تھی۔ پھر سانول کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اٹھا اور دھیرے دھیرے اس کے پاس چلا گیا۔ مہرو چارپائی پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ سانول نے دھیرے سے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اب بس کر، رو مت۔''

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ مہرو تڑپ کر اٹھی اور بھیگے چہرے کے ساتھ اس کی طرف انتہائی

نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، مجھے یوں لا کر، بستی سے اٹھا کر یہاں لائے ہو تو بہت بڑا کام کر دیا ہے۔ سانول تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم نے کیا کر لیا ہے۔'' مہرو کے لہجے میں نفرت تھی۔ جس پر سانول نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے زخمی لہجے میں کہا۔

''احساس......! ہاں مجھے احساس ہے کہ میں اپنی آگ میں خود ہی جل گیا ہوں۔ میں تیرے عشق میں نجانے کب سے جل رہا ہوں۔ میں......تم سے محبت کرتا ہوں مہرو......''

''تم......! تم محبت کرتے ہو مجھ سے، یہ ہے تمہاری محبت۔'' مہرو نے تلخی سے کہا۔

''کہا نا......! میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ تو میری ہے، تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ میں اپنی محبت کا اظہار تم سے کر دیتا لیکن تم......تمہیں یاد ہے تو میرے ساتھ کتنی شرارتیں کرتی تھیں، میرے ساتھ...... میں تیری ہر شرارت کو تیرے پیار کی ادا ہی سمجھتا ہوں مہرو......! پر میری اماں۔ میری اماں نے میری زندگی برباد کر دی۔ میں نے اپنے آپ کو مار لینا چاہا مگر......''

''پر اب میرا بھائی رب نواز تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرا بس چلے تو میں ابھی تجھے مار دوں گا۔'' مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر دانت پیستے ہوئے کہا۔ تو سانول مسکرا دیا اور پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''تو مجھے مار دے تو اور کیا چاہیے۔ بس تو میری ہو جا۔'' یہ کہہ کر وہ مہرو کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے ہزاروں چراغ روشن تھے۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ......! ہم خان محمد کے ڈیرے پر ہیں۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس نے ہمیں پناہ دی ہے۔ تو میرے ساتھ شادی کر لے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہیں......!'' مہرو نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ''میں تیرے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں نہیں کر سکتی؟'' سانول نے حیرت سے کہا۔

''کیونکہ میں تیرے ساتھ نفرت کرتی ہوں۔ نفرت۔'' مہرو نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ تو سانول انتہائی بے چارگی سے بولا۔

''مگر میں تیرے ساتھ انتہائی محبت کرتا ہوں۔''

"نہیں ....! تم خود غرض ہو۔ تم نے کسی کا خیال نہیں رکھا۔ بس اپنے ہی بارے میں سوچا، کیا حال ہوتا ہوگا شماں کا، اس کے گھر والوں کا، میرے ماں باپ کا، میرا بھائی کس قدر نیچی نگاہیں کر کے پھرتا ہوگا اور میں...... میری کیا عزت رہ گئی ہوگی بستی میں؟"

"کون ہے جو تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ میں جو ہوں تیری عزت بنانے والا۔ میں تجھے اپنی آنکھوں میں سجا کر رکھوں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی......"

"بس بہت ہوگیا سانول......" مہرو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "تیری محبت نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ زاروقطار رونے لگی تو سانول اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کافی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر واپس اسی جگہ آ بیٹھا، جہاں سے اُٹھا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ اسے کچھ ہی فاصلے سے پکارا گیا۔ وہ اپنا نام سن کر چونک اٹھا۔ پھر بڑے ہی محتاط انداز میں اٹھ کر اس جانب بڑھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ذرا سے فاصلے پر خان محمد کا ملازم اونٹ کو بٹھا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا۔ ملازم اونٹ سے بندھی ہوئی پوٹلی اتارنے لگا۔

"خان سائیں نے یہ کھانا بھیجا ہے۔" اس نے پوٹلی سانول کو تھماتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "اور ہاں، خان سائیں نے یہ بھی کہا ہے کہ لڑکی اگر مان گئی ہے تو اسے لے آؤ، نکاح کا بندوبست ہے اور اگر نہیں مانی ہے تو اسے مناؤ۔ چاہے جتنے دن لگ جائیں۔"

"چاہیں جتنے دن لگ جائیں۔" سانول نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہا ہو۔ لہجہ اتنا دھیما تھا کہ وہ ملازم سن ہی نہیں سکا۔ وہ اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔

"میں تمہیں کمروں کی چابیاں دے دیتا ہوں، جس میں مرضی رہنا۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لئے بالٹی اور رسی اندر پڑے ہیں۔ آرام سے رہو۔ میں روزانہ اسی وقت کھانا دے جایا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" سانول نے کہا تو ملازم نے اندرونی جیب سے چابیاں نکال کر اسے دے دیں۔ "اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو خان سائیں نے کہا ہے کہ سیدھا بستی میں آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے پھر اسی طرح جواب دیا تو ملازم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا اور پھر اسی طرح اونٹ پر سوار ہو کر واپس پلٹ گیا۔ سانول اسے کافی دور تک جاتے ہوئے

دیکھتا رہا۔ پھر پلٹ کر ڈیرے کے اندر آیا تو دھک سے رہ گیا۔ مہرو وہاں نہیں تھی۔ اس نے پوٹلی چارپائی پر رکھی اور اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ تب اسے کافی دور بھاگتی ہوئی مہرو دکھائی دی سانول کے تو جیسے حواس گم ہوگئے۔

"رک جاؤ مہرو......!" سانول نے پوری قوت سے آواز دی۔ لیکن مہرو نہیں رکی۔ وہ بے تحاشا بھاگتی چلی جارہی تھی۔ وہ جب اونچے ٹیلے سے نیچے اتری تو ایک لمحے کے لئے سانول کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سانول پوری قوت سے بھاگتا چلا گیا۔ پھر وہ اسے دکھائی دے گئی۔ لحہ بہ لحہ ان میں فاصلہ کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سانول اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے مہرو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے، پھولے ہوئے سانسوں میں کہا۔

"م...... مم...... مہرو......! یہ کیا کر رہی ہو تم...... کہاں جارہی ہو......؟"

"سانول......! مت روکو مجھے، جانے دو میرا راستہ نہ روکو......! تم نے شماں کی زندگی تو برباد کر دی ہے اب......اب میری زندگی بھی برباد کرے گا۔"

"نہیں مہرو......!" سانول نے یہ کہتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔ "ہم دونوں کی زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ بس تم ہاں کر دو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ سب کو منالوں گا۔ ہم آج ہی نکاح کر لیتے ہیں۔"

"تم جو سوچ رہے ہو، ویسا کچھ نہیں ہونے والا میں مر جاؤں گی، مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔" مہرو نے چیختے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ تو سانول نے روہانسے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں کرو گی شادی...... آخر میں......"

"ثابت ہو جائے گا سانول......! کہ میں تیرے ساتھ جان بوجھ کر بھاگی ہوں۔ بس مجھے جانے دو۔" مہرو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے......! آؤ کھانا کھالو......! تھوڑی دیر سوچ لو...... پھر تم جو فیصلہ بھی کرو، مجھے منظور ہوگا۔ آؤ......!" سانول نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور واپس لے جانے کے لئے زور لگایا۔

"نہیں......! مجھے جانے دو......!" مہرو نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔ بالکل انہی لمحات میں ٹیلے کی دوسری جانب سے آوازیں آنا شروع ہوگئیں، جیسے بہت سارے لوگ چلے

آرہے ہوں اور پھر چند لمحوں بعد بستی سے آنے والی واہران کے سروں پر پہنچ گئی۔سب سے آگے کھوجی اور پھر بستی کے لوگوں کے درمیان کھڑا رب نواز جو تیر کی سی تیزی سے ان لوگوں کے درمیان میں سے نکلا اور سانول کی جانب بڑھا۔اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جسے اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔رب نواز کی نگاہ یوں سانول پر جمی ہوئی تھی جیسے شکار کرنے سے پہلے شکاری کی نگاہ شکار پر ہوتی ہے۔

''سانول.....! چھوڑ دے اسے۔'' رب نواز کے لہجے میں قہر تھا۔

''رب نواز میں اسے.....''

''چھوڑ دے اسے۔'' رب نواز نے پاگل ہوتے ہوئے کہا اور پوری قوت سے کلہاڑی سانول کے ماری۔سانول نے کافی مہارت سے کلہاڑی کو پکڑ لیا تو ان دونوں کی زور آزمائی ہونے لگی۔تبھی مہرو نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔لمحے کے ہزاروں حصے میں سانول کی توجہ مہرو کی طرف ہوئی،تبھی رب نواز نے کلہاڑی اس سے چھینی اور پھر زور سے اس کے سر پر ماردی۔سانول کی چیخ تک بلند نہ ہوئی۔وہ چکرا کر ریت پر گر گیا تو رب نواز نے جنونی انداز میں پے در پے وار کر دیئے۔مہرو نے چیختے ہوئے رب نواز کا ہاتھ روکا۔واہر کے سارے لوگ خاموش تماشائی کی طرح کھڑے دیکھتے رہے۔رب نواز نے ان سب کی طرف دیکھا اور مہرو کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔وہ چند قدم چلا گیا تو انہی میں سے کسی نے کہا۔

''ہمیں سانول کی لاش بستی میں لے جانی چاہیے۔''

سانول مر چکا تھا۔

☆☆☆

رات کے گہرے سناٹے میں علی کچے سے کمرے کے ایک قید خانے میں تھا۔اس کے قریب دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے،ایک بوڑھا سا شخص کونے میں لیٹا ہوا تھا۔وہ دونوں نوجوان کچھ دیر پہلے تک علی سے باتیں کرتے رہے تھے جبکہ بوڑھا شخص بے زار سا ان سے الگ تھلگ ہی پڑا رہا۔شاید وہ باتیں کر کے تھک چکے تھے،اس لئے اب خاموش تھے۔علی مسلسل پیر سیدن شاہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ان دونوں نوجوانوں نے اس کے متعلق بہت ساری باتیں بتائیں تھیں۔

پیر سیدن شاہ اس علاقے میں پیر ہی نہیں،ایک بڑا جاگیردار بھی تھا۔چولستان میں چند

بستیوں کے علاوہ شہر کے قریب ترین علاقے تک اس کی عملداری تھی۔جبکہ مریدین کا سلسلہ بہاولپور شہر اور اس کے باہر بھی تھا۔پیری مریدی کے روحانی سلسلے سے ہٹ کر اس کا ایک سیاسی قد بھی تھا۔وہ ہمیشہ اس علاقے میں سے ممبر منتخب ہوتا آیا تھا۔یہ سارے سلسلے یونہی نہیں چل رہے تھے بلکہ اس کو چلانے کے لئے بہت سے افراد منظم تھے۔کسی بھی علاقے پر گرفت رکھنے کے لئے جہاں سیدھے سادھے اصولوں کو اپنایا جاتا ہے وہاں پر کچھ ایسے کام بھی کیے جاتے ہیں جو اخلاق اور قانون سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ان کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ایسے لوگ طاقت کی حکومت پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور صرف یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ پوری طرح عمل بھی کرتے ہیں۔پیر سیدن شاہ صحیح معنوں میں اس علاقے پر حکومت کرتا تھا۔چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ ہو یا بڑے سے بڑا مسئلہ اس کے علم میں لایا جاتا تھا اور وہ اسے اپنے انداز میں حل کرتا تھا۔علی نے وہاں پر قید ہونے کے بعد دو چار بندوں کو ہی پہرہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔جن میں صرف ایک کے پاس اسلحہ تھا۔باقی یونہی نہتے تھے۔اس بارے جب اس نے تجسس سے پوچھا تو ایک نوجوان نے کہا تھا۔

''کہاں جائیں گے بھاگ کر.....ہمیں یہیں رہنا ہے،یہ پھر پکڑ لیں گے،اور اگر ان کا دل کرے تو مار بھی دیں گے ہمیں،اس لئے ہم خود یہاں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں سمجھتے،سو اس لئے پہرے دار بھی نہیں ہوتے،یہ آج سے نہیں برسوں سے ایسا ہی چل رہا ہے۔''

علی کا ذہن اس طرف بالکل نہیں گیا کہ آخر یہ کیا ظلم ہے۔پیر سیدن شاہ نے جو اپنی نجی جیل بنائی ہوئی ہے۔یقیناً اس میں ظالموں سے زیادہ مظلوموں کی تعداد ہوتی ہوگی۔وہ تو مسلسل سوچ رہا تھا کہ پیر سیدن شاہ کی روحانیت کیا ہوگی.....؟ کیا یہ اعمال بھی روحانیت کا حصہ ہوتے ہیں؟ اسے چونکہ روحانیت وغیرہ کے بارے میں اتنی معلومات نہیں تھی اس لئے وہ اس بارے زیادہ سوچ ہی نہیں سکا اور نہ ہی خود کو مطمئن کرنے لئے کوئی حتمی فیصلہ کر سکا۔لہٰذا جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ سانول کے بارے میں سوچنے لگا۔نجانے وہ اور اس کی محبوبہ کہاں ہوں گے۔؟

انہی لمحوں میں کمرے سے باہر قدرے ہلچل سی ہوئی۔وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔چند لمحوں میں دو پہرے دار وہیں اندر آ گئے،ان کے پاس کھانا تھا جو ان قیدیوں کے سامنے رکھتے ہوئے خاموشی سے واپس جانے لگے تو انہی دونوجوانوں میں سے ایک نے پوچھا۔اس کے انداز میں طنز تھا۔

''آج روٹی بہت دیر سے لائے ہو کیا پیر سائیں کا لنگر پکانے والا بھاگ گیا ہے۔''

"چپ کراوئے بکواس نہ کر.....! خاموشی سے کھاؤ مرو.....! کہیں تمہیں مار ہی نہ کھانی پڑ جائے.....!" پہرے دار نے انتہائی غصے میں کہا تو علی کو بہت عجیب لگا۔اس نے بڑے تحمل سے کہا۔

"اس نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے یار جو تم اتنا غصہ کر رہے ہو۔"

"یہ تمہاری وجہ سے ہی دیر ہوئی ہے ساری۔" پہرے دار نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو علی حیرت زدہ رہ گیا۔اس لئے بولا.....!

"میری وجہ سے.......وہ کیسے؟"

"وہ تیرا یار سانول جو مہرو کو لے کر بھاگ گیا تھا،قتل ہو گیا ہے رب نواز کے ہاتھوں، اس کی لاش بستی میں پڑی ہے۔اس کو لے کر آئیں ہیں تو دیر ہو گئی ہے ہمیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو.....؟" علی نے بدحواس ہوتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔اب پتہ نہیں اسے دفنانا بھی ہمیں ہی پڑے گا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔کیسی باتیں کر رہے ہو؟" علی نے غصے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔تو پہرے دار نے عام سے انداز میں کہا۔

"بندہ ایسا کام ہی نہ کرے جو اس طرح لاش ہی پڑی رہے۔بستی کا کوئی بندہ ان کے ہاں نہیں گیا۔اس کی ماں اور بھائی وہیں بیٹھے لاش کے پاس بین کر رہے ہیں۔ظاہر ہے کسی کی غیرت......"

وہ نجانے اور کیا کچھ کہتا جا رہا تھا کہ علی کا دماغ ایک دم سے پاگل پن کی حد تک چلا گیا۔اس کا محسن یوں لاوارثوں کی مانند اپنے گھر میں بے جان پڑا ہے کہ کوئی اُسے۔دفنانے والا نہیں......؟ ٹھیک ہے اس نے جرم کیا لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ اسے جان سے ہی مار دیا جائے.......اور پھر اس پر ظلم یہ کہ اس کی لاش......؟ وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔کسی معمول کی مانند کمرے سے باہر جانے لگا تو پہرے دار نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اُوئے کدھر......؟"

"میرا راستہ نہیں روکنا،سمجھے تم؟" علی نے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو پہرے دار نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں.....! پیر سائیں کی اجازت کے بغیر تم نہیں جا سکتے۔"

"اور مجھے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔" علی نے غراتے ہوئے کہا اور قدم آگے بڑھا دیئے تو پہرے دار نے اس کے کالر سے پکڑ کر اسے واپس کھینچا۔اس پر علی نے پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا،تبھی دوسرا پہرے دار بھی اس پر پل پڑا۔نجانے علی میں جنون کہاں سے آ گیا تھا۔وہ اتنی شدت سے لڑا کہ چند لمحوں میں ہی ان پہرے داروں کو بے بس کر دیا اور اس کمرے سے باہر آ گیا۔وہ بھی اس کے پیچھے بھاگے۔اب علی کے سامنے کھلا میدان تھا۔اور اس کے پاس محض دو آپشن تھے،یا تو وہ بھاگتا اور ان کے ہاتھ نہ آتا،یا پھر سامنے پڑی چارپائی پہ گن کو اٹھا کر ان پہرے داروں کو وہیں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیتا۔اس نے لمحے میں فیصلہ کیا اور آگے بڑھ کر گن اٹھا لی۔اور ان کی طرف کر کے بولا۔

"تم لوگ مجھے مجبور مت کرو...... مجھے جانے دو،مجھے اپنے محسن کو دفن کرنا ہے۔" علی نے کچھ اس طرح سرد لہجے میں کہا کہ وہ دونوں پہرے دار وہیں رک گئے۔علی پلٹا اور وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔اسے اندھیرے میں یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ بستی کدھر ہے۔پھر بھی اندازے سے وہ ایک طرف منہ کر کے چل دیا۔جہاں اسے بستی میں پہنچ جانے کی جلدی تھی وہاں وہ بدحواس بھی ہو رہا تھا کہ وہ کبھی بستی میں پہنچ بھی پائے گا یا نہیں......؟ روہی کے اس ویرانے میں اسے اندھیرے میں کو راستہ بھی ملے گا یا نہیں......؟ وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا اور تیزی سے چلتا چلا گیا۔اس قید خانے سے کافی دور آ کر اسے احساس ہوا کہ گن تو اس نے یونہی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے،تب اسے قدرے آسرا ملا۔دل کو تسلی ہوئی اور جس رخ پر وہ جا رہا تھا اس طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

کچی بستی کے دوسرے گھروں کی طرح اماں فیضاں کا گھر بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔رات کے پچھلے پہر کی چاندنی اس اندھیرے کو دور کرنے میں ہلکان ہو رہی تھے۔لیکن اندھیرے کا راج یونہی تھا۔زرد چاندنی سے اتنا ضرور ہو رہا تھا کہ ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔اماں فیضاں کے گھر میں تو چراغ تک روشن نہیں تھا کہ اس کے بیٹے سانول کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا،ایسے میں تو اسے دیا جلانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔صحن کے درمیان چارپائی پر سانول کی نعش سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی جس پر خون کے دھبے سیاہ ہو چکے تھے۔اماں فیضاں کے پاس ہی اس کا چھوٹا بیٹا بھیرا بیٹھا ہوا تھا۔جسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ سانول ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گیا ہے۔لیکن جب وہ اپنی ماں کی حالت کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوتا کہ کچھ ایسا

ہو گیا ہے جس سے اس کی ماں کی زندگی اجڑ گئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ اماں فیضاں کے رونے کی آوازیں تھی کہ جیسے کوئی خنجر اس کے دل میں پیوست ہو گیا ہو اور اس کی اذیت سے نہ انسان مر رہا ہو اور نہ زندوں میں اس کا شمار ہو۔ ان سے ذرا فاصلے پر میاں جی سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یوں ساکت تھے جیسے ان کا دم نکل چکا ہو۔ کسی بت کی مانند ساکت و جامد......! سانول کی نعش کے پاس یہی تین افراد تھے۔ جبکہ رات تھی کہ گزر جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔

پچھلی رات اس آنگن میں عورتوں کے گیت گونج رہے تھے، ہر ہونٹ پر مسکراہٹ تھی، مستقبل کی باتیں، ہنسی مذاق اور نجانے کیا کچھ جس سے زندگی ٹپکتی تھی اور وہ رات بھیانک تھی، ایک ماں اپنے بیٹے کی لاش پر بیٹھی نوحہ کناں تھی اور بستی میں سے کوئی بھی ان کا گھر کا رخ نہیں کر رہا تھا۔ سانول کا اتنا بڑا جرم تھا کہ لوگ اس کی لاش کو دفن کرنے بھی نہیں آئے تھے، یہ کیا تھا سنگ دلی یا پھر خوف......؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک میاں جی نے آنکھیں کھول کر آسمان کی جانب دیکھا، صبح کا تارہ روشن ہو چکا تھا۔ میاں جی کے چہرے پر جو سکوت تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ چند لمحے میں ہی گزرے ہوں گے۔ علی ان کے گھر کے باہر آن کھڑا ہوا۔ میاں جی نے گھوم کر اس کے ہیولے کو دیکھا اور پھر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''آ جاؤ علی......! آ جاؤ...... آؤ تیرے دوست کے آخری سفر کا اہتمام کریں۔'' میاں جی کے یوں کہنے پر اماں فیضاں پر تو جیسے یہ بات بجلی بن کر گری۔ اس کے حلق سے دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ بلاشبہ یہ اس کے بس میں نہیں رہا تھا اس لئے وہ دل خراش انداز میں بین کرنے لگی۔ جس پر میاں جی نے اسے صبر کرنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ علی دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا صحن میں آ گیا تھا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ چادر اٹھا کر سانول کا آخری دیدار ہی کر لے۔ وہ چار پائی کے پائینتی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ تبھی میاں جی نے کہا۔

''علی......! شاید بستی میں سے کوئی نہیں آئے گا۔ اس لئے سانول کو دفنانے کے لئے جو کچھ بھی کرنا ہے، ہمیں ہی کرنا ہے۔'' اماں فیضاں کی کراہیں کچھ اور بڑھ گئیں تو علی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر میاں جی کی طرف منہ کر کے بولا۔

''فرمائیں میاں جی......! مجھے کیا کرنا ہے؟''

''میرے ساتھ چلو، ہمیں قبرستان جانا ہے، وہاں سانول کی آخری آرام گاہ تیار کرنی ہے، پھر واپس آ کے اسے لے جانے کی تیاری کرتے ہیں۔''

''چلیں......!'' علی نے کہا تو میاں جی اٹھ گئے۔ انہیں بستی سے قدرے فاصلے پر قبرستان جانا تھا۔

اس وقت سورج کی روشنی تیز ہو چکی تھی، جب علی اور میاں جی نے سانول کی میت کو غسل دے کر کفن پہنا دیا تھا۔ بے حس بستی میں سے کوئی شخص وہاں تک نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی کسی عورت کے دل میں سانول کے آخری دیدار کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ میت قبرستان لے جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔ اماں فیضاں مسلسل رو رہی تھی۔ تبھی میاں جی نے دھیرے سے کہا۔

''بہن فیضاں......! بہت رو لیا تم نے، اب ہمت کرو...... سانول کو اس کی آخری منزل تک لے کر جانا ہے۔ ہم تین تو ہیں، چوتھا کاندھا تمہیں دینا ہوگا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟''

میاں جی کے یوں کہنے پر اماں فیضاں تڑپ کر رہ گی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا سر ہلایا اور ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سانول کے چہرے کو دیکھا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس کا چہرہ ڈھک دیا۔ اماں نے ایک لمبی سانس لی اور پھر بڑی ہمت سے کہا۔

''**اشهدان لا اله الله واشهدان محمد رسول الله**......'' آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں اس نے پورے جذب سے یہ کلمہ پڑھا اور پھر میت کو دونوں ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

''کلمہ شہادت......!''

میاں جی، بھیرے اور علی نے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے میت کو اٹھایا اور گھر سے چل پڑے ابھی کچھ ہی فاصلے پر گئے تھے، ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ میت کو کاندھا دے سکتا۔ لمحہ لمحہ اس میں اور جنازے میں فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ اور پھر چار لوگوں کے کاندھے پر سوار میت بستی سے باہر آ گئی۔ انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تیزی سے قبرستان کی طرف رواں دواں رہے۔ یہاں تک کہ وہ تازہ تیار قبر کے پاس جا کر رک گئے۔ بڑی احتیاط سے انہوں نے میت کو زمین پر رکھا۔ تو میاں جی نے علی اور بھیرے سے پوچھا۔

"تم دونوں کے وضو ہیں نا......؟"

"جی ......! دونوں نے ایک زبان کہا۔ تبھی انہیں بستی کی طرف سے چند لوگ آتے ہوئے دکھائی دیے جو تیز تیز قدموں سے انہی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ علی کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے پریشانی آئی تو اس نے میاں جی کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اطمینان تھا۔ انہوں نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ جنازہ پڑھنے آئیں تو ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔"

جس وقت میاں جی نے سانول کا جنازہ پڑھانے کے لئے اللہ اکبر کہا تو صفیں باندھے چند لوگوں نے بھی نیت باندھ لی۔ ان میں وہ بوڑھا بھی تھا جو لاٹھی ٹیکتا ہوا پیچھے رہ گیا تھا۔ جنازہ پڑھنے کے بعد انہوں نے دعا کی، سانول کا آخری دیدار کیا اور پھر اسے سپردِ خاک کر دیا۔ علی کو یہ سب کچھ خواب کی مانند لگ رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت سورج نکل آیا تھا جب اماں فیضاں اور بھیرا دونوں ہی ریوڑ لے کر نکل رہے تھے۔ علی کب کا جاگ گیا تھا۔ وہ گوپے میں پڑا بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ اتنا کچھ کہ اسے اپنی زندگی بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ علی نے آوازوں سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اماں فیضاں اور بھیرا ریوڑ لے کر نکلے ہیں۔ اس لئے وہ تیزی سے اٹھا اور گوپے سے باہر آ گیا۔ اس کے سامنے بالکل وہ منظر تھا جو وہ سوچ چکا تھا۔ اماں اور بھیرا ریوڑ کو گھر سے نکال کر لے جا رہے تھے۔ وہ سیدھا اماں کے پاس چلا گیا۔ اور قریب جا کر بولا۔

"اماں......! آپ کہاں چلی ہیں......! میں ہوں نا ادھر......"

اس کے یوں کہنے پر اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"پتر......! ان بے چارے بے زبانوں کا کیا قصور ہے۔ جانے والا تو چلا گیا۔ میں انہیں بھوکا تو نہیں مار سکتی، ان کا خیال تو مجھے ہی رکھنا ہے نا۔"

"ٹھیک ہے اماں انہیں بھوکا نہیں رکھا جا سکتا، آپ گھر پر ہی رہیں، میں انہیں لے کر جاؤں گا۔"

علی نے کہا تو اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، چند لمحوں تک وہ مبہوت رہی پھر

حتمی لہجے میں بولی جس میں سمجھانے والا انداز زیادہ تھا۔

"نہیں پتر......! تم ایسا کب تک کرو گے، پھر یہ تیرے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی تو اس کام میں گزر گئی ہے۔ سانول جب چھوٹا تھا، اس وقت میں ہی......"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن میں جب تک یہاں ہوں، میرے ہوتے ہوئے تو آپ یہ سب نہیں کر سکتیں۔ آپ گھر بیٹھیں اور مجھے جانے دیں۔" علی نے بات کاٹ کر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو سانول کا زخم تازہ ہے، اس کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی۔ تم بھی سمجھتے ہو اور میں بھی سمجھتی ہوں۔ لیکن پھر بھی تجھے واپس تو جانا ہے۔" اماں نے اسے سمجھایا تو علی نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"پتہ نہیں......! میں اب جا بھی سکوں گا نہیں؟"

"نا میرا پتر......! شہر میں تیری ماں ہے، بہن بھائی ہیں، باپ ہے، وہ سب تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تو ان کے پاس جا...... ان پر نہ جانے کیا گزر رہی ہو گی۔ میری جو تھوڑی بہت زندگی ہے، میں اسے گزار لوں گی۔ میں بوڑھی ضرور ہوں، مگر میری ہمت ہے اتنی۔ تیرے سامنے تو ابھی زندگی پڑی ہے۔"

"اماں......! میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ لیکن شاید آپ وہ نہیں جانتی جو مجھ پر گزر رہی ہے۔" علی نے اپنے ہی خیالوں میں کھوئے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی چونکتے ہوئے بولا۔ "ایک شرط ہے......! آپ میرے ساتھ شہر چلیں، بھیرا بھی چلے، میرے ساتھ رہیں۔ تو میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں یہاں آپ کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا؟ کون خیال کرے گا آپ کا۔"

"اللہ سائیں ہے نا خیال کرنے والا......! وہی سب کا خیال رکھتا ہے۔ ساری زندگی یہیں گزر گئی ہے۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی، تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دے علی۔" اماں نے انتہائی دکھ سے کہا تو وہ چند لمحے اماں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں آپ کو اس بے حس بستی میں چھوڑ دوں......؟" وہ جواب کا منتظر تھا لیکن اماں نے بجائے کوئی لفظ کہنے کے اس کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ "میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ پاؤں گا اماں......! آپ بیٹھیں، میں ریوڑ لے جاتا ہوں۔"

"میں اب بھی یہی کہوں گی پتر......! چند دن لے جائے گا تو ریوڑ اس کے بعد......؟"

"میں نہیں جانے والا، میں ادھر ہی رہوں گا۔" علی نے انتہائی مضبوط لہجے میں کہا تو اماں نے دکھی انداز میں کہا۔

"تو ادھر رہنا بھی چاہے گا نا، تو رہ نہیں پائے گا۔ سیدن شاہ کے لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔ وہ بہت ظالم ہیں......"

"آپ گھبراؤ مت اماں......! جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ آپ جاؤ......" یہ کہہ کر اس نے اماں کے ہاتھ سے چھڑی پکڑ لی۔ پھر اونچی آواز میں بھیرے کی جانب منہ کر کے کہا، "چل بھیرے۔"

اماں وہیں کھڑی رہی اور وہ دونوں ریوڑ لے کر نکل گئے۔

علی اور بھیرا سارا دن ریوڑ چراتے رہے، دو دن سے بھوکے جانور جب کھلے میں آئے تو انہیں چرنے سے غرض تھی۔ بھوک کسی بھی ذی روح کو کس قدر مجبور کر دیتی ہے۔ علی سارا دن یہی سوچتا رہا۔ بھیرے نے اسے بہت ساری باتیں بتائیں تھیں۔ وہ سانول کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا لیکن جب اس نے بھیرے سے بہت کچھ سنا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کتنا اچھا، معصوم اور ہمدرد انسان تھا، اسے بستی کے لوگوں سے، ان کی بے حسی پر اس قدر گلہ تھا کہ اگر کوئی اس بارے بات کرتا تو شاید وہ پھٹ پڑتا۔ بھیرا ریوڑ کے پیچھے رہا اور وہ سارا دن سوچتا رہا۔ عصر کے بعد جب وہ ریوڑ لے کر واپس بستی کی طرف پلٹے تو اس وقت تک علی اپنے طور پر بہت کچھ سوچ چکا تھا، بہت ساری پریشان سوچوں کو وہ ایک نکتے پر لا چکا تھا۔ اب وہ میاں جی سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ ریوڑ کو باندھ کر جب وہ ہاتھ منہ دھو کے صحن میں آیا تو اماں چولہے کے پاس بیٹھی کھانا بنا رہی تھی۔ علی کو بڑا عجیب سا لگا۔ میت والے گھر میں، تین دن بھی نہیں ہوئے تھے اور انہیں چولہا جلانا پڑ گیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں چارپائی پر بیٹھا تو اماں نے کہا۔

"پتر علی......! یہاں میرے پاس آ کر کھانا کھا لو......! مجھے معلوم ہے تم دو دن سے بھوکے ہو۔"

"آپ نے کھا لیا......؟" علی نے پوچھا

"میں بھی کھاتی ہوں......! آؤ...... آ جاؤ میرے پاس۔" اماں نے کہا تو وہ چولہے کے پاس چلا گیا۔ تبھی بھیرا بھی آ گیا۔ اماں نے روٹیاں اور دودھ ان کے سامنے رکھ دیا۔ جسے بسم اللہ پڑھ کر انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد علی نے پوچھا۔

"اماں......! یہ میاں جی مسجد میں ہی ملیں گے نا۔"

"ہاں......! وہیں ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی گھر بار یا ٹھکانہ تو ہے نہیں، مسجد یا پھر جنڈ کے نیچے سارا دن گزار دیتے ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں نے ان سے ملنا ہے۔ میں ان کی طرف جا رہا ہوں؟" علی نے اٹھتے ہوئے کہا تو اماں خاموش رہی۔ وہ میاں جی سے ملنے کے لئے چل دیا۔

وہ جب بستی کی واحد کچی مسجد میں داخل ہوا تو میاں جی مصلّے پر بیٹھے ہوئے دروازے کی سمت ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے اور شاید کوئی وظیفہ کر رہے تھے۔ علی ان کے پاس جا بیٹھا۔ چند منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ میاں جی نے جلدی سے وہ وظیفہ ختم کیا اپنے آپ پر پھونکا اور علی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ علیک سلیک اور احوال کے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہاں بھئی علی......! کیسے آنا ہوا؟"

"میاں جی......! میں آپ سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری باتوں کا جواب دے پائیں گے۔ میرا مقصد کوئی علمی مباحثہ نہیں بلکہ اپنی حیرتوں کو ختم کرنا ہے۔" علی نے تذبذب سے کہا تو میاں جی مسکرا دیئے اور پھر نہایت شفقت سے بولے۔

"علی میاں......! جو مجھے معلوم ہوگا وہ بتا دوں گا، جو معلوم نہیں ہوگا تو اس سے معذرت کر لوں گا۔ میں کون سا عالم فاضل ہوں جو سارے سوالوں کا جواب دے پاؤں گا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ تم میرے جواب سے اپنی حیرتوں کو ختم کر پاؤ گے یا نہیں۔"

انہوں نے کہا تو علی چند لمحوں تک سوچتا رہا جیسے یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ وہ کوئی بات کرے یا نہ کرے۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

"میاں جی......! جب مجھے معلوم ہوا کہ سانول کو قتل کر دیا ہے تو میں نے اسی لمحے سیدن شاہ کے قید خانے سے فرار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ لاشعوری تھا۔ اور پھر جب پتہ چلا کہ اس کی لاش یونہی پڑی ہے، بستی کا کوئی شخص نہیں آیا تو نجانے ایسی کون سی طاقت تھی جس نے مجھے وہاں سے بھاگ آنے کے لئے مجبور کر دیا۔" علی نے کہا اور ایک لمحے کے لئے رک گیا کہ جیسے آگے وہ کوئی بہت اہم بات کہنا چاہتا ہو۔ میاں جی خاموش رہے تو وہ بولا "میں وہاں سے نکل تو آیا لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ بستی کس سمت میں ہے۔ میں وہاں تک پہنچ بھی پاؤں گا یا

نہیں۔ میرے دل میں یہ پختہ ارادہ تھا کہ میں بستی تک ضرور پہنچوں گا اور اپنے محسن کی خود جا کر آخری رسومات میں شریک ہوں گا۔ میں جب کھلے صحرا میں آیا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور جانا کدھر ہے۔ تب اچانک میرے سامنے ایک بزرگ سا آدمی آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ یہ کوئی غیبی مدد ہے۔

''کیسے پتہ چلا تمہیں......؟'' میاں جی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ ایک ہیولا تھا، اگرچہ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن میں اس کے پار بھی دیکھ سکتا تھا۔'' علی نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا پھر......؟'' میاں جی نے کہا۔

''پھر کیا ہونا تھا، اس نے کوئی ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں چل دیا اور پھر چلتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں بستی میں آ پہنچا۔ سیدن شاہ کی حویلی، اس کا قید خانہ اور یہ کچی بستی......! آپس میں خاصا فاصلہ رکھتے ہیں۔''

علی کی یہ بات سن کر میاں جی نے چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر بڑے سنجیدہ انداز میں بولے۔ ''علی کیا تمہیں احساس ہو گیا تھا کہ کوئی تمہاری رہنمائی کرنا چاہتا ہے؟''

''جی بالکل......! اسی لئے تو میں اس کے پیچھے چل دیا، میں نے اس پر یقین کر لیا تھا اور ان سے چھینی ہوئی گن بھی وہیں پھینک دی تھی۔'' علی نے قدر مضبوط لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے وہ راہنمائی غلط بھی ہوتی، مطلب کوئی شیطانی قوت تمہیں اپنے ساتھ......'' میاں جی کہتے کہتے رک گئے تو علی کے چہرے پر ایک دم سے رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ الجھتے ہوئے بولا۔

''میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا۔ میرے ذہن میں تو بس سانول تھا۔'' علی نے صاف انداز میں کہا تو میاں جی مسکرا دیئے۔

''علی......! ایک نکتے کی بات سمجھ لو......! انسان کی حیثیت اور اہمیت بہت اعلیٰ و ارفع ہے......! اور یہ انسان ہی ہے جو اپنی حیثیت اور اہمیت کو خود گھٹاتا بھی ہے اور بڑھاتا بھی ہے۔ لیکن جس کی روح پاکیزہ ہوتی ہے شیطانی قوتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔''

''میں نے یہ بات تو سمجھ لی میاں جی، لیکن وہ کیا راز تھا......؟''

''راز......!'' میاں جی نے دھیرے سے کہا۔ ''علی......! اس کائنات اور دیگر جہانوں

میں کوئی راز، راز نہیں ہے۔ کیونکہ راز فقط اللہ کی ذات ہے۔ باقی ساری چیزیں اوجھل ہیں۔ انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔''

''میاں جی......! کیا آپ مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے یا......'' علی نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا تو میاں جی مسکرا دیئے۔ اور پیار سے بولے۔

''علی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، انہیں اگر واضح کر دی جائیں تو نئی راہیں سامنے آ جاتی ہیں۔ بندہ خود کو ایک نئی دنیا میں پاتا ہے۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے کی بات نہیں۔ لیکن تم نوجوان ہو۔ تمہاری دلچسپیاں، تمہارے خواب اور بہت کچھ، یہاں صحرا میں نہیں ہیں۔ شہر کی گہما گہمی میں ہے۔ میں نے اگر تمہیں کوئی بھی راہ دکھا دی تو ممکن ہے تم بھی میری طرح صحرا نشین ہو جاؤ۔''

''میاں جی......! آپ کی باتوں نے تو میری الجھنیں مزید بڑھا دی ہیں......میں......'' علی نے تذبذب میں کچھ کہنا چاہا تو اچانک چونکتے ہوئے حیرت سے میاں جی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر دھیرے سے کہا۔

''میاں جی......! آپ......کیا آپ نے مجھے اس قید خانے بلوایا تھا۔ میری رہنمائی آپ نے......''

''ہاں بیٹا......! سانول کی میت کو کاندھا دینے والا چوتھا فرد نہیں تھا۔ اس لئے مجھے تمہیں بلانا پڑا......تم سمجھدار ہو......! اس لئے تمہیں اب معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔''

''ہاں میاں جی......! رہنمائی کا سلسلہ تو آپ شروع کر چکے ہیں اب مزید......'' علی نے جھجکتے ہوئے کہا تو میاں جی نے کہا۔

''حکم تو آ گیا ہے۔ لیکن مرضی تمہاری ہو گی۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میں تمہیں دوں گا، لیکن صبر، ظرف اور ادب کی ضرورت ہے۔''

''آپ مجھے استقامت پر پائیں گے......'' علی نے فوراً کہا تو میاں جی کے چہرے پر ذمہ داری کے چراغ جل اٹھے......!

''جاؤ......! ابھی فیصلہ کرو......! ابھی وقت ہے کہ دنیا میں جا سکو......اور یہی وقت ہے کہ جب عشق کے مقتل میں خود کو قربان کر دو......! فوری فیصلہ نہ کرنا۔ یہی میری نصیحت ہے۔''

علی کافی دیر تک ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ میاں جی کے چہرے پر ایک خاص قسم کا احساس اتر آیا ہے۔ ایسا احساس کہ جس کو دیکھتے رہنے سے بھی جی نہ

بھرے۔ کافی وقت یونہی گزر گیا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میاں جی نے کہا ''اب جاؤ......! جا کر آرام کرو صبح پھر جانا ہے تمہیں۔''

یہ سنتے ہی علی پر سے جیسے سحر ٹوٹ گیا۔ وہ چونکا اور دھیرے سے سلام کہتے ہوئے ہاتھ ملایا اور پھر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر بھی گزر چکا تھا اور صبح کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ لیکن فرزانہ خاں کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یوں جیسے نیند اس کی آنکھوں کے لئے اجنبی ہو چکی ہو۔ اس کی بے چینی اپنے عروج پر تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رات کٹے اور وہ علی تک پہنچ جائے۔ اسے نہ صرف یہ معلوم ہو چکا تھا کہ علی زندہ ہے بلکہ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ روہی میں کہیں ہے۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس کے باپ امین خاں کو تھا یا پھر امین خاں کے دست راست اللہ بخش کو۔ وہ کبھی روہی میں نہیں گئی تھی۔ شاید اسے یہ بات معلوم نہ ہوتی لیکن اتفاق سے وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی جب اللہ بخش اس کے باپ سے ملنے کے لئے آ گیا۔ اللہ بخش وہ واحد ملازم تھا جو ان کے ہاں زنانے تک میں چلا جاتا تھا ورنہ کسی کو جرأت نہیں تھی کہ گھر کے اندر قدم رکھ سکے۔ وہ ان کے وفادار ملازمین میں سے ایک تھا۔ اللہ بخش کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس لئے امین خاں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا اللہ بخش......؟''

''جی سائیں خیریت ہی ہے۔'' اس نے ممنونیت سے کہا تو امین خاں بولا۔

''تو پھر بات کیا ہے؟''

''سائیں......! روہی سے خان محمد کا ایک بندہ خبر لے کر آیا ہے۔'' اللہ بخش نے رازدارانہ انداز میں کہا جیسے بہت اہم خبر ہو۔

''بولو......! کیا خبر ہے۔'' امین خاں نے تجسس سے پوچھا۔

''روہی میں لالہ بھوہڑ کے نام سے ایک ٹوبہ ہے۔ کچی بستی ہے وہاں پر۔ وہاں ایک لڑکے سانول کا قتل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ہی خاندان کی لڑکی کو اغواء کیا تھا کہ لڑکی کے بھائی نے اسے قتل کر دیا ہے۔''

''اس میں اہم بات کیا ہے؟'' امین خاں نے پوچھا۔

''قاتل رب نواز اس وقت پیر سیدن شاہ کی تحویل میں ہے۔ پیر سیدن شاہ کے ڈر سے بستی کے لوگوں نے سانول کا جنازہ بھی نہیں پڑھا، اسے دفنانے بھی چند لوگ ہی گئے۔''

''یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے، پیر سیدن شاہ نے ایسے نجانے کتنے قتل کروائے ہیں۔ جن کے بارے کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔'' امین خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سائیں اس سارے پس منظر میں اہم بات یہ ہے کہ مقتول کے گھر میں ایک اجنبی لڑکا موجود ہے، جس نے نہ صرف سانول کی آخری رسومات ادا کی ہیں بلکہ اب وہ اس کی جگہ اس کا ریوڑ چرا رہا ہے۔ میں نے اپنی حد تک تسلی کی ہے، مجھے وہ فرزانہ بی بی کا کلاس فیلو علی ہی لگتا ہے۔''

اللہ بخش نے کہا تو سردار امین خان چونکا، وہاں فرزانہ کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ اس پر جو جیسے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ فوراً ہی بہت کچھ پوچھ لینا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ ہونقوں کی مانند اللہ بخش کی طرف دیکھے چلے جا رہی تھی۔

''اللہ بخش تجھے کیسے یقین ہے کہ وہ علی ہو سکتا ہے۔''

''سائیں اس نے نام بتایا ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ سانول کو وہ چند دن پہلے زخمی حالت میں ملا تھا، اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ پیر سیدن شاہ نے اس کو اپنے قید خانے میں رکھا لیکن وہ لڑکا علی اس کے قید خانے سے فرار ہو گیا۔''

''او......! تو اس کا مطلب ہے......'' یہ کہتے ہوئے امین خاں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''وہ اسے مروا دے گا۔ اس بے وقوف کو تو وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اسے نہیں معلوم کہ پیر سیدن شاہ کتنا ظالم انسان ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سوچنے والے انداز میں اضطراری حالت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتے ہوئے بولا۔ ''کہانی واقع ہی کچھ اور لگتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اللہ بخش۔''

''سائیں......! بہت ہی الجھی ہوئی بات ہے۔ اس کا سرا پتہ اسی وقت چلے گا جب علی ملے گا۔''

''تو پھر فوراً ڈی ایس پی سے کہو کہ وہ وہاں جائے اور پتہ کرے، اسے کہنا کہ میں نے کہا ہے۔'' امین خاں نے تیزی سے کہا پھر اچانک ہاتھ کے اشارے سے اللہ بخش کو روکتے ہوئے بولے تحمل سے کہا۔ ''نہیں......! ڈی ایس پی ضرور جائے لیکن سیدھا پیر سیدن شاہ کے پاس اس سے علی کے بارے میں پوچھے۔ وہ کوئی نہ کوئی تو جواب دے گا۔ مگر اسے یہ یقین ہو جائے گا کہ

بات ہم تک پہنچ چکی ہے۔ اللہ بخش......! اگر یہ کوئی کھیل ہے نا تو ہم بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ کیا سمجھے ہو۔"

"سمجھ گیا سائیں......! میں ابھی خود ڈی ایس پی کے پاس جاتا ہوں تا کہ اسے اچھی طرح سمجھا آؤں۔"

"ہاں ایسے ہی کرنا۔" امین خان نے کہا تو اس وقت تک فرزانہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس لئے دھیرے سے کہا۔

"بابا سائیں......! آپ کے کھیل میں کہیں علی کا نقصان نہ ہو جائے۔ اس کے والدین بہت پریشان ہیں۔"

"کسی کا بھی نقصان ہو، ہمیں اس سے غرض نہیں، دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہمارا کتنا فائدہ ہے۔ اس کے والدین پریشان ہیں تو ہمیں کیا۔ ہم نے تو انہیں پریشان نہیں کیا۔" امین خان نے یوں کہا کہ جیسے وہ جواب تو فرزانہ کو دے رہا ہو مگر اپنے تئیں کچھ اور بھی سوچ رہا ہو۔ اپنے باپ کے خیالات سن کر وہ ایک لمحے کے لئے تو جیسے کانپ کر رہ گئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس کا باپ اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ بخش جا چکا تھا۔ فرزانہ کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ اپنے باپ سے کوئی مزید یہ سوال کر سکے۔ اس لئے وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کا دل بے تحاشا رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس لئے وہ خوب دل بھر کے روئی تھی۔ وہ خود کو علی کا گنہگار سمجھ رہی تھی۔ اس پر اپنے باپ کے خود غرضانہ خیال سن کر تو جیسے زخموں پر نمک چھڑک دیا گیا ہو۔ وہ جی بھر کے رو چکی تو علی کی زندگی کے لئے دعائیں کرنے لگی تھی۔ رات بھر وہ بے چین رہی تھی۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان ہو گئی۔ اس نے بہت مشکل سے خود کو بستر سے الگ کیا اور بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر ابھی سناٹا تھا۔ نیلگوں روشنی کے آثار واضح ہونے لگے تو اسے اچانک خیال آیا۔ وہ جلدی سے واپس اپنے بیڈ تک گئی، وہاں سے فون اٹھایا اور عامر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ کافی دیر تک بیل جانے کے بعد اس کی خمار آلود آواز ابھری۔

"کیا بات ہے کوئی طوفان آ گیا ہے، ابھی تو سویا تھا۔" عامر کے لہجے میں شدید جھنجلاہٹ تھی۔

"عامر......! یہ میں ہوں فرزانہ......!" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں تو بولو، کیا آسمان ٹوٹ پڑا ہے؟" اس نے پہچان کر قدرے سکون سے کہا لیکن

اکتاہٹ اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔

"سنو......! علی کو واپس لے آؤ، میں تمہیں دوگنا......"

"تم بھی کمال کرتی ہو۔ مجھے تو تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ کبھی چھوڑ آؤ، کبھی لے آؤ، یہ کیا مذاق ہے۔"

"جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو......! معاوضہ دوگنا......"

"یہ کام اب میرے لئے بہت مشکل ہے۔ وہ ہمیں پہچان چکا ہے، یہ کام میں نہیں کروں گا۔"

"کچھ بھی کرو......! اسے لے کر آؤ......!" فرزانہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"سوری......! میں اسے لا تو نہیں سکتا، ہاں اگر تم اتنا ہی معاوضہ دو تو اسے وہاں جا کر اوپر پہنچا دیتا ہوں۔ قصہ ختم، نہ کوئی جان نہ پہچان۔" عامر نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، میری بات سنو......! میں......" فرزانہ کی بات ادھوری رہ گئی اور فون کال بند ہو گئی۔ اس نے انتہائی غصے میں فون کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ کال ملائی۔ دوسری طرف فون بند تھا۔ وہ پیر پٹختی ہوئی واپس اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

☆☆☆

کچے کمرے کے اندر چارپائی پر بیٹھی ہوئی مہرو مسلسل رو رہی تھی۔ اسے یہ سب بھیانک خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ اس نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سانول اس کے عشق و محبت کے سحر میں گرفتار ہوگا۔ اور اتنی شدت سے ہوگا کہ اپنا آپ ختم کرنے میں اس نے ذرا سا بھی نہ سوچا۔ وہ یہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ سانول کی دماغی حالت پر کوئی شک ہوگا۔ وہ سادہ اور معصوم تھا مگر اس میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اپنا اچھا اور برا سمجھ سکے، کیا اسے اپنے آپ پر اختیار ہی نہیں رہا؟ یہی وہ سوال تھا جس نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے آنکھیں چرا رہی تھی کہ سانول اس سے محبت کرتا ہے، کس قدر کرتا ہے، اس شدت کی عینی شاہد تھی۔ خان محمد کے ڈیرے پر وہ دونوں تنہا تھے، وہ اس کی دسترس میں تھی۔ اگر وہ فقط اس کے جسم کا طلب گار ہوتا تو جو چاہے کر سکتا تھا۔ لیکن سارا وقت وہ اسے مناتے ہوئے، اس کی منتیں کرتا رہا۔ اس کے لئے سارے زمانے سے لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اسی نے اس کی ایک بھی نہ مانی اور وہ چراغ بھڑک کر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا تھا۔

مہرو لاشعوری طور پر سانول کے عشق کو مان چکی تھی۔ مگر اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہوا اور پھر اس نے کبھی اظہار بھی نہیں کیا؟ ایسا اس نے کیوں کیا؟ اسے اگر ذرا سا بھی احساس ہوتا کہ سانول سے اس کی معصوم شرارتوں کا نتیجہ اتنا بھیانک ہوگا تو وہ کبھی اس کے پاس بھی نہ پھٹکتی۔ خان محمد کے ڈیرے پر اس نے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ جنہیں وہ خود سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ اسے تو بس اپنی اور اپنے خاندان والوں کی عزت کا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اور ایسا ہو گیا تھا۔ اسے ذرا ذرا یاد آ رہا تھا کہ سانول نے اس نے اظہار کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر جتنا سوچتی اسے سانول بے قصور دکھائی دیتا لیکن پھر وہ وہیں پر آ کر رک جاتی کہ اتنا سب کچھ اگر اس نے برداشت کیا۔ اپنے آپ کو روکے رکھا تو پھر یہ کیا تھا؟ یہی الجھن اسے منتشر کر کے رکھ دیتی۔

اصل میں ہر معاشرے میں بسنے والے انسانوں نے اپنے لئے کچھ ضابطے اور اصول وضع کیے تا کہ وہ ایک خوشگوار ماحول میں اپنی زندگی بسر کرتے چلے جائیں۔ ایسا وہ اپنی بہتر زندگی اور ترقی کے لئے کرتے ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ معاشرے میں کچھ انسان ان اصول اور ضابطوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور کچھ کو یہ اصول اور ضابطے اچھے ہی نہیں لگتے۔ وہ انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ یہیں سے الجھن اور کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ یہی الجھن اور کشمکش ضابطوں اور اصولوں کو بہتر سے بہتر بناتے رہنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں یا پھر ان ضابطے اور اصولوں کو متروک قرار دے کر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہی کسی انسانی معاشرے میں زندگی کا احساس ہوتے ہیں۔ اور ایسے معاشرے ہی ترقی کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔ لیکن......! کچھ معاشرے اپنے ہی وضع کردہ اصولوں اور ضابطوں کو اس طرح سینے سے لگا کے جنون کی شاہراہ پر چلتے رہتے ہیں کہ انہیں تبدیل کرنے یا ان پر نظر ثانی کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ نسل در نسل یہ اصول و ضابطے، روایات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب پھر یہ روایات جب طاقتوروں کے ہاتھ میں آتی ہیں تو وہ اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ انسانی زندگی سے زیادہ ان روایات کا احترام کیا جائے تو وہ معاشرے ترقی کی بجائے وہیں کھڑے رہ جاتے ہیں اور وقت بہت آگے نکل جاتا ہے۔ ایسے میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت رہتی ہے اور نہ کوئی وقت۔ روایات کی پاسداری کے لئے انسانی خون تک بہا دیا جاتا ہے۔

سانول اور مہرو کی زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ جس ماحول اور معاشرے سے تعلق

رکھتے تھے اس میں وٹہ سٹہ ایک ایسی روایت تھی جس پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ اگرچہ کسی دور میں یہ اصول انسانی بہتری کے لئے بنایا گیا ہوگا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ۔ یہ اصول جب روایت کی حیثیت اختیار کر گیا تو اس میں انسانی زندگی کی اہمیت کم ہو گئی۔ سانول کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس کی شادی کے لئے وٹہ سٹہ کی روایت آڑے تھی۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو ہی دلہن بنا سکتا تھا جس کا کوئی بھائی نہ ہو۔ سانول کی ماں، اماں فیضاں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس گھر میں جھانک ہی نہیں سکتی جہاں کہیں کسی لڑکی کا بھائی ہو۔ اس نے جب اپنے بیٹے کو بتایا کہ اس کا رشتہ اس نے شماں سے کر دیا ہے۔ تو وہ بہت تڑپا۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ تو لڑکپن سے مہرو کو چاہتا ہے۔ تب ماں نے اسے مجبوری سمجھائی اور اسے بتایا کہ وہ شماں سے اس کی شادی طے کر چکی ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ وہ ماں کی ممتا کے سامنے تو خاموش ہو گیا لیکن اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ پر قابو نہ پا سکا۔ وہ آگ لمحہ لمحہ بھڑکتی رہی۔ مہرو سے جدائی کا تصور سانول کے اندر ایک زخم کی صورت بن گیا۔ جو دن بہ دن بڑھتا گیا اور اس کے ہونٹوں پر مستقل ہی رہنے لگا۔

عشق اولڑی پیڑ دو
لوکاں خبر نہ کائی

وہ آتش عشق میں جل گیا اور مہرو کو سوچنے پر مجبور کر گیا کہ آخر یہ آتش عشق ہوتی کیا ہے؟

مہرو مسلسل سوچتی چلی جا رہی تھی۔ سانول کی آتش عشق نے اس کا سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا۔ سانول نے جب اسے اونٹ پر زبردستی بٹھایا، اس سے ایک لمحہ پہلے تک اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔ بلاشبہ وہ بے قصور تھی لیکن عورت تھی نا، اس لئے اس کا قصور یہ بن گیا کہ وہ ایک رات تنہا سانول کے ساتھ رہی ہے۔ شک کے ناگ نے ہر کسی کو ڈس لیا اور وہ اس زہر سے بچ نہ سکے۔ مہرو کی جہاں منگنی ہوئی تھی، وہ لوگ آئے اور انہوں نے کسی فرد جرم کی طرح یہ فیصلہ سنا دیا کہ مہرو سے منگنی ختم کرتے ہیں۔ انہوں نے صفائی تک کا موقع نہیں دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا قصور شاید کم ہو لیکن وہ اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کر سکتے تھے۔ رب نواز نے ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کر دیا تھا۔ اس نے سانول کا قتل کیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا ہے۔ پھر ان کی بیٹی کا مستقبل کیا ہوگا، شاید یہی خوف تھا جس نے یہ منگنی توڑنے پر انہیں مجبور کیا۔ مہرو پوری بستی کی نگاہوں میں آ چکی تھی۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود وہ قصوروار گردان دی گئی تھی۔

رب نواز غائب تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔ نگران کے گھر والوں کو پتہ تھا کہ وہ پیر سیدن شاہ کی پناہ میں ہے۔ اور وہ محفوظ ہے پولیس وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ یہ احساس بستی والوں کو بھی تھا کہ رب نواز جہاں بھی ہے، اس پر پیر سیدن شاہ کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اسی کی ایماء پر سانول کے پیچھے واہر گئی تھی اور اس واہر میں اس کے بندے تھے۔ سانول کے قتل کے عینی شاہد بھی انہی میں سے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سانول کی میت کو دفنانے بستی میں سے کوئی نہیں گیا تھا۔ ان سب کو پیر سیدن شاہ کے عتاب کا خوف تھا۔ اس لئے سب کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ وہ سب جانتے تھے لیکن ظاہر یہی کر رہے تھے کہ انہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ لیکن......! ایک شخص سب کو کھٹک رہا تھا اور وہ تھا علی......! انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ وہاں پر کیوں ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور اب تک واپس کیوں نہیں چلا گیا......؟ انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ محض چند دنوں کا ساتھ اتنی گہری دوستی میں کیسے تبدیل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر روہی کو مسکن بنا لے......؟ اگر وہ سانول کا اتنا ہی گہرا دوست ہے تو پھر وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ خود کچھ نہ کر سکا تو پولیس کو ضرور یہاں لائے گا۔ اس خیال کے ساتھ ایک اور شک بھی ان لوگوں میں گردش کر رہا تھا۔ ممکن ہے علی کی حوصلہ افزائی پر ہی سانول نے مہرو کو اغواء کیا ہو۔ ورنہ پہلے کبھی اس کی ہمت نہیں پڑی؟ اس سارے واقعہ کا اصل محرک علی ہی ہے۔

مہرو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اور سن بھی رہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اسے علی کے بارے میں یہ باتیں ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ علی ایسا ہو سکتا ہے یا پھر علی کی حوصلہ افزائی سے سانول کو ہمت ہوئی تھی۔ اس نے علی کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا تھا۔ اسے تو علی کا چہرہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ مگر حقائق یہی ثابت کر رہے تھے کہ اک وہی ہے جو سانول کا بدلہ لے سکتا ہے، چاہے خود لے یا پھر وہ اماں فیضاں کی مدد کرے۔ ورنہ وہ یونہی تو نہیں پڑا اس گھر میں۔ سارا دن ریوڑ چرانے کے بعد اسے تو ہوش نہیں رہتا ہو گا۔ مگر سننے والوں سے اس نے سنا تھا کہ وہ راتوں کو بھی جاگتا ہے اور کئی بار اسے علی الصبح سانول کی قبر پر بھی دیکھا گیا ہے۔ علی کے بارے میں یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن اس واقعے کے بعد مہرو کی زندگی بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیا کرتی تھی آج گلیوں کے تنکے سے بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ اس کے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بھی اس کی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ آئندہ آنے والوں دنوں میں قسمت اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے، اسے قطعاً احساس نہیں تھا۔

☆☆☆

مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ میاں جی امامت کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ چند نمازی بھی ان کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ عین اس وقت جب میاں جی نے تکبیر کہی، علی مسجد میں داخل ہوا۔ وہ بھی صف میں شامل ہوا اور نیت باندھ لی۔ فرض نماز کی ادائیگی کے بعد میاں جی نے ایک نگاہ علی پر ڈالی اور پھر باقی نماز پڑھنے لگے۔ علی نے بھی سنت اور نفل کی ادائیگی کی اور سکون سے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد تک نمازی چلے گئے تو میاں جی نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے تم نے یہ پہلی نماز اس مسجد میں ادا کی ہے۔''

''جی، ایسا ہی ہے۔'' علی نے دھیرے سے کہا اور ان کے چہرے کی طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میاں جی خاموش رہے تو وہ بولا۔ ''آج گھر سے اسی نیت کے ساتھ نکلا تھا کہ نماز مسجد میں ہی پڑھوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میاں جی نے کہا اور پھر خاموش ہو گئے۔ ان کی یہ خاموشی قدرے طویل تھی۔ علی بھی چپ رہا جیسے وہ ان کی طرف سے بات کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر وہ گویا ہوئے۔

''علی......! خواجہ سائیں نے اپنی ایک کافی میں کہا ہے کہ روہی رنگ رنگیلڑی جہیڑی یار ملاوے۔ مطلب......! یہ رنگوں بھری روہی ایسی ہے جو یار ملا دیتی ہے۔ کیا تمہیں ایسا لگتا ہے؟''

''جی میاں جی......! ایسا ممکن ہے لیکن یار تو اسے ہی ملتا ہے نا جس کے پاس ایسی نگاہ ہو جو اس ویران اور بدرنگ روہی کو دیکھے تو یہ رنگوں بھری معلوم ہو۔'' علی نے دھیرے سے کہا۔

پچھلے چند دنوں سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ علی مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد میاں جی کے پاس آ جاتا اور پھر دونوں مسجد کے پرسکون ماحول میں بیٹھ کر ایسی ہی باتیں کرتے۔ علی کو ان باتوں میں بہت لطف اور سکون ملنے لگا تھا۔ اس لئے وہ سارا دن انہی باتوں کو سوچتا اور پھر شام ڈھلتے ہی میاں جی کے پاس جانے کے لئے بے قرار ہو جاتا۔ پہلے وہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن اس شام جب میاں جی نے اسے نمازیوں کی صف میں دیکھا تو ان کے چہرے پر خوشگواریت پھیل گئی تھی۔ پھر آج جب انہوں نے بات چھیڑی تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ علی کا خواب سن کر میاں جی نے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

''ہاں میاں......! بات تو کچھ ایسے ہی ہے لیکن تم اپنی نگاہ کو بلند کیوں نہیں کرتے ہو۔ اس پوری دنیا پر نظر ڈالو اور دیکھو کیا یہ روہی کی مانند ہے......؟ میں اسی تناظر میں تمہیں ایک بات

سمجھا رہا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، ویرانے میں بیٹھ جانے سے بات نہیں بنتی اور تیرے
جیسا نوجوان، جو نہ بھی چاہے لیکن دنیا اس کی جانب کھنچی چلی آئے۔ اس کے لئے مزید مشکل ہو
جائے گا۔ میں تمہیں روہی کے رنگ تلاش کرنے سے منع نہیں کرتا، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم رنگ
تلاش کرو، انہیں دیکھو، قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہو......! ایسے میں یار سے ملو تو اس کی
بہار ہی کچھ اور ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" علی نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔
"اس میں نہ سمجھنے والی بات تو کوئی نہیں ہے، ہاں اگر تفصیل جاننا چاہتے ہو تو الگ بات
ہے۔" میاں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس پر علی خاموش رہا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔ وہ چاہ رہا
تھا کہ میاں جی مزید بات کریں۔ تب وہ بولے۔ "دیکھو......! نبی آخرالزماں ﷺ نے ہمیشہ یہ دعا
مانگی کہ میری دنیا اور آخرت دونوں اچھی ہو جائیں۔ سو ہمیں بھی نہ صرف اپنی آخرت اچھی بنانی
ہے بلکہ دنیا بھی۔ ہم ایک قوم ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اپنی بقا بھی
چاہیے اور دوسروں کا تحفظ بھی کرنا ہے۔ اس لئے اس دنیا کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے پرامن
بنانا۔ دنیا بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان کے وسائل پر قابض ہو جائیں۔ دوسروں کا حق
چھین کر یا ایسی غلیظ قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہو جائیں۔ بلکہ اللہ کی زمین پر، اللہ کے حکم سے نیک
اعمال کے ساتھ اپنی آخرت سنوار لیں۔"

"لیکن یار ملنے کی بات پھر وہیں رہ گئی۔" علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"کون کہتا ہے کہ یار نہیں ملتا...... یار تو ہمارے پاس ہے، ہمیں دیکھ رہا ہے، ہماری
نیتوں سے واقف ہے۔ لیکن یہ ہم ہیں کہ اس کی طرف نہیں بڑھتے۔ یار ملنے کے بے تحاشا راستے
ہیں۔ مگر سب سے بہترین راستہ خلق خدا سے ہو کر جاتا ہے۔ یہی سب سے افضل ہے۔"
"مطلب......! میں جو اماں کی خدمت کر رہا ہوں، کیا یہ خدمت خلق کے زمرے میں
نہیں آتا؟" علی نے تیزی سے پوچھا۔
"بے شک......! مگر اس سے بھی پہلے تمہاری اپنی ماں موجود ہے، کیا تم اس کے فرائض
سے پہلوتہی کرو گے؟"
"میاں جی......! یہ مجبور ہیں، لیکن میری والدہ مجبور نہیں۔ اس کے پاس دوسرے ہیں
جو ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں اور پھر اماں فیضاں کا تو بیٹا اس دنیا میں نہیں، اس کا زخم بھی تازہ

ہے۔ اس وقت اور ان حالات میں...... انہیں میں کیسے چھوڑ کے جا سکتا ہوں۔" علی نے سمجھنے
والے انداز میں کہا۔

"تمہارا جذبہ قابل قدر ہے علی...... تمہارا یہ عمل بھی احسن ہے۔ یہی خدمت خلق ہے کہ خونی رشتہ نہ ہونے، کسی لالچ اور طمع کے نہ ہونے کے باوجود آپ کسی کے لئے کچھ کریں۔ یہ تمہاری مرضی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اس فیصلے میں ضمیر کی آواز بھی شامل ہے۔ خیر......! تم جو چاہو کرو......! لیکن کچھ فیصلے کہیں اور ہو چکے ہوتے ہیں۔ جنہیں بہر حال ماننا پڑتا ہے۔" میاں جی نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔ تو علی نے تذبذب بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسے فیصلے میاں جی......؟"

علی کے یوں کہنے پر میاں جی خاموش رہے اور پھر بات اس انداز سے شروع کی جیسے وہ علی کے سوال سے پہلوتہی کر رہے ہوں۔

"دیکھو......! اللہ رب العزت نے انسان کو فکر و شعور کی اس معراج سے نوازا ہے جو شاید دیگر مخلوق میں سے کسی کو میسر نہیں۔ ہمیں نہ صرف اس معراج کی قدر کرنا چاہیے بلکہ جس فکر و شعور کی وجہ سے ہمیں یہ مقام نصیب ہوا ہے اس کی بھی قدر افزائی ہمارا فرض ہے۔ یہ کیسے ہو گا......؟" یہ کہہ کر وہ ایک لحہ کے لئے رکے اور پھر کہتے چلے گئے۔ "اصل میں فکر و شعور ہی وہ بنیادی بات ہے جس سے انسان اپنے عمل کا راہیں متعین کرتا ہے۔ فکر و شعور سے عمل تک کے درمیان میں ایک شے ایسی ہوتی ہے۔ جو نہ صرف فکر و شعور کے لئے اطمینان کا باعث بنتی ہے بلکہ عمل کی مضبوطی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔ اور وہ ہے یقین......! بنیادی نکتہ یقین ہے۔ آپ اللہ رب العزت کو واحد تصور کرتے ہیں تو کیا اس کا آپ کو یقین ہے؟ آپ کے تصور کی آبیاری کن خیالات اور احساسات نے کی؟ یہاں اگر ہم اپنے آپ کو، اپنے تصور کو اور آبیاری کرنے والے خیالات و احساسات کو ٹٹولیں۔ انہیں فکر و شعور کی کسوٹی پر پرکھیں تو ہمارا عمل بھی ہم پر واضح ہو جائے گا۔ تصور، یقین اور عمل کی اس مثلث میں آلائشیں جو ہیں وہ بالکل سامنے آ جائیں گی۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ خود کو معراج پر لے جائے یا پھر پستیوں میں خود کو گرا دے۔" میاں جی بڑے دھیمے اور شگفتہ لہجے میں بات کہتے رہے جس کا ایک ایک لفظ سماعتوں سے ہو کر علی کے من میں راسخ ہوتا چلا گیا۔ وہ خاموش رہا شاید اس کے اندر جذب کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس لئے وہ اس بات پر لرزا نہیں بلکہ اس کے فکر و شعور میں ایک حشر برپا ہو گیا تھا۔ اسے ایک راستہ مل گیا تھا جس پر چلتے

ہوئے وہ اپنے تصور کو نئے سرے سے پرکھ سکے۔ علی کے من کی خاموش جھیل میں نئی سوچ کا پتھر گرا تو خیالات کی لہریں بڑی دور تک دائرے بناتی چلی گئیں۔ دونوں کے درمیان ایک طویل خاموشی اتر آئی۔ وہ اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سوچتے رہے۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد علی نے سر اٹھایا اور میاں جی سے پوچھا۔

"یہ ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں اور بہت اچھی ہیں۔ میرے دل کو لگی ہیں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟"

"وہ کیا؟" میاں جی نے سنجیدگی سے کہا۔

"سانول.....! میں سانول کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ اس نے قصور کیا ہے۔ جرم ہوا ہے اس سے لیکن اسے اتنی بڑی سزا دی گئی۔ اسے ختم کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے قتل کے بعد بھی اسے سزا دی گئی' اتنی کڑی سزا.....؟"

"بیٹا.....! یہاں ہم اپنے آپ کو تو سنوار سکتے ہیں۔ لیکن کسی دوسرے کو سنوارنا بہت مشکل ہے۔ میں بھی مانتا ہوں۔ سانول کو بہت زیادہ سزا دی جا رہی ہے اور میں بھی اس میں شامل ہوں کیا کریں، اس کے لئے حکم ہی ایسا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم میاں جی کہ یہ حکم کہاں سے آیا اور کیوں آیا مگر انسانیت اس قدر....." علی نے جذبات میں کہنا چاہا تو میاں جی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اور متانت سے بولے۔

"کبھی پانی میں چاند دیکھا ہے؟"

"کئی بار دیکھا ہے۔" علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ اصل تو نہیں ہوتا نا.....! اسی طرح بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو حالات کے پس منظر میں کچھ اور دکھائی دے رہی ہوتی ہیں لیکن ان کی اصل کچھ اور ہوتی ہے۔ منظر بدلنے کے لئے، موسم تبدیل ہونے کے لئے ہوائیں چلتی ہیں۔ ان میں بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ بس تحمل سے دیکھتے رہو کہ ہو کیا رہا ہے؟" میاں جی نے بہت پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کر رہا، لیکن اماں فیضاں ایک غریب عورت ہے، اس کی شنوائی نہیں تو کیا وہ اپنے بیٹے کیلئے انصاف بھی نہیں مانگ سکتی.....! آپ خود بتائیں رب نواز کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ سانول کو ختم کر دے۔ آپ بھی اور سب بستی والے بھی یہ جانتے ہیں

کہ یہ حادثہ اچانک نہیں ہوا تو پھر.....؟"

"علی.....! میں نے کہا ہے نا، خاموش رہو اور دیکھتے رہو..... ہم اگر بحث میں پڑے تو بات نجانے کہاں تک جا پہنچے گی۔ وقت بتائے گا تمہیں سارے سوالوں کے جواب دے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور پھر چونکتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے عشاء کا وقت ہونے کو ہے، اذان دے دو۔" یہ کہہ کر میاں جی اٹھ گئے تو علی بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ گیا۔

☆☆☆

دن نکلنے میں ابھی تھوڑا وقت تھا۔ مشرقی افق نارنجی ہو رہا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا ابھی تھا۔ نیلگوں سے ماحول نے خوشگواریت طاری کی ہوئی تھی۔ ایسے میں کچی بستی سے دور مہرو اس راستے پر کھڑی تھی جہاں سے علی واپس آنے والا تھا۔ مہرو کو پورا یقین تھا کہ وہ واپس لوٹے گا تو اسی راستے سے۔ وہ تین دن سے یونہی اسے سانول کی قبر پر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس دن مہرو نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ علی سے ضرور ملے گی اور وہ سب کچھ کہہ دے گی جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ اس کی نگاہیں اسی راستے پر تھیں جہاں سے علی نے آنا تھا۔ اس کا انتظار اتنا طویل نہیں ہوا، کچھ ہی دیر بعد علی آتا ہوا دکھائی دیا۔ مہرو اس کے راستے میں آکھڑی ہوئی اور اسے آتا ہوا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔ تبھی مہرو نے کہا۔

"علی.....! رکو، میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس کے لہجے میں اک دردناک استدعا تھی۔ علی کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ پھر اس نے گھوم کو مہرو کو دیکھا اور چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا۔

"کیا کہنا ہے تمہیں۔ کون ہو تم، میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے..... بہت کچھ کہنا ہے، لیکن شاید کہہ نہیں پاؤں گی۔" اس نے براہ راست علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اک لمحہ توقف کے بعد بولی۔ "میرا نام مہرو ہے اور میں....."

"اچھا تم ہو.....؟" علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وجہ سے ہی سانول اس دنیا میں نہیں رہا۔ اتنا کیا ظلم کر لیا تھا اس نے کہ اسے جان سے ہی مار دیا جائے۔" اس کے لہجے میں بس دکھ گھلا ہوا تھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو علی۔لیکن ہماری روایت میں یہ ایسا ہی جرم ہے۔اور پھر اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف اپنی بات منوالے۔" مہرو نے دبے ہوئے لہجے میں احتجاجاً کہا۔

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا مہرو کیونکہ تم سمجھ ہی نہیں پاؤ گی کہ سانول کی کیفیات کیا تھیں۔وہ تمہارے بارے میں کیا جذبات رکھتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ہرنی جیسی آنکھوں میں دبا دبا خوف اور قدرے غصہ چھلک رہا تھا۔ستوان ناک میں پڑی ہوتھلی اس کے حسن کا کروفر کچھ اور بڑھا رہی تھی۔پتلے گلابی ہونٹ وہ بری طرح مسل رہی تھی جیسے وہ لفظ کہنا نہیں چاہتی جو ہونٹوں پر تھے لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔کانوں میں پڑے جھمکے ہلکورے لے رہے تھے اور لانبی گردن میں رنگین دھاگہ نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔روایتی آنچل سے اپنا سر ڈھانپے وہ یوں اعتماد سے کھڑی تھی کہ جیسے علی پر کوئی حق جتانے آئی ہو۔ مہرو نے اپنے کشادہ ماتھے پر ہلکی سی تیوریاں لاتے ہوئے کہا۔

"سانول کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب ہم دونوں کو ہوش نہیں تھا، ہم ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔جوان ہوئے ہیں۔میں یہ جان گئی ہوں کہ اسے مجھ سے محبت تھی، وہ عشق کرتا تھا مجھ سے،لیکن عشق کو یوں سربازار رسوا تو نہیں کیا جاتا۔اس نے تو مجھے مٹی میں رول دیا۔"

"تم چاہتی تو اسے واپس لاسکتی تھی،اسے تم پر بڑا مان تھا،تم مانو یا نہ مانو؟اس کی اصل قاتل تم ہو۔جس کی سزا تمہیں ملے گی۔ساری زندگی تم اس کے لئے تڑپو گی۔" علی نے دکھے ہوئے من سے کہا۔

"میری نیت صاف ہے علی......!اس لئے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ میں ایسے کسی حالات سے نہیں گزروں گی۔"

مہرو نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

"خیر......!یہ آنے والے دنوں کی باتیں ہیں۔انہیں چھوڑو،بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" علی نے اس بحث سے بچتے ہوئے کہا۔تو مہرو نے اس کی طرف دیکھا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔

"علی......!تم یہاں سے چلے جاؤ تو اچھا ہے؟"

اس کے یوں کہنے پر وہ چند لمحے حیرت میں رہا، پھر بہت ساری باتیں سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔"میں نہیں جانتا کہ تمہیں میرے یہاں رہنے سے کیا مسئلہ ہے لیکن کیا میں اماں فیضاں اور

بھیرے کو یوں تنہا چھوڑ جاؤں۔میں ایسا نہیں کرسکوں گا۔"

"کیوں......!تم ایسا کیوں کر سکتے؟" مہرو نے احتجاجاً کہا۔

"یہی بات اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم ایسا کیوں چاہ رہی ہو تو پھر......؟" علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"دیکھو......!میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔میرا بھائی رب نواز یہیں ہے پیر سیدن شاہ کی پناہ میں ہے۔اور شاید تمہیں پتہ نہیں پولیس بھی اس کے سامنے بے بس ہے۔یہاں تک کہ اماں فیضاں بھی کچھ نہیں کر پائے گی۔تمہارے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں کہ تم شاید اس لئے یہاں پر ہو کہ تم سانول کے معاملے میں......"

"تو کیا تمہارا بھائی، یا وہ پیر سیدن شاہ مجھے قتل کروا دیں گے......؟"

"ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے، میں نہیں چاہتی کہ تم خواہ مخواہ مارے جاؤ" مہرو نے تیزی سے کہا۔

"میرا خون رائیگاں نہیں جائے گا، اور تم یہ جان لو کہ سانول کا خون بھی اتنا بے وقعت نہیں ہے۔وہ بھی رائیگاں نہیں جائے گا۔اماں اگر مجبور اور بے بس ہے تو کوئی بات نہیں۔لہو خود بولتا ہے۔"

"مگر تم......تم کیوں ایسا سوچتے ہو، تم اپنا آپ کیوں ختم کرنے پر تلے ہو۔کیا لگتا ہے وہ تمہارا۔" مہرو نے یوں کہا جیسے وہ ابھی پھٹ پڑے گی۔

"میں نے کہا ہے نا تم نہیں سمجھ سکو گی۔خیر......!تم ان دھمکیوں کو چھوڑو۔اگر کوئی اور بات کرنی ہے تو بتاؤ۔"

"تم اگر یہ سوچ رہے ہو کہ تم رب نواز کو نقصان پہنچا سکو گے یا پیر سیدن شاہ سے ٹکرا کا سوچ رہے ہو تو تم بہت سخت غلطی پر ہو۔ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔تم خود کو یہاں ضائع نہ کرو، واپس چلے جاؤ۔"

اس پر علی اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔"مہرو......!جو کچھ بھی ہو جائے، میں یہیں رہوں گا۔سانول میرا محسن تھا۔اس نے میری جان بچائی تھی۔یہ زندگی اسی کے لئے ہے تم کیا جانو......!محسن کیا ہوتا ہے۔مجھے اپنا فرض نبھانا ہے۔حالات چاہیے جیسے بھی ہوں۔میں ان سے لڑوں گا۔مگر مجھے تم پر افسوس ہے۔تم میاں جی سے پڑھتی بھی ہو لیکن تم

نے کچھ بھی نہیں جانا، کچھ بھی نہیں سمجھا، سنو......! یہ سب کچھ توفیق سے ملتا ہے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ مہرو ایک لفظ بھی مزید نہیں کہہ سکی۔ وہ بت بن گئی تھی۔ جیسے وہ سب بھول گئی ہو جو وہ علی سے کہنے کے لئے آئی تھی۔ علی کی بات اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ علی اندر سے کیا چاہتا ہے۔ وہ آئی تو اس مقصد کے لئے تھی کہ علی کو یہاں سے چلے جانے کے لئے کہے۔ اسے باور کرائے کہ اس کا بھائی اور پیر سیدن شاہ بہت ظالم ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو جائے گا لیکن یہاں تو عزم ہی ایسا تھا کہ جس کے سامنے خوف گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ علی اس کی بدلتی ہوئی کیفیات کو دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ مہرو کو ہوش اس وقت آیا جب علی اس سے چند قدم دور جا چکا تھا۔ اس نے پوری شدت سے اسے روک لینا چاہا مگر اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس کے بارے میں لفظ بے جان ہو چکے تھے۔ وہ اسے یہاں سے چلے جانے کا کہنے آئی تھی مگر اسے لگا جیسے وہ اب خود علی کو روکے گی۔

☆☆☆

پیر سیدن شاہ کی حویلی کے اس حصے میں جہاں وہ اپنے مریدوں سے ملاقات کیا کرتا تھا، اس وقت سنسان ہو چکا تھا۔ سیدن شاہ کے مرید خاص پیراں دتہ نے وہ کمرہ خالی کروا لیا تھا۔ اور جتنے بھی لوگ وہاں پر آئے ہوئے تھے انہیں باہر بیٹھنے کا حکم صادر کر دیا گیا تھا۔ وہاں صرف ایک شخص بیٹھا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے حویلی کے باہر آ کر رکا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ڈی ایس پی تھا جس کے ساتھ آئی ہوئی نفری بھی سادہ لباس میں تھی۔ ابھی تک پیر صاحب ملاقات کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ انہیں یہی معلوم تھا کہ پیر سیدن شاہ اسی کمرے میں مریدوں سے بات کرتا ہے، سو کچھ دیر بعد پیراں دتہ سے رابطہ ہوا۔ اس نے پیر صاحب سے اجازت لے کر انہیں وہیں بٹھایا اور لمحوں میں وہ کمرہ خالی کرا لیا۔ اس میں بھی ڈی ایس پی کے لئے پیغام تھا۔ کہ لوگ پیر سائیں کا حکم کیسے مانتے ہیں۔ ڈی ایس پی بے چینی کے ساتھ اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے پیر سیدن شاہ کی آمد متوقع تھی۔ اس کو ملنے کی اجازت اس شرط پر دی گئی تھی کہ وہ اکیلا اندر آئے گا۔ باقی نفری باہر ہی رہے گی۔ ڈی ایس پی نہ صرف سمجھ رہا تھا بلکہ اس سارے عمل میں چھپے ہوئے مفہوم سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ پیر سیدن شاہ کے بارے میں پوری معلومات لے کر آیا تھا۔ وہ کافی طاقتور اور رسائی رکھنے والا با اثر آدمی تھا۔ یوں اس کمرے میں اسے بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی جس سے اس کے اندر قدرے بے چینی جنم لے چکی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ سیدن شاہ

اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

کافی دیر انتظار کے بعد سیدن شاہ اس کمرے میں نمودار ہوا۔ اس کے انداز میں تفاخر اور کروفر تھا۔ اس نے ڈی ایس پی کی طرف نہیں دیکھا بلکہ سیدھا اپنی مسند پر آ کر بیٹھ گیا اور پھر بڑی بے نیازی سے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بھئی ڈی ایس پی......! بتاؤ کیا کام ہے؟"

سیدن شاہ کے لہجے، انداز اور علیک سلیک نہ کرنے سے ڈی ایس پی سمجھ گیا کہ وہ اسے بری طرح سے نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔ سو اس نے بھی کھردرے لہجے میں کہا۔

"پیر صاحب......! کچھ دن پہلے علی نامی ایک لڑکا شہر سے اغواء ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ آپ ہی کے علاقے میں موجود ہے اور آپ کے قید خانے میں بھی رہا ہے۔ ہمیں وہ لڑکا چاہئے۔" ڈی ایس پی کے لہجے اور بات سے سیدن شاہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈی ایس پی......! جس نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ وہ میرے قید خانے میں رہا ہے، اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اگلی صبح ہمارے پاس نہیں تھا۔"

"یہی تو جاننا چاہتے ہیں ہم کہ وہ آپ کی قید میں کیوں آیا اور پھر وہ چلا بھی گیا؟ یہ کیا معمہ ہے اور اب کہاں ہے۔" ڈی ایس پی نے اکھڑے لہجے میں کہا تو سیدن شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا قید خانہ کوئی آپ کی حوالاتوں اور جیلوں جیسا تو ہے نہیں۔ میرے پاس تو کئی لوگ آتے ہیں۔ بدنظمی سے بچنے کے لئے یا تھوڑی بہت سزا دینے کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں اور پھر انہیں جانے دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ قدرے خاموش ہوا اور پھر بولا۔ "آپ لوگ محنت کریں اور تلاش کر لیں کہ وہ کہاں ہے۔ میرے پاس اس لڑکے کے بارے میں پوچھنے کے لئے آنا فضول ہے۔"

"کیا آپ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔" ڈی ایس پی نے پیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہر بندہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ مجھے کیا معلوم؟"

"وہ تو ہم اسے تلاش کر ہی لیں گے۔ لیکن آپ نے اسے اپنے پاس کیوں رکھا؟" ڈی

ایس پی نے پھر سے وہی سوال کر دیا۔

''ڈی ایس پی.....! تم نئے آئے ہو۔ تمہیں کچھ نہیں پتہ، اس لئے تمہارے سوال میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی میں جواب دینا پسند کرتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا کہ سادہ کپڑوں میں آئے ہو ورنہ میں تمہیں اپنی حویلی میں قدم نہ رکھنے دیتا۔'' سیدن شاہ نے قدرے غصے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کی حویلی ہے اور میں اس وقت سرچ ورانٹ کے ساتھ نہیں آیا۔ میں آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔ لیکن لگتا نہیں ہے آپ میرے ساتھ تعاون کرنے والے ہیں۔'' ڈی ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو بھی کہا، میں اس کا جواب دینا پسند نہیں کرتا، اب جاؤ۔'' سیدن شاہ نے کہا اور پھر اپنا رخ پیراں دتہ کی جانب کر کے کہا۔ ''یہ چلے جائیں تو مریدین کو اندر بھیجو۔'' اس نے ڈی ایس پی کو بری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لئے ڈی ایس پی نے ایک نگاہ پیر پر ڈالی اور تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ اسے اپنے شک کی تصدیق ہو گئی تھی۔

جیسے ہی ڈی ایس پی حویلی سے باہر آیا تو اس کے ساتھ آئی ہوئی نفری میں سے انسپکٹر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''سر.....! ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لڑکا کدھر ہے۔ یہاں آ کر شاید ہم نے اپنا وقت.....''

''ضائع نہیں کیا۔'' ڈی ایس پی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی جیپ میں بیٹھا تو انسپکٹر بھی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ تب اس نے حکم دیا۔ ''کچی بستی چلو.....! علی کا پتا وہیں سے ملے گا۔'' اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور گاڑیوں کا یہ قافلہ وہاں سے چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ سانول کے گھر کے سامنے تھے۔

اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ جب تک ڈی ایس پی جیپ سے نیچے اترا اس کی نفری پہلے ہی اتر چکی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گوپے کے نزدیک ایک نوجوان اور ایک لڑکا بکریاں باندھ رہے تھے اور اب ان کے آنے سے انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈی ایس پی نے اشارے سے انہیں بلایا تو نوجوان ان کی طرف آ گیا۔ اس نے پہلے جیپ اور پھر ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی فرمایئے.....!''

''علی تمہارا ہی نام ہے.....؟''

''ہاں.....! میرا ہی نام ہے۔ آپ کون؟''

''ڈی ایس پی رفاقت باجوہ، تمہارے اغواء کی ایف آئی آر ہمارے پاس درج ہے، چلو ہمارے ساتھ۔''

''مگر میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔'' علی نے عام سے لہجے میں کہا۔

''کیوں.....؟'' رفاقت باجوہ نے تیزی سے پوچھا۔

''میری مرضی.....!'' علی نے اسی لہجے میں کہا تو رفاقت باجوہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ادھر تمہارا باپ اغواء کا پرچہ درج کروا کے ہمارا سر کھا رہا ہے اور تم میاں اپنی مرضی سے بیٹھے ہوئے ہو۔ یہ مرضیاں بعد میں کرتے رہنا، پہلے ہمارے ساتھ چلو۔'' رفاقت نے کہا اور جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں پتر علی.....! جاؤ تم، میں نے پہلے ہی تمہیں کہا تھا، تیرے والدین پریشان ہوں گے۔'' اماں فیضاں نے کہا جو نجانے کب وہاں آ کھڑی ہوئی تھی۔

''لیکن اماں میں آپ کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔''

''میرا اللہ سائیں میرے ساتھ ہے۔ تم جاؤ۔'' اماں فیضاں نے کہا اور رفاقت باجوہ سے بولی۔ ''اسے لے جائیں۔ یہ احسان کا مارا یہاں پڑا ہوا ہے۔ ہماری تو زندگی برباد ہے۔ یہ تو نہ کرے۔''

''ٹھیک ہے اماں.....! اگر آپ کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔ لیکن واپس ضرور آؤں گا۔'' علی نے دکھی لہجے میں شکوہ بھرے انداز سے کہا اور جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ وہ سیٹ پر جا کر بیٹھا تو سبھی بیٹھ گئے اور جیپ چل دی۔ باقی گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں۔

کچی بستی سے جب وہ دور نکل آئے تو رفاقت باجوہ نے بیک مرر میں علی کو دیکھتے ہوئے کہا، اس کے لہجے میں حقیرانہ تحکم تھا۔

''ہاں تو میاں علی.....! اصل معاملہ کیا ہے۔ فوراً شروع ہو جاؤ۔''

''اور اگر میں نہ بتا پاؤں تو.....؟'' علی نے اس کے لہجے سے چڑتے ہوئے کہا تو

رفاقت ہنس دیا۔اور پھر بولا۔

”تم شاید پولیس کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔وہ تو مُردوں سے بھی راز اگلوا لیتے ہیں اور تم تو ابھی سانس لے رہے ہو۔“

”ٹھیک......! آپ کوشش کرلو......!“ علی نے لاپرواہی سے کہا تو انسپکٹر نے ایک غلیظ سی گالی دی جس پر علی تڑپ اٹھا۔اس نے اپنی ہی جونک میں ہاتھ اٹھایا اور شاید وہ انسپکٹر کے تھپڑ رسید کر دیتا، رفاقت باجوہ نے کہا۔

”نہیں......! تم لوگ اسے کچھ مت کہو۔میں دیکھ لوں گا اسے۔“ اس کے کہنے پر انسپکٹر بولا۔

”آپ ایک بار اسے میرے حوالے کر کے تو دیکھیں میں اس کی ساری گرمی نکال دیتا ہوں۔“

”شٹ اَپ......! تمہیں سمجھ نہیں آئی میں نے کیا کہا ہے۔“ رفاقت نے کہا تو انسپکٹر نے منہ بسورتے ہوئے قہر آلود نگاہوں سے علی کی طرف دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔پھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔یہاں تک کہ وہ ایک بستی میں داخل ہوئے۔اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔

وہ کسی بڑے زمیندار کا ڈیرہ تھا جہاں پروہ رکے تھے۔ان کے بیٹھتے ہی ان کی دودھ سے تواضع کر دی گئی تھی اور نوکر چاکر کھانا لگانے کی فکر میں تھے۔علی ایک جانب بیٹھا خاموش تھا۔اسے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔تھوڑی دیر بعد ایک نوکر سیدھا رفاقت کے پاس گیا اور آہستگی سے کچھ کہا تو وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔اور چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے علی کے پاس آیا اور کہا۔

”اٹھو، چلو میرے ساتھ۔“

علی نے ایک نظر اس کے چہرے پر دیکھا اور خاموشی سے اٹھ گیا۔وہ دونوں نوکر کے پیچھے پیچھے ڈیرے سے نکلے اور پھر تھوڑے سے فاصلے پر حویلی میں داخل ہو گئے۔تو سامنے ہی سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص نے ان کا استقبال کیا۔

”آیئے آیئے رفاقت باجوہ صاحب......! میرا نصیب کہ آپ یہاں میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔معذرت خواہ ہوں کہ مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔آیئے تشریف

لائیں۔“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر علی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔”یہی ہے وہ نوجوان علی؟“

”ہاں جی، یہی ہے......خان محمد صاحب......!“ رفاقت باجوہ نے کہا تو علی چونک گیا اور پھر بولا۔

”سانول آپ کے پاس پناہ لینے آیا تھا؟“

”ہاں......! میرے پاس ہی آیا تھا مگر......“ خان محمد نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا تو علی بولا۔

”اور تم......! اس کی حفاظت نہیں کر سکے۔میں اسے کیا سمجھوں، تمہاری بزدلی، مصلحت یا لاپرواہی......؟“ جوشِ جذبات میں علی آپ سے تم پر اتر آیا۔

”علی تم......نہیں جانتے ہو کہ کیا ہوا تھا۔یہ سب اچانک ہوا۔“

”میں نہیں مانتا، تم بھی اتنے ہی مجرم ہو، جتنا اس کا قاتل مجرم ہے۔تم مانو کہ تم اس کی حفاظت نہیں کر سکے ہو، تم بزدل ہو۔“

”نہیں علی......! میں بزدل نہیں ہوں۔“ خان محمد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اگر تم بزدل نہ ہوتے تو اس کے جنازے میں ضرور شامل ہوتے۔تم میں اور کچی بستی کے ایک عام شخص میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

”ہاں......! میرا یہ جرم ہے کہ میں اس کے جنازے میں شامل نہیں ہوا، اس میں بھی مصلحت تھی۔“

”مصلحت یا منافقت......!“ علی نے نفرت سے کہا اور رفاقت کی جانب دیکھ کر کہا۔

”آپ چاہیں تو اس کی میزبانی قبول کریں۔میں باہر آپ لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔مجھے منافقوں سے نفرت ہے۔“

”علی......! تم بہت بول رہے ہو۔تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ وہ تم سے عمر میں بڑے ہیں۔“

”منافق بس منافق ہوتا ہے۔“ علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہا۔

”علی......! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو یا کون نہیں ہو، مجھے اس سے سروکار بھی نہیں ہے۔لیکن میں نے تمہاری باتیں صرف اس لئے سن لی ہیں کہ تمہاری نسبت سانول سے ہے۔تم جو

کچھ بھی کر رہے ہو، وہ میرے لئے محترم ہے، تمہاری نفرت جائز ہے لیکن ......! میری بات سن لو، اس کے بعد جو چاہے فیصلہ کر لینا۔'' خان محمد نے انتہائی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

'' ہاں ......! ذرا سن تو لیں۔'' رفاقت نے کہا تو علی نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ وہ تینوں ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ تب خان محمد نے کہا۔

'' سانول سے میرا تعلق صرف شکار کی وجہ سے تھا، میرا دوست تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ لڑکی کو جہاں چاہے لے جا سکتا ہے، میرے بندے اسے چھوڑ آئیں گے۔ چاہیں تو زور زبردستی سے ہر بات منوا لیتے ہیں مگر وہ نہیں مانا...... وہ مہرو کی رضامندی چاہتا تھا۔ وہ اسے منا لینا چاہتا تھا اور نہ ماننے کی صورت میں اسے باعزت طور پر واپس بھیج دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ باہر والے ڈیرے پر رہا۔ مجھے واہر کا پتہ اس وقت چلا جب سانول قتل ہو چکا تھا۔''

'' پھر تم اس کے جنازے میں نہیں آئے؟'' علی نے تیزی سے پوچھا۔

'' یہی بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔ پیر سیدن شاہ کا مرید خاص پیراں دتہ اسی شام میرے پاس آیا تھا۔ وہ مجھے اس قتل میں ملوث کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں ملوث ہو جاتا تو پھر میں سانول کے لئے کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ اس پورے علاقے میں فقط میں ہی اُن کی مخالفت کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا '' علی ......! تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے وہ کچھ کیا، جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اب تم جا رہے ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ میں سانول کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اس کی گواہی تمہیں رفاقت باجوہ صاحب دیں گے۔'' خان محمد اتنا کچھ کہہ کر یوں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جیسے یہ سب کہتے ہوئے اس کا کتنا زور لگا تھا۔

'' ہاں علی ......! اس سلسلے میں خان محمد صاحب نے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن مدعی اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے قانون بھی بے بس ہے۔ لہٰذا ......! یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر، بہت تحمل سے کرنا ہے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم یہاں کیسے پہنچے ہو، ہاں اگر تم بتانا چاہو۔ یہ تجسس مجھے اس لئے ہے کہ سردار امین خان تمہارے لئے بہت فکر مند ہے۔ اور میرا انسپکٹر اس کا نمک خوار ہے۔ اس کے سامنے میرا رویہ تمہارے ساتھ بہت برا ہو گا۔'' رفاقت نے کہا تو علی کتنی دیر تک خاموش رہا اور پھر سر اٹھاتے ہوئے بولا۔

'' میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' علی کے لہجے میں انتہائی درجے کا کرب تھا۔

'' آؤ ......! کھانا کھا لو، پھر ہمیں شہر بھی پہنچنا ہے۔'' رفاقت نے اٹھ کر اس کے

کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ تو وہ اٹھ گیا۔ اسے میاں جی کی بہت ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔

☆☆☆

رات دبے پاؤں گزرتی چلی جا رہی تھی۔ صحن میں بچھی چارپائی پر پڑی ہوئی مہرو مسلسل سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ علی کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ دو دن پہلے جب وہ اس سے ملی تھی۔ تب اس نے کتنے یقین سے کہا تھا کہ وہ یہاں سے نہیں جانے والا۔ مگر یہ اچانک کیا ہو گیا تھا کہ اب وہ کچی بستی میں نہیں رہا تھا۔ جب وہ علی سے ملی تھی، اس سے پہلے اس کی سوچ کا انداز کچھ اور تھا۔ مہرو وہی سمجھ رہی تھی جو سب کہہ رہے تھے۔ لیکن اس سے ملنے کے بعد اس کی سوچ بدل گئی تھی۔ اس وقت کے بعد سے وہ اپنے اندر سے اٹھنے والے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ سانول سے لاکھ نفرت کرنے کے باوجود، اس کے دل میں سانول کے لئے ایک ہمدردی، پیار اور بچپن کا معصوم تعلق بھی تھا۔ جب علی نے کہا کہ سانول نے اس کی جان بچائی تھی تب اس نے غور کیا، دوسروں سے پوچھا کہ علی اور سانول کیسے ملے۔ اس کا سب سے بڑا گواہ بھیرا تھا۔ جس نے لوگوں کو بتایا ہوا تھا کہ علی صحرا میں بے ہوش پڑا ملا تھا۔ اتنی جلدی تو بندہ کسی اجنبی سے بے تکلف نہیں ہوتا کہ اپنے دل کے راز بھی اس کے سامنے کہہ دے۔ تب مہرو نے ماضی میں پلٹ کر دیکھا تو اسے سانول کی بہت ساری باتیں ایسی ملیں، جن کی وجہ سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شدت سے محبت کرتا تھا، بہت ساری باتیں خود سانول نے اسے بتائی تھیں۔ مگر اس وقت تو اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی کہانی سن رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ سانول کو اتنی بڑی سزا نہیں دی جانی چاہیے تھی۔

ممکن تھا کہ سانول اس کی بات مان جاتا، اسے لے کر بحفاظت گھر آ جاتا لیکن خود اس نے سانول کی سنی کب تھی، پیار سے سمجھایا کب تھا، اب جبکہ سانول اس دنیا میں نہیں رہا تھا، منوں کی مٹی تلے دفن تھا۔ اتنی بڑی سزا پا لی تو کیا پھر بھی لوگوں نے اسے معصوم خیال کیا، کیا وہ لوگوں کے طعنوں، مہنوں سے بچ گئی ہے۔ اب تو وہ طنز، طعنوں اور تمسخر کے تیروں سے زیادہ چھلنی ہو رہی ہے۔ آج اگر سانول زندہ ہوتا تو وہ اس کی پناہ میں جانا چاہتی کیونکہ اس کی عزت کا سب سے بڑا گواہ تو وہی تھا۔ اسے مار دینے سے تو شک و شبہات اور افواہوں نے جنم لے لیا تھا اور بات نجانے کس کس انداز میں پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ سانول اس کے بچپن کا ساتھی، وہ تو اسے جانتی تھی لیکن اس پر ذرا برابر اعتماد نہ کیا اور وہ اجنبی ......! جس کا محض ساتھ چند دنوں کا تھا۔ سانول کو اپنا محسن مان

کر پوری زندگی تیاگ دینے کا عزم کیے بیٹھا تھا۔

کیا وہ ساری زندگی یہاں گزار دیتا؟ یہ ایک اور اہم سوال تھا، جس پر وہ جتنا سوچتی اور زیادہ الجھ جاتی۔ اس کا صحیح جواب تو علی ہی دے سکتا تھا۔ لیکن حالات اور واقعات نے اب تک تو یہی ثابت کیا تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ لوگوں نے اس کی حالت دیکھی تھی۔ پاؤں اور ہاتھوں میں چھالے، گرم ہواؤں میں صحرا کے درمیان ریوڑ چرانا اور نہایت مستقل مزاجی سے اماں فیضاں کی خدمت میں لگ جانا ایسے شواہد تھے جو اس کے پختہ عزم کا اظہار تھے۔ اتنی سختیاں جھیلنے کے ساتھ ساتھ وہ تو پیر سیدن شاہ اسے کسی بھی وقت ختم کروا سکتا ہے، اس کی اس نے پروا نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ اسے یہاں سے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ مہرو کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس سب سے پہلے پیر سیدن شاہ کی حویلی گئی تھی۔ اور پھر انہوں نے آ کر علی کو پکڑا تھا۔ اس سے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ علی کو یہاں سے نکالنے میں پیر سیدن شاہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ اس کے حکم کے بغیر تو یہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا پیر سیدن شاہ کو اچھا نہیں لگا کہ علی یہاں پر نہ رہے؟ یہی وہ سوال تھا جس پر وہ مسلسل سوچ رہی تھی اور اسے جواب نہیں مل رہا تھا کہ اسے اچھا کیوں نہیں لگ رہا تھا اس نے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا کہ جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ رب نواز سے انتقام لینے کی سوچ رہا ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ چاند مغرب کی جانب جھک گیا۔ تبھی اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا۔ کیا کوئی ایسا شخص ہو گا جو مجھے بتا سکے؟ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن کے پردے پر میاں جی کا نورانی چہرہ ابھرا۔ وہ چونک گئی۔ ''ہاں......! وہی میری راہنمائی کر سکتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور پرسکون سی ہو کر نیند میں کھو گئی۔

☆☆☆

نگہت بیگم کے گھر کا آنگن پھر سے خوشگوار ہو چکا تھا ورنہ جتنے دن تک علی اس گھر میں نہیں تھا نگہت بیگم کو وہ صحن بالکل ویران دکھائی دیتا رہا تھا۔ علی کو گھر میں آئے دو دن ہو چکے تھے۔ ان دو دنوں میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اس دوران وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔ نگہت بیگم نے بھی اس سے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی تھی۔ جس رات وہ واپس آیا تھا۔ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہیں پائی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو، اجنبی سا لباس دہکتا ہوا رنگ، سیاہی مائل ہو کر بجھا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں ہمہ وقت ایک خوشگوار ہنسی بھری رہتی تھی ان میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔ شرگمیں سی اور سوچتی ہوئی آنکھیں۔ وہ یوں لگ رہا تھا جیسے بجھ کر رہ گیا ہو، نگہت بیگم نے یہی

سمجھا کہ اتنے دن گھر سے باہر رہنے اور حادثہ ہو جانے کے باعث اس پر ان حالات کا اثر ہے۔ سب نے ہی ان گزرتے ہوئے دنوں کی روداد پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے چند فقروں سے زیادہ کچھ بھی نہ کہا۔ یوں جیسے وہ سب کچھ دہراتے ہوئے اسے اذیت محسوس ہو رہی ہو۔

اس دن اسے گھر آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ غلام نبی سمیت دونوں بچے کالج جا چکے تھے۔ نگہت بیگم برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی ہوئی تسبیح کر رہی تھی۔ اسے انتظار تھا کہ علی اٹھ جائے تو اسے ناشتہ دے کر ہی گھر کے کام کاج شروع کرے۔ اس کا دھیان علی کے کمرے کی جانب ہی تھا۔ دن کافی چڑھ آیا تو علی اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کی نگاہ اپنی ماں پر پڑی تو اس نے سلام کیا۔ جس کا جواب دینے کے بعد نگہت بیگم بولی۔

''بیٹا......! اب بس بہت آرام کر لیا۔ سب سے پہلے اپنا یہ حلیہ درست کرو۔ پھر تیار ہو کر میرے پہلے والے علی بن کر آؤ۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بناتی ہوں۔''

اس پر وہ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھتا رہا اور پھر کسی بھی جذبے سے بے نیاز سپاٹ لہجے میں بولا۔

''امی......! میں اپنا حلیہ تو درست کر لوں گا۔ لیکن میں آپ کا پہلے والا علی شاید نہ بن پاؤں۔''

''اللہ خیر کرے بیٹا......! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' نگہت بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''اللہ خیر ہی کرتا ہے امی...... یہ ہم انسان ہیں جو اپنی کوتاہیوں کو اپنے ہی انداز میں سوچتے ہیں۔''

''بہکی بہکی باتیں مت کرو......!'' نگہت بیگم نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا، اس کے منہ سے بے ساختہ یوں نکل گیا تھا، پھر جیسے ہی اسے اپنے کہے کی سمجھ آئی تو فوراً بولی۔ ''اچھا......! تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بناتی ہوں۔ جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس کے دل میں ہول اٹھنے لگے تھے۔ یہ وسوسے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے مضبوط انسان کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مضبوط سمجھنے والا انسان وسوسوں کے ریلے میں یوں بہہ جاتا ہے جیسے کوئی تنکا ہو۔ نگہت بیگم بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں تھی۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ بنا کر واپس آئی تو دھک سے رہ گئی۔ علی ایک ٹک زمین کی جانب گھورے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی پوری یکسوئی سے عقدہ حل کر رہا ہو۔ اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہ رہا ہو۔ وہ جب بالکل اس کے قریب پہنچ کر بولی تو

"ہاں.....! میں سمجھتا ہوں اس بات کو۔" علی نے خیالوں میں کھوئے ہوئے کہا اور پھر جیسے وہ ہوش میں آگیا ہو۔ "آپ اب بھی یہ یقین رکھیں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔"

"تم بتا کیوں نہیں دیتے ہو۔" غلام نبی نے الجھتے ہوئے کہا تو علی نے اغواء ہونے سے لیکر واپس آجانے تک کی ساری روداد مختصر انداز میں سنا دی۔ اس میں صرف ایک بات نہیں بتائی جب وہ قید خانے سے بھاگا تھا اور اسے رہنمائی کرنے والا کوئی ملا تھا۔ اس دوران سب کی طرف سے کوئی نہ کوئی سوال کیا گیا۔ جب وہ کہہ چکا تو غلام نبی نے پوچھا "کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ اغواء کس نے کیا تھا اور کیوں کیا تھا؟"

اس کے یوں پوچھنے پر علی چند لمحے خاموش رہا جیسے تذبذب میں ہو کر نہیں کیا بتائے، پھر سر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ابا جی.....! وہ جو کوئی بھی تھے میں نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا، دوبارہ اگر ان میں سے کوئی سامنے آئے تو میں پہچان لوں گا۔" اس کے لہجے میں بے یقینی گھلی ہوئی تھی۔

"اب اس بے چاری اماں فیضاں کا اور اس کے بچے کا کیا بنے گا۔ مرنے والا تو مر گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا کوئی قصور تھا یا نہیں۔" نگہت بیگم نے افسوس بھرے انداز میں کہا تو علی دھیرے سے مسکرا دیا۔ اور پھر بولا۔

"میں رکھوں گا خیال ان کا۔ میں ہوں گا ان کے پاس۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔ پہلے ہی موت کے منہ سے آئے ہو اور اب پھر ان کا خیال رکھنے کی بات کر رہے ہو؟" نگہت بیگم تیزی سے بولی۔

"اماں.....! مجھے تو جانا ہے۔" علی نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی علی.....! تمہیں پتہ ہے، کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہارے جانے کے بعد ہم نے یہ دن کس اذیت اور پریشانی میں گزارے ہیں۔" غلام نبی نے تحمل سے کہا۔

"ہاں.....! مجھے اندازہ ہے ابو..... مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس اذیت سے گزرے ہوں گے۔ اس وقت آپ کو اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن اب تو میں آپ کو بتا کر جاؤں گا۔ اور یہاں آتا جاتا رہوں گا۔"

"کیا آپ مستقل وہیں رہیں گے بھیا۔" فائزہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کب حکم آجائے اور میں واپس آجاؤں۔" علی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا تو نگہت بیگم تو جیسے تڑپ ہی گئی۔ فوراً بولی۔

"یہاں اپنی ماں کا خیال نہیں ہے اور وہاں کسی کی ماں کے لئے تڑپ رہے ہو۔ جس کا ساتھ محض چند دن رہا ہے۔ خبردار اگر کہیں جانے کا سوچا تم نے۔"

"امی.....! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ آپ کے پاس ابو ہیں، فائزہ اور احسن ہیں۔ لیکن ان کے پاس تو کوئی بھی نہیں۔" علی نے انتہائی تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں.....! میں اب تمہیں اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔" نگہت بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"امی.....! آپ یہی سمجھیں کہ آپ کا بیٹا، یورپ یا مڈل ایسٹ کے کسی ملک میں کمانے چلا گیا ہے۔ مائیں انہیں بھی تو برداشت کرتی ہیں۔" علی نے ایک کمزور سی دلیل دی۔

"مگر وہ کمانے جاتے ہیں۔" نگہت بیگم نے تیزی سے کہا۔ "تیری طرح خود کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلتے۔"

"موت کا کیا ہے، کہیں بھی آسکتی ہے۔ کیا باہر جانے والوں کو موت نہیں آتی۔؟ اور باقی رہی کمانے کی بات تو امی.....! یقین جانیں جتنا کوئی باہر سے کما کے لاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ آپ کو ملنے والا ہے۔"

"کیا آسمان سے گرے گا، یا کوئی خزانہ تمہیں مل گیا ہے۔ بس میں تیری کوئی اور بات نہیں سنوں گی۔"

"اچھا چلو اس بحث کو ختم کرو۔" غلام نبی نے کسی خیال سے چونکتے ہوئے کہا۔ پھر علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم جو چاہو کرنا علی بیٹے.....! لیکن ایک درخواست ہماری مان لو۔"

"ابو آپ حکم دیجیے۔" علی نے جلدی سے کہا۔

"تم جانا چاہو چلے جانا، لیکن بیٹا.....! تمہارا فائنل امتحان شروع ہونے میں چند دن رہتے ہیں۔ امتحان دینے کے بعد تم جو چاہے کرنا، ہم تمہیں منع نہیں کریں گے۔" غلام نبی نے کہا تو نگہت بیگم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر غلام نبی کے اشارے سے وہ فوراً ہی خاموش ہو گئی۔ علی سوچ میں پڑ گیا، پھر چند لمحوں بعد اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابو.....! جیسا آپ کہیں۔"

اس کے یوں کہنے پر سب کے چہروں پر جیسے خوشی دوڑ گئی۔

"اچھا رات بہت ہوگئی ہے، اب سوئیں۔" غلام نبی نے اٹھتے ہوئے کہا تو سبھی اٹھ گئے۔

اپنے کمرے میں آ کر نگہت بیگم نے غلام نبی نے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے علی سے؟"

"فی الحال اسے امتحان دینے دو۔ تقریباً ایک مہینہ تو لگے گا ہی اس میں۔ اس دوران اس کا ذہن بدل لیں گے۔ تم اب اس سے فضول قسم کی بحث نہیں کرنا، مجھے لگتا ہے اس کے دماغ پر کچھ اثر ہوگیا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔" نگہت بیگم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کے سامنے بھی نہ کہہ دینا۔ بس تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" غلام نبی نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔" نگہت بیگم نے کہا۔ تو غلام نبی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہ رہا تھا۔ وہ جس سوچ کو بھی پکڑتا، اس کے آخر میں اسے یونہی لگتا۔ جیسے اس کے مسئلے کا حل وقت ہے۔ فوری طور پر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دوسری طرف نگہت بیگم کو اپنے شوہر کی باتیں ٹھیک معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے بہت محتاط ہونا تھا۔ اپنی اپنی جگہ دونوں سوچتے ہوئے نیند میں کھو گئے۔

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور میں فرزانہ خاں بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی، ندامت اور خوف کے آثار تھے۔ وہ بار بار اپنے لیکچرار کے کمرے کی جانب دیکھ رہی تھی جس میں علی موجود تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیپارٹمنٹ آئی تھی اور اسے آتے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ علی آیا ہے۔ وہ اسی وقت سے کاریڈور میں ٹہل رہی تھی کہ جیسے ہی وہ باہر آئے۔ وہ علی کو لے کر کہیں تنہائی میں چلی جائے اور بہت ساری باتوں کے بعد اس سے معذرت بھی کرلے۔ اسے پوری طرح یہ احساس تھا کہ اس نے علی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ اس خیال سے کانپ جایا کرتی تھی کہ علی اگر اس حادثے میں زندہ نہ رہتا تو......؟ اتنے دنوں میں اس کے ضمیر نے اسے رگید کر رکھ دیا تھا، وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ وہ غرور، وہ تمکنت اور وہ شاہانہ انداز نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ وہ پورے دل کے ساتھ علی سے معافی مانگ لینا چاہتی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے

اس کی آنکھوں میں رات کٹ جایا کرتی تھی کہ وہ اس سے معافی کیسے مانگے گی۔

فرزانہ خاں پوری طرح باخبر تھی کہ علی روہی سے آچکا ہے۔ پولیس نے اپنی کارکردگی بتانے کے لئے اس کے باپ کو بہت کچھ بتایا تھا۔ ڈی ایس پی رفاقت خودان کے ہاں آیا تھا اور اس نے پیر سیدن شاہ کے حوالے سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ اسی دن سے سردار امین خاں نے اپنے طور پر منصوبہ بنالیا تھا کہ وہ پیر سیدن شاہ کو نیچا دکھانے کے لئے کیا کچھ کرے گا۔ جبکہ فرزانہ خاں کا سارا وقت اسی سوچ میں گزرا تھا کہ وہ علی سے سامنا کیسے کرپائے گی۔ وہ اسی آس پر روزانہ ڈیپارٹمنٹ آتی کہ علی آئے گا۔ مگر وہ کئی دن تک نہیں آیا۔ وہ لڑکے جو اس سے مل کر آئے تھے انہوں نے کچھ ایسی باتیں بتائیں تھیں کہ جیسے علی کے دماغ کو کچھ ہوگیا ہے۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اب وہ دوبارہ ڈیپارٹمنٹ نہ آئے۔ لیکن اسے اک آس تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ ان کے گھر چلی جائے مگر اس طرح اس کا سارا پول کھل جاتا اور بات اس کے باپ تک پہنچ جاتی۔ اس کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ وہ اس کے گھر جائے۔ بس یہیں انتظار کرتی رہی۔ آج جب وہ آیا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ یوں جیسے کہ اچانک کوئی افتاد پڑ جائے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ سیدھے اس سے سامنا نہیں ہوگیا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ کاریڈور میں ٹہلتے ہوئے وہ بہت حد تک خود پر قابو پاچکی تھی۔ اس نے بہت ساری ایسی باتیں بھی سوچ لی تھیں کہ علی سے کیا کہے گی۔ جبکہ علی تھا کہ لیکچرار کے کمرے سے باہر ہی نہیں آرہا تھا۔

(انسان کا ضمیر بھی عجیب شے ہے۔ یہ اگر سو جائے تو انسان پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ وہ اس کائنات کا مرکز ہے۔ وہ جو کچھ کرتا چلا جارہا ہے وہ اس کے شایان شان نہیں۔ اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ وہ خود کیا ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ لیکن اگر یہی ضمیر بیدار ہو تو انسان کو خود بخود ان راہوں پر لے جاتا ہے جہاں انسانیت کے اعلیٰ معیار ہیں۔ اسے شعور ہوتا ہے کہ کائنات کا اور اس کا تعلق کیا ہے اور وہ کس مقصد کے تحت اس کائنات میں موجود ہے۔ ضمیر کا یہ عمل بڑی حد تک لاشعوری ہوتا ہے، انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس وقت کیا ہے۔)

فرزانہ خاں کو اس کاریڈور میں ٹہلتے ہوئے جب کافی وقت ہوگیا تو اس کا دل چاہا کہ وہ خود اندر کمرے میں چلی جائے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے عمل کرنے کا ارادہ بھی کرلیا مگر اس کی

ہمت نہیں پڑی اور وہ کاریڈور کے سرے پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ تقریباً اسی لمحے علی کمرے سے باہر آ گیا۔ اتنے دنوں بعد فرزانہ نے اسے دیکھا تھا۔ پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ بلاشبہ علی وہ پہلے والا علی نہیں رہا تھا۔ وہ بہت بدل ہوا تھا، اس میں کیا تبدیلی تھی، فوراً ہی وہ نہ سمجھ سکی۔ اس نے علی کی جانب قدم بڑھائے تو اس کے ساتھ کمرے سے چند اور کلاس فیلو باہر آ گئے۔ فرزانہ رک گئی۔ وہ اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند قدموں کا فاصلہ تھا، لمحوں میں وہ سارے اس کے قریب آ گئے۔

تبھی فرزانہ نے علی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسے ہو علی......؟" اس کے لہجے میں تذبذب اور لرزش تھی۔ تبھی علی نے اس کی جانب چند لمحے غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلے سے بہت اچھا ہوں۔" علی نے دھیمے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو اسی کے ایک کلاس فیلو نے پوچھا۔

"ہائیں......! یہ کیا بات ہوئی، پہلے سے اچھا ہوں، مطلب اگر تمہیں پھر اغواء کرلیا جائے تو تم بہت زیادہ اچھے ہو جاؤ گے۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو جائے، حقیقت یہی ہے کہ میں پہلے سے بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ دعائیں دے رہا ہوں انہیں جن لوگوں نے مجھے اغواء کیا تھا۔" علی نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا تو فرزانہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"ہاں یار......! تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تمہیں اغواء کن لوگوں نے کیا تھا، کچھ پتہ چلا۔" ایک اور کلاس فیلو نے پوچھا تو علی نے فرزانہ کی جانب دیکھا۔ وہ حد درجہ نروس ہو چکی تھی۔ سو علی بولا۔

"میں خود نہیں جانتا وہ کون تھے۔ وہ جو بھی تھے اللہ انہیں معاف کرے۔"

"مطلب، تم کوئی کارروائی نہیں کرو گے ان کے خلاف۔" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"میں نے انہیں معاف کر دیا ہے اور وہ بھی دل سے معاف کیا ہے۔" علی نے کہا اور اس سے پہلے کہ کوئی اور اس سے متعلق بات کرتا علی نے کہا۔ "اب پلیز اس موضوع پر مزید بات نہیں ہوگی۔"

"او کے......!" اس لڑکی نے کہا اور چل دی تبھی فرزانہ بولی۔

"علی......! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے تھوڑا وقت دو گے؟"

فرزانہ کے لہجے میں وہی تذبذب، لرزش اور لجالت تھی۔ علی نے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

"ہاں......!"

"تو آؤ......! باہر کھلی فضا میں بیٹھتے ہیں۔" فرزانہ نے فوراً ہی کہا اور چل دی۔ تب علی بھی اس کے پیچھے دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا چلا گیا۔

دونوں کینٹین سے باہر لان میں درخت کے تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں گھنی چھاؤں تھی۔ فرزانہ بیٹھتے ہی ویٹر کو جوس کا آرڈر دے چکی تھی، اتنے میں علی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ تب سے خاموش تھا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، جبکہ فرزانہ اسی تذبذب میں تھی کہ وہ کوئی بات کرے تو اس کے جواب میں اپنی کہے۔ مگر وہاں تو ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ یوں کتنا ہی وقت خاموشی میں گزر گیا تھا، یہاں تک کہ ویٹر ان کے سامنے جوس بھی رکھ گیا۔ جسے ان دونوں نے چھوا بھی نہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی اعصابی جنگ ہو اور دونوں ہی اس جنگ کو جیتنا چاہتے ہوں۔ اور پھر فرزانہ کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے بہ مشکل کہا۔

"علی......! میں بہت شرمندہ ہوں، تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

"تم نے کچھ دیر پہلے سنا نہیں، میں نے ان سب کو معاف کر دیا ہے جو بھی اس حادثے کے ذمہ دار تھے۔ اس میں کوئی بھی تھا۔" علی نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی میں بہت......"

"بھول جاؤ فرزانہ......! کچھ بھی کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔" علی نے تحمل سے کہا۔

"لیکن علی......! میں...... اب بھی تم سے پیار کرتی ہوں۔ میرے دل میں اب بھی تمہارے لئے کہیں زیادہ محبت ہے۔ میری سمجھ میں جو آیا تھا۔ میں نے ویسے ہی بے وقوفی کی۔ کیا تم مجھے سزا نہیں دو گے۔ میں تمہاری زندگی سے کھیلی ہوں علی......!" فرزانہ نے بے ترتیب سے انداز میں الجھتے ہوئے کہا۔

"محبت......!" علی نے کہا اور ایک طویل سانس لی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ "مجھے محبت سے انکار نہیں ہے، نہ پہلے تھا، نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوگا (مگر کیا ہم اس اہل ہیں کہ کسی سے محبت کر سکیں؟")

"کیا مطلب......؟" فرزانہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"سمپل سی بات ہے فرزانہ......! میرے خیال میں اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ اور میرے ہی خیال میں تم اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں روک دوں کہ مجھ سے محبت نہ کرو۔ اور اس طرح مجھے بھی یہ حق ہے کہ میں کسی سے محبت کروں یا نہ کروں۔"

"مگر محبت تو ایک فطری جذبہ ہے، یہ کسی پلاننگ سے تو نہیں ہوتا، یہ تو بس ہو جاتا ہے کیا کسی کا بس ہے اس میں......؟" فرزانہ نے احتجاجاً کہا۔

"وہی نا......! تو اس کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو کہ ہم اگر محبت کا جواب چاہتے ہیں تو یہ جواباً محبت بھی تو فطری بات ہے۔ ہوگی تو ہوگی، نہ ہوئی تو نہ سہی۔"

"لیکن کیا میری محبت رائیگاں جائے گی......؟" فرزانہ نے انتہائی مایوسی کے عالم میں دھیرے سے کہا۔

"(محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اسی لئے تو میں نے کہا ہے کہ خود پر نگاہ ہی نہیں کرتے۔ کیا ہم اتنی ہمت، اتنا حوصلہ رکھتے ہیں کہ نتائج کو کھلے دل سے قبول کر لیں۔ ہجر، وصال دونوں ہی ہیں۔ اور پھر یہ نصیب کی بات ہے۔ کس کے حصے میں کیا آتا ہے۔ محبت کے لئے اہل ہونا ہی سب سے بڑی منزل ہے۔")

"علی......! پہلے تو مجھے شک تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ تم بہت بدل گئے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟" فرزانہ نے دبی دبی حیرت سے پوچھا تو علی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ تو فرزانہ تیزی سے بولی۔

"یہ......اچانک......ابھی تو میں نے تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں، تم......"

"مجھے چھوڑو......! بس اپنے آپ پر غور کرو۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ تم کسی سے بھی محبت کرنے کی اہل ہو؟" علی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔ وہ ہونقوں کی طرح علی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جس وقت اسے ہوش آیا، وہ بہت دور جا چکا تھا۔ وہ آخری فقرہ ایک تازہ گلاب کی طرح اسے تھما گیا تھا جس کی خوشبو سے وہ پوری جان سے مسحور ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں جیسے ساری سوچیں تحلیل ہو گئی ہوں اور وہاں فقط اس کی بات کی خوشبو پھیل گئی ہو۔

☆☆☆

ڈھلتی ہوئی دوپہر میں روہی کی تپش اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں کچی بستی سے باہر جنڈ کے بڑے درخت کی گھنی چھاؤں تلے میاں جی ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے یہیں اچھی خاصی محفل جما کرتی تھی۔ لوگ میاں جی کے پاس آ جاتے اور گفتگو کا سلسلہ دراز ہو جاتا۔ لیکن سانول کے قتل ہو جانے کے بعد بہت ہی کم لوگ میاں جی کے پاس آتے تھے۔ یہاں تک کہ اب وہ سارا دن تنہا ہی ہوتے۔ صرف نماز پڑھنے مسجد جاتے۔ مغرب ہو جانے کے بعد عشاء تک وہیں رہتے اور پھر مسجد سے ملحقہ حجرے میں چلے جائے۔ اکثر وہ اپنی شب مسجد میں ہی گزارتے تھے۔ رزق کے معاملے میں وہ بہت قناعت پسند تھے۔ مل گیا تو الحمدللہ......! نہ ملا تو سبحان اللہ۔ بس یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ چند دنوں سے ایک چھوٹا سا بچہ آتا اور انہیں دوپہر کے وقت کھانا دے کر چلا جاتا۔ پہلے دن انہوں نے پوچھا تھا کہ یہ کھانا کس نے بھجوایا ہے تو اس بچے نے صرف اتنا کہا تھا "مہرو نے"۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اگلا سوال نہیں کیا تھا۔ تاہم انہوں نے اس پر بہت کچھ سوچا تھا کہ آخر مہرو کے دل میں کیا آئی تھی کہ اس نے ایسا کیا۔ اس دوپہر بھی وہ لاشعوری پر اس بچے کے انتظار میں تھے جو ابھی تک نہیں آیا تھا۔ عصر ہو جانے میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ انہی لمحات میں انہیں دور سے مہرو آتی ہوئی دکھائی دی۔ لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم وہ انہی کی جانب بڑھ رہی تھی یہاں تک کہ وہ ان کے پاس آ گئی اور بڑے ادب سے سلام کیا۔ میاں جی نے سلام کا جواب دے کر اسے دعائیں دیں تو اس نے کھانے کی پوٹلی آگے کر دی۔

"میاں جی......! آپ کے لئے۔"

"آج وہ بچہ کیوں نہیں آیا۔" میاں جی نے وہ پوٹلی پکڑتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ آج میں نے آپ کے پاس آنا تھا۔ میں نے آپ سے باتیں کرنی ہیں۔" مہرو نے دھیمے سے لہجے میں ادب سے کہا۔

"باتیں......؟" میاں جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا، چند لمحے سوچتے رہے اور پھر بولے۔ "کیسی باتیں کرنی ہیں، بیٹی مہرو؟" یہ کہتے ہوئے میاں جی نے کھانے کی پوٹلی ایک جانب رکھ دی۔

"میاں جی......! کوئی ایک بات تو ہے نہیں، آپ کو پتہ ہے نا کہ بندے کی سوچیں کتنی ہوتی ہیں۔ اچھی بھلی زندگی گذر رہی تھی، اچانک یہ سب ہو گیا۔ کتنا کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اب تو

باتیں ہی رہ گئی ہیں نا۔" مہرو نے رندھے ہوئے گلے سے غم ناک لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹی......! تو ٹھیک کہتی ہے۔ قصور کسی کا بھی نہیں لیکن نفرتیں اس کچی بستی میں ہی نہیں، اس پورے علاقے میں اپنا آپ منوا رہی ہیں جب ظلم، خوف اور خود غرضی کی ہوائیں چل رہی ہوں تو وہاں نفرت پھیل ہی جاتی ہے۔" میاں جی نے دکھ بھرے انداز میں کہا تو مہرو بولی۔

"میاں جی......! کسی کا کیا گیا، زندگی تو میری تباہ ہوگئی۔ سانول کی محبت نے تو میرے دامن میں سارے زمانے کی نفرتیں ڈال دی ہیں۔ سانول تو چلا گیا لیکن میں زندہ ہوں مگر شاید یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔"

"حوصلہ رکھو مہرو......! اللہ سائیں نے سب ٹھیک کر دینا ہے۔ کیا تمہیں اس کا یقین نہیں، کیا تم اپنا سبق بھول گئی ہو؟" میاں جی نے اپنے لہجے کو پرعزم بناتے ہوئے مہرو کو تسلی دی۔

"سبق تو سارے ہی بھول گئے ہیں۔" مہرو نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا جیسے وہ کہنا کچھ چاہتی ہو لیکن کہہ کچھ رہی ہو۔ پھر چونکتے ہوئے بولی۔ "میاں جی......! میں نے سوچا تھا کہ میں اس کچی بستی کی ہی نہیں، اس پورے علاقے میں اکیلی پڑھی لکھی لڑکی ہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کس طرح حالات کا مقابلہ کیا ہے، مگر میاں جی......! اس علاقے کی ہوائیں جو ہیں نا، اس میں کچھ ایسا زہر ہے جو......"

"نہیں اتنا مایوس نہیں ہوتے بیٹی اور نہ ہی اتنا تلخ ہو جاؤ کہ تمہارے اپنے اندر نفرت کا زہر پھیل جائے۔ نہ......نہ میرا بچہ......! میرا سبق نفرت تو نہیں ہے۔"

"پھر میرے ساتھ ہی نفرت کیوں......؟ میری سگی خالہ نے منگنی توڑ کر مجھے دھتکار دیا۔ میرے بھائی رب نواز نے اپنی غیرت میں آکر سانول کا قتل کر دیا۔ میں نے اسے نہیں کہا تھا کہ وہ سانول کو قتل کر دے۔ سانول مجھے اغواء کر کے لے گیا، تو لوگ طعنے مہنے یہ دیتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر بھاگی تھی، اور ایک رات......! محض ایک رات اس کے ساتھ ویرانے میں رہنے کا خمیازہ شاید اب میں ساری زندگی بھگتوں گی۔ حالانکہ سانول نے ایک بار بھی میلی آنکھ سے میری طرف نہیں دیکھا۔" مہرو یہ کہتے ہوئے رو دی تو میاں جی نے کہا۔

"مہرو......! یہ جان لو کہ جو کچھ کسی کے پاس ہوتا ہے نا، وہ تو وہی دے سکتا ہے نا، ان کے پاس نفرت کے سوا کچھ نہیں تو وہ نفرت ہی دیں گے۔"

"مگر میاں جی......! میرے پاس تو محبت بھی نہیں ہے۔" مہرو نے انتہائی دکھ سے کہ

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تبھی میاں جی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی اگر تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہو تو کیا تم اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دو گی۔" میاں جی نے کہا تو مہرو چونک گئی۔ اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"کون ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے؟"

"اللہ سائیں......!" میاں جی نے کہا اور پھر لحہ بھر مہرو کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا تم اللہ سائیں کی محبت کے بارے میں نہیں جانتی ہو جو وہ اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر تم بھی اللہ سائیں سے محبت کرو گی تو اس یقین کے بعد دنیا بھر کی نفرت تمہارے سامنے کیا حیثیت رکھے گی۔ اس کا تصور کر سکتی ہو تم......؟" میاں جی کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ جس سے مہرو پوری جان سے لرز گئی۔ اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ یونہی خاموش رہی تو میاں جی کہتے چلے گئے۔ "مہرو بیٹی......! ہمیں اور ہمارے اردگرد انسانوں کو اپنے بارے میں پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ کیا ہیں، ان کا اصل مقصد کیا ہے، یہاں اس دنیا میں آنے کا۔ اک سیدھی سی بات اپنے ذہن میں رکھو۔ اگر ہم ایک چھوٹی سی شے بھی بناتے ہیں نا تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اب انسان کی تخلیق اللہ سائیں نے کی ہے تو اس کا مقصد تو ہے۔ کیا ہے؟ بحث اس سے نہیں، بات اصل میں یہ ہے کہ جب ہم اس کی طرف رجوع کریں گے تو ہی وہ ہمیں اپنے مقصد کی جانب خود بخود بھیج دے گا۔"

"تو میاں جی......! میں بھی کسی مقصد کے لئے یہاں اس دنیا میں ہوں۔" مہرو نے حیرت سے کہا۔

"ہاں......! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کسی بھی عمارت میں ہر اینٹ پوری عمارت نہیں ہوتی، مگر پوری عمارت کا وجود انہی اینٹوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کون سی اینٹ کہاں لگی۔ عظیم عمارتوں میں اینٹیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کچی، ادھ پکی اینٹ عظیم عمارتوں کے لئے نہیں ہوتیں۔ اس وقت جو صورت حال ہے، تم اسے جس نگاہ سے دیکھو، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ حالات کسی عظیم عمارت کی تخلیق کی طرح ہیں، جس میں تم اور میں کسی اینٹ کی مانند ہیں۔ یہ فیصلہ وقت نے کرنا ہے، تمہاری جگہ کہاں تھی اور میری جگہ کہاں۔ اور یہ بھی ممکن ہے عمارت بنانے والا مہندس ہمیں قبول ہی نہ کرے۔" میاں جی نے دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"کیا ہم اتنے ہی مجبور محض ہیں۔"

"یہ تو ہم سمجھتے ہیں نا، بات تو راضی بہ رضا ہونے کی ہے اور اس کا صحیح عمل یہ ہے کہ بس خود کو قبول ہو جانے کے قابل بنانے کے لئے کوشش کرتے رہنا۔" میاں جی نے حتمی سے انداز میں کہا تو مہرو سوچوں میں کھو گئی جیسے میاں جی نے کوئی گتھی اس کے سامنے رکھ دی ہو اور وہ اسے فوراً ہی نہیں سلجھانا چاہتی ہو۔ اک تصور جو اس کے ذہن میں بن گیا وہ ابھی تک اسی میں الجھی ہوئی تھی۔ کوئی ایک ایسی بات تھی جو وہ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہنا ہے۔ اسے اپنا وجود بے وزن محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوچ کس قدر طاقتور ہوتی ہے، وہ نہ صرف اس وجود کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس میں یہ ہوتی ہے بلکہ باہر کی دنیا کو بھی تبدیل کر دینے کی قوت رکھتی ہے۔ روہی کی اس کچی بستی میں رہنے والی جو ابھی اپنا سبق بھی اٹک اٹک کر پڑھتی تھی۔ اسے شعور ہی نہیں تھا کہ ابھرنے والی سوچ کے ساتھ اس میں تبدیلی کا عمل کس حد تک شروع ہو گیا ہے۔ سوچ تو وہ احساس کی لہر ہے جو شعور کو وجود دینے کی قوت رکھتی ہے۔ یہ ساری باتیں تو عالموں کے مباحث میں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ لیکن انسانی وجود میں تو فطری معاملات چلتے رہتے ہیں۔ وہ انسانی وجود شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ مہرو بھی کچھ ایسے ہی عمل سے گزر گئی۔ اک احساس تھا جو پورے وجود پر اپنے اثرات دکھا رہا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ تو اس بات کی تلاش میں تھی جو کہنا چاہتی تھی لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا بات ہے، تب اچانک اس نے کہا۔

"میاں جی......! کیا علی کا یہاں آنا اور پھر چلے جانا بھی کسی ایسے مقصد......" اس نے الجھے ہوئے انداز میں پوری بات کہنا چاہی لیکن صحیح طرح سے کہہ نہیں پائی۔ تب میاں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو......اور یہ بھی ممکن ہے نہ ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرے اور ہو سکتا ہے وہ آ جائے...... بیٹی......! میں نے کہا ہے نا کہ حالات گزرتے چلے جاتے ہیں اور یہ وقت فیصلہ کرتا ہے کہ کون، کس جگہ، کیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے، مہرو الجھی رہی۔ تب انہوں نے کہا۔

"زیادہ دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔ تمہیں سب سمجھ میں آ جائے گا۔ بس اللہ سائیں سے اپنے غم کہو۔ اللہ سائیں سے کہو کہ ربا تو ہی میرے حال کا محرم ہے۔ وہ سارے معاملات ٹھیک کر

دینے والا ہے۔ وہ قادر ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹی......! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میاں جی نے کہا تو مہرو اٹھتے ہوئے بولی۔

"میاں جی......! میں اب چلتی ہوں۔ میرے لئے دعا کیجئے گا۔"

"تم اپنے لئے سب سے اچھی دعا کر سکتی ہو۔ اللہ سائیں سے ساری باتیں کر لو......!"

میاں جی کے یوں کہنے پر مہرو نے ان کی طرف دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے وہاں سے چل دی اور میاں جی نجانے کیا سوچنے لگے۔

☆☆☆

تھکا ہوا پیر سیدن شاہ اپنے اس کمرہ خاص میں آ بیٹھا جو جدید طرز پر سجا ہوا تھا۔ اور اس میں چند مخصوص لوگوں کے علاوہ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا مرید خاص پیراں دتہ مودب انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"پیر سائیں لگتا ہے کہ آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔" پیراں دتہ نے ادب سے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو پیر نے خیالوں میں کھوئے ہوئے لطف لینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں......! تھکن تو بہت ہو گئی ہے لیکن مزہ بھی تو بہت آیا ہے نا شکار کا۔"

"سائیں......! کتے بھی میں نے بہت شوق سے پالے ہیں۔ بڑی محنت کی ہے ان پر۔" پیراں دتہ نے داد طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں......!" سیدن شاہ نے ہنکارا بھرا پھر بولا۔ "ٹھیک ہیں......مگر وہ......کیا نام ہے اس کا، ہاں......بھورل......! وہ تو مجھے آج بیمار سا لگا ہے، اس میں پہلے والی تیزی نظر نہیں آئی پیراں دتہ......؟"

"سائیں......! وہ بھورل بیمار نہیں ہے، ویسے ہی وہ زیادہ عمر کا ہو گیا ہے۔" پیراں دتہ نے دھیمے سے انداز میں کہا تو سیدن شاہ انتہائی نخوت سے بولا۔

"تو پھر کیوں رکھا ہوا ہے اس کو، ختم کر دو اسے، اور اس کی جگہ کوئی نیا نسل دار کتا لاؤ۔ تمہیں تو پتہ ہے پیراں دتہ جو شے ہمارے کام کی نہ رہے ہم اسے اپنے پاس برداشت نہیں کرتے۔"

"جی سائیں......! میں آج ہی اسے گولی مار دوں گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ اتنے

میں ایک ملازمہ نے باہر دروازے پر دستک دی۔ پیراں دتہ فوراً اس طرف لپکا اور پھر مشروبات کی
ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے واپس آ گیا۔ اس نے ایک گلاس بھرا اور سیدن شاہ کو دیتے ہوئے کہا۔

”سائیں......! نئے کتے سے مجھے یاد آیا، وہ رب نواز کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”وہ......!“ سیدن شاہ نے کہا اور پھر گلاس سے گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

”تمہارے خیال میں کیسا بندہ ہے وہ......؟“

”ہے تو کام کی چیز......! لیکن اس میں اکڑ بہت ہے۔ بہادر ہے، جی دار ہے، لیکن اپنی من مانی کرنے والا ہے۔ اسے اپنے انداز میں لانے پر تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔“ پیراں دتہ کو یہ سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ رب نواز کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے تھوڑا لڑکھڑا گیا تھا۔ سیدن شاہ نے اس کی طرف دیکھا اور گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ کام کا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے ہماری حویلی کے قریب بھی نہ پھٹکنے دینا۔ وہ جو شہری لڑکا علی تھا، اس کے پیچھے اگر پولیس آ سکتی ہے تو رب نواز نے پھر بھی قتل کیا ہے۔ اس کا معاملہ سیدھا نہیں ہے۔ میں علاقے میں تھوڑی بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔“

”جی سائیں......! میں نے سنا ہے کہ خان محمد بھی سر اٹھا رہا ہے، پولیس اس رات اس کے ڈیرے پر سے ہو کر گئی ہے۔“ پیراں دتہ نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر......“ سیدن شاہ نے سوچتے ہوئے کہا، چند لمحے یوں خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”کوئی کچھ کرتا پھرے، رب نواز نے سانول کو قتل کیا ہے۔ اور اس کا مدعی کوئی نہیں۔ صرف وہ مائی فیضاں ہی ہو سکتی ہے، اگر ہوئی تو......! تم کسی وقت اسے سمجھا دینا۔ ویسے اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

”پیر سائیں......! گستاخی معاف ہو تو اک بات کہوں۔“

”بولو......!“ سیدن شاہ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کبھی آپ کو ایسے چھوٹے موٹے قتل پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ معاملہ ہمارے بارے میں بھی نہیں لیکن پھر بھی......!“ اس نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ جس پر سیدن شاہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے سمجھاتا ہوا بولا۔

”یہ معاملہ اس طرح نہیں ہے، جس طرح تم سمجھ رہے ہو۔ پہلی بار پولیس نے میر

حویلی میں قدم رکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بات صرف قتل کی نہیں، اس علاقے پر ہماری حکومت کی ہے۔“

”نا سائیں نا......! اس علاقے پر سے آپ کی حکومت کبھی ختم نہیں ہو سکتی، کس میں اتنا دم خم ہے، اور آپ کے تو مرید ہی اتنے ہیں کہ آپ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے وہ اپنی جان دے دیں گے۔ وہ تو شہری لڑکے کی وجہ سے یہاں آ گئے۔ ظاہر ہے آپ کی اجازت کے بغیر......“

”نہیں پیراں دتہ نہیں......! اس پولیس آفیسر کی آنکھ کو تم نے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ اس کے لہجے میں آگ کی تپش تھی۔ اور یہ آگ یونہی نہیں تھی اسے جلانے والا کوئی اور ہے۔ خان محمد یونہی سر نہیں اٹھا رہا......!“ یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

”خیر......! جتنا بڑا طوفان بھی آ جائے ہم میں اتنی طاقت ہے کہ اسے روک سکیں۔ مگر تم علاقے پر اب گہری نگاہ رکھو......! کون کیا کر رہا ہے، یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔“ سیدن شاہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی سائیں......! جیسے حکم سائیں کا۔“ پیراں دتہ نے تقریباً جھکتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے زیادہ کس کی نظر ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے......! اب تم جاؤ......اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ سیدن شاہ نے کہا اور نیم دراز سا ہو کر سوچنے لگا۔

پیراں دتہ جا چکا تھا۔ اس کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ اور اس خاموشی میں سیدن شاہ سوچ رہا تھا کہ ایک طویل عرصے بعد اسے کسی مزاحمت کا سامنا ہو جانے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ورنہ جب سے وہ گدی نشین ہوا تھا، ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ یہیں پلا بڑھا تھا لیکن جیسے ہی وہ سکول جانے کے قابل ہوا، اسے بہاول پور شہر میں نوکروں کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ اس کا تعلیمی سفر چلتا رہا اور یہاں تک کہ وہ برطانیہ پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ ان دنوں وہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد برطانیہ میں ہی رہائش رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے وہاں سے واپس آنا پڑا۔ وہ تمام وعدے جو وہ اپنی محبت سے کر چکا تھا وہیں اس محبت کے ساتھ ہی رہ گئے۔ جدائی کی کسک اور اپنی محبت سے ڈھیر سارے وعدے کر کے وہ اپنے آبائی علاقے میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی اسے پتہ چلا کہ اس کا باپ شدید علیل ہے، چند دنوں میں چل چلاؤ ہے۔ اور انہی چند دنوں میں نہ صرف خاندان میں اس کی شادی کر دینے کی کوشش کی گئی لیکن وقت نے اجازت نہیں

دی۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں ہی اسے اپنی گدی پر بٹھا دیا۔ برطانیہ کا تعلیم یافتہ شخص، اپنی خاندانی روایات اور جائیداد کے لئے سب کچھ من وعن مانتا چلا گیا۔ کچھ ہی ہفتوں میں اس کا باپ اگلے جہان سدھار گیا تو تمام تر اختیارات اس کے پاس آ گئے۔ تب اسے پتہ چلا کہ جہاں وہ اس علاقے پر حکومت کا اختیار رکھتا ہے۔ ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے اس کا وجود تسلیم کر لیا ہے۔ وہاں وہ اپنی روایات اور خاندانی معاملات میں جکڑ کر رہ گیا ہے۔ لیکن محبت کی کسک اس کے دل میں رہی اور وہ واپس برطانیہ چلا گیا۔ اس کی محبت اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے تمام تر معاملہ اس کے سامنے رکھا۔ وہ وہیں مقیم رہنے اور اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ یوں سلسلہ چلتا رہا۔ سال میں فقط دو ماہ برطانیہ اور باقی وقت یہیں گزارتا ہوا وہ زندگی کی راہ پر چلتا رہا۔ برطانیہ میں اس کے دو بچے جن میں ایک لڑکی اور دوسرا لڑکا تھا پرورش پاتے رہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن رہا لیکن طاقت نے اسے اپنی راہ پر چلایا۔ طاقت وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے جو عزت، مرتبہ اور مقام اسے مل رہا تھا، وہ اسے دنیا کے کسی کونے میں بھی نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ ابرو کے اشارے پر حکم کی تعمیل، لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے اور من مرضی جس کے آگے کوئی بولنے والا نہیں تھا۔ اسی طاقت کے احساس نے اسے یہیں رہنے پر مجبور کر دیا۔ روحانی پیشوا، جاگیردار اور سیاست دان کی تکون نے اس کی شخصیت میں جہاں سختی پیدا کر دی تھی، وہاں طاقت کے حصول کی ہوس مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ کسی ایسے عنصر کو برداشت ہی نہیں کرتا تھا جس کے بارے میں اسے معمولی سا بھی شک ہو کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے زندگی میں بے شمار غلطیاں کی تھیں لیکن مزاحمت نہ ہونے کے باعث وہ ہمیشہ سے یہ ایک خاص ڈگر پر چلتا چلا آ رہا تھا۔

وہ مسلسل اس معمولی سے واقعے پر سوچ رہا تھا، جس کے پیچھے اسے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ اس خطرے کو پنپنے سے پہلے ہی ختم کر دے یا پھر اسے آخری حد تک جانے دے تاکہ اسے معلوم تو ہو کہ یہ سب کہاں سے اور کیسے ہو رہا ہے۔ یا پھر سرے سے اس کی اہمیت ہی نہیں ہے؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ تھکے ہوئے اعصاب نے اس کا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے یہی سوچیں دھندلی ہوتی چلی گئیں اور وہ خوابوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ نجانے کب اسے نیند آ گئی۔

☆☆☆

تپتی ہوئی دوپہر میں، صحن کے درمیان لگے درخت کے نیچے جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھی اماں فیضاں مسلسل سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اسے ایک فیصلہ کرنا تھا جو اس کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ ایک طرف اس کا وہ بیٹا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور دوسری جانب وہ بیٹا جو ابھی لڑکا تھا، جس نے ابھی دنیا دیکھنا تھی اور وہی اس کا واحد سہارا تھا۔

شاید وہ سانول کی موت کو تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کر صبر کر لیتی۔ لیکن پرسکون ہوتی ہوئی جھیل میں خان محمد میں پتھر آن مارا تھا۔ وہ بھیرے کے ساتھ ریوڑ چراتے ہوئے ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ستا رہی تھی کہ اس کے پاس خان محمد کی بڑی ساری جیپ آن رکی اور اس میں سے وہ نکلا تو اماں فیضاں اسے پہچان پائی، اس کے گارڈ کافی دور کھڑے رہے جبکہ وہ اماں کے پاس وہیں زمین پر آن بیٹھا تھا۔ کچھ دیر حال احوال لینے کے بعد اس نے کہا۔

''اماں......! یہ نہیں پوچھے گی کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟''

اس کے یوں کہنے پر اماں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''خان محمد کیا تو میرے پاس آیا ہے، میں تو سمجھی تھی کہ ادھر سے گزر رہے تھے اور......''

''اماں......! میں سخت شرمندہ ہوں کہ میں سانول کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا۔ اس کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ کیا تھیں، میں اس بحث میں نہیں پڑتا لیکن جو رب نواز نے سانول پر، تم پر اور بھیرے پر ظلم کیا ہے، وہ میرے ضمیر پر ایک بوجھ کی صورت بنتا چلا جا رہا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اماں نے پوچھا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں اماں کہ رب نواز نے یہ جو ظلم کیا ہے اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔'' خان محمد نے جذباتی انداز میں کہا تو اماں ایک دم سے گھبرا گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم، کیا تمہیں نہیں پتہ کہ وہ اس وقت سیدن شاہ کے پاس ہے، اس کی پناہ میں ہے؟''

''پتہ ہے، جانتا ہوں میں، لیکن کیا پیر سیدن اس علاقے کا ان داتا ہے، اماں کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ سانول کے خون کا بدلہ لیا جائے۔ اور وہ قاتل پورے علاقے میں دندناتا پھرے......! کیسی ماں ہو تم......! اپنے جگر کے ٹکڑے کے قاتل کو اپنی نگاہوں کے سامنے پھرتا ہوا دیکھتی رہو گی۔'' خان محمد نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

"میں ماں ہوں خان محمد......! کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ میرے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی ہے یہ تو ایک ماں ہی اندازہ لگا سکتی ہے کہ وہ جس بیٹے کے سر پر سہرا سجانے جا رہی ہے، اسی کو کفن پہنانے پر مجبور ہو جائے۔ میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔" اماں فیضاں کے اندر کی آگ اچانک بھڑک اٹھی تو بگولوں کی صورت لفظ اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے۔

"میں سمجھتا ہوں اماں کہ تم ایسا کیوں نہیں کر پا رہی ہو۔ مت ڈرو، میں دوں گا تمہارا ساتھ۔"

"لیکن خان محمد......! جب تک سیدن شاہ کا سایہ اس پر قائم ہے، کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تو پھر خواہ مخواہ دشمنی لینے کا فائدہ۔ وہ میرے معصوم بھیرے کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" اماں فیضاں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"اماں......! اب حالات وہ نہیں رہے، بس تمہاری ہاں چاہیے، میں دیکھ لوں گا سب کو، وہ چاہے رب نواز ہے یا پھر سیدن شاہ۔" خان محمد نے غراتے ہوئے کہا جیسے ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے سامنے ہوا تو وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ اس پر اماں نے شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کرنا ہے مجھے، میری ہاں کے بارے میں معلوم نہیں ہے تمہیں؟" اس کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔ ایک لمحہ توقف کے بعد بولی۔ "خان محمد تم ہی بتاؤ، میں مجبور لاچار عورت کیا کر سکتی تھی۔"

"اماں......! جہاں تک ڈر خوف کی بات ہے، تُو میرے پاس چل، کسی کی جرأت نہیں کہ تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ تم مجبور نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے، تم صرف پولیس کے سامنے جا کر ایک بار بیان دے دو۔ پرچہ کٹ جائے گا۔ پھر میں جانوں اور میرا کام......!" خان محمد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تب اماں سوچ میں پڑ گئی اور کچھ ہی لمحوں میں وہ پوری جان سے لرز گئی۔ جیسے تصور میں اس نے نجانے کیا تباہی دیکھ لی ہو۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ خان محمد نے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھا اور اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ "اماں......! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ فقط تیرے سانول کا ہی بدلہ نہیں ہوگا۔ اور پتہ نہیں یہ کتنوں کی زندگیوں سے کھیل چکے ہیں۔ اور نجانے کب تک یہ ظلم کرتے رہیں گے۔ ان کے بارے میں سوچو۔ آئندہ یہ......"

"بس پتر خان محمد بس......! میری سوچ جواب دے گئی ہے۔"

"مجھے پتہ تھا اماں کہ تم فوراً فیصلہ نہیں کر سکتی ہو۔ سوچ لو، اچھی طرح سوچ لو، پھر جو تمہارا فیصلہ ہوگا مجھے بتا دینا۔" خان محمد نے کہا اور اٹھ گیا۔ اماں اسے جاتے ہوئے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ چلا گیا۔

اگلے دن اس کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ وہ ریوڑ کے ساتھ جا سکے۔ وہ ساری رات نہیں سو سکی تھی۔ صبح نور کے تڑکے ہی اس نے کھانا بنا کر بھیرے کو دے دیا اور وہ ریوڑ لے کر نکل گیا۔ تب سے وہ اکیلی بیٹھی یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کرے۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بات یہ نہیں تھی کہ اسے خان محمد پر بھروسہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سیدن شاہ کے مقابلے میں کھڑا ہو سکتا ہے، لیکن اسے اتنا ہی یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس کے مقابلے میں کھڑا نہیں رہ پائے گا۔ اماں فیضاں چاہے کچی بستی کی اُجڈ اوران پڑھ عورت تھی مگر یہ جانتی تھی کہ سیدن شاہ ہی نہیں اس کے بڑے بھی یہاں حکومت کرتے رہے ہیں۔ اتنی زندگی میں اس نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ ایک طرف یہی خوف تھا کہ اگر اس نے خان محمد کے کہنے پر سر اٹھا لیا تو نہ صرف وہ نہیں رہے گی بلکہ اس کا بیٹا بھیرا بھی اس کے ظلم کا شکار ہو جائے گا۔ تب سانول کا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا۔ وہی سانول جو شادی سے بار بار انکار کر رہا تھا اور وہ زور دے کر اسے منا رہی تھی۔ اسے سب سے بڑا دکھ یہی تھا کہ اس بستی کے لوگ جو سانول کی شادی پر تو خوشیوں میں شریک تھے لیکن اس کے جنازے میں فقط سیدن شاہ کے خوف سے شامل نہیں ہوئے۔ کیا سانول کا ان پر اتنا بھی حق نہیں تھا؟ جب یہ سوچتی تو بدلے کی آگ اور بھڑک اٹھتی۔ وہ اس قدر بے حال ہو جاتی کہ صبر و تحمل کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کا دل چاہتا کہ ہر ایک کا گریبان پکڑ کر پوچھے کیا تم مرنے والوں کو بھی معاف نہیں کر سکتے، سانول نے اتنا کیا ظلم کر دیا تھا کہ تم نے اس کی لاش تک سے اپنا بدلہ لیتے رہے۔ دوپہر بھی ڈھل گئی تھی۔ اور اماں انہی سوچوں میں کھوئی رہی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ اس وقت میاں جی نے مسجد سے اذان کی صدا بلند کی تو اسے ہوش آیا۔ وہ اٹھی اور نماز کے لئے تیاری کرنے لگی۔

اسی رات جب بھیرا اپنی ماں کے پہلو میں پڑی چارپائی پر آ کر لیٹا تو اماں فیضاں نے اس سے پوچھا۔ "آج تو بہت تھک گیا ہوگا نا؟"

"نہیں اماں......! مجھے کوئی تھکن نہیں ہوئی۔" بھیرے نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ماں کا کلیجہ پھٹ گیا، کس قدر مجبوری تھی اس بات میں۔ تب اس نے انتہائی لاڈ سے پوچھا۔

"کیوں بھیرا، کیوں نہیں ہوئی تھکن۔"

"اماں......! مجھے پتہ ہے کہ اب یہ کام میں نے اکیلے ہی کرنا ہے تو پھر کیسی تھکن۔" بھیرے نے کہا تو اماں کے دل کو جیسے کسی نے پکڑ لیا ہو۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ نہ بول سکی۔ تب بھیرے نے کہا۔ "اماں......! آج مجھے بھالا سانول بہت یاد آیا۔"

"کیوں۔" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ آج رب نواز آیا تھا میرے پاس اور پوچھ رہا تھا کہ خان محمد کیا کرنے آیا تھا۔ میں نے جب کچھ نہیں بتایا تو اماں اس نے مجھے بڑی گالیاں دیں۔ ممکن ہے وہ مجھے مارتا لیکن اس کے ساتھ پیراں دتہ بھی تھا، اس نے روک دیا۔" وہ اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔ تب اماں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"اتنی بڑی بات ہوگئی اور تو مجھے اب بتا رہا ہے۔"

"تم کیا کر لیتی اماں......! اگر میں تمہیں پہلے بتا دیتا۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہیں دکھ ہوا ہوگا۔ لیکن اگر نہ بتاتا تو شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ دکھ ہوتا۔" بھیرے نے کہا تو اماں خاموش ہوگئی جیسے اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ ہو۔ تب اس نے کہا۔ "اماں......! بھالا علی ہمارے پاس تھا نا تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کیا اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

"پتہ نہیں پتر......! آئے گا بھی کہ نہیں۔ وہ ہم سے ناراض ہے، ہم نے ہی تو اسے یہاں سے بھیجا ہے وہ کون سا جا رہا تھا۔"

"اماں...... کہیں اسے بھیج کر ہم نے غلطی تو نہیں کی۔"

"نہیں......! وہاں شہر میں اس کا سب کچھ ہے۔ میں کسی ماں کے لعل کو اپنے پاس کیوں رکھوں، صرف اپنی مجبوریوں کے لئے، نہیں......!" یہ کہہ کر اس نے بھیرے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دھیمے سے لہجے میں کہا۔ "تو فکر نہ کر میرا پتر......! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" اماں نے ایک عزم سے کہا تھا، اور دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگی۔

سارے دن کا تھکا ہوا بھیرا جلد ہی سو گیا لیکن اماں کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔

اگلے دن جب بھیرے نے ریوڑ نکالا تو اماں فیضاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ کچی بستی

سے نکلنے کے بعد اماں ریوڑ کو ایسے راستے پر لے آئی جو خان محمد کی بستی کی طرف جاتا تھا۔ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر اماں نے بھیرے سے کہا۔

"تم یہاں ریوڑ چراؤ......! میں ابھی آتی ہوں۔"

"کہاں جا رہی ہو اماں......؟" بھیرے نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھ کسی سے کہنا مت......! میں خان محمد کے پاس جا رہی ہوں۔ اس سے وہی کچھ کہنے جو وہ ہمیں کہنے آیا تھا۔ مجھے بس آنے اور جانے میں وقت لگے گا۔ میں نے وہاں ٹھہرنا نہیں ہے۔" اماں نے کہا اور ایک اونٹ کو پکڑ کر بٹھانے لگی۔ پھر اس پر سوار ہو کر اس کا رخ خان محمد کی بستی کی طرف کر دیا۔ بھیرا مطمئن سا ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کو اس وقت تک جاتا ہوا دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ وہ اس قدر اطمینان سے ریوڑ چرانے لگا جیسے اماں کے فیصلے میں اس کی بھی خوشی ہو۔

☆☆☆

سیدن شاہ اپنے اس کمرے میں موجود مسند پر بڑے کروفر سے بیٹھا ہوا تھا، جہاں وہ اپنے مریدین سے ملا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے سامنے کوئی مرید نہیں بلکہ ڈی ایس پی رفاقت باجوہ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے کوئی فتح کے قریب ہونے کا یقین رکھتا ہو۔ سیدن شاہ کے چہرے پر فطری نخوت تھی۔ وہ خاموش تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ رفاقت باجوہ اپنی بات کہے۔

"شاہ جی......! معذرت خواہ ہوں کہ مجھے دوبارہ آپ کو زحمت دینا پڑی۔ لیکن مجبوری تھی، مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔"

"مجھے اب تک سمجھ نہیں آسکی تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" سیدن شاہ نے انتہائی طنز سے کہا جیسے برداشت کرتے ہوئے باجوہ بولا۔

"رب نواز پر سانول کے قتل کا الزام ہے۔ ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ ابتدائی تفتیش سے یہی معلوم ہوا ہے کہ ملازم رب نواز آپ کی پناہ میں ہے، لہٰذا آپ......"

"تم ہوش میں تو ہو ڈی ایس پی، تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" سیدن شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں......! میں پورے حواس میں ہوں۔ دراصل شاہ جی جب ہم نے ملزم کے گھر

پر چھاپہ مارا تو اس کے والدین نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ رب نواز آپ کے پاس ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو اس کے والدین باہر کھڑے ہیں، میں انہیں بلوا لیتا ہوں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔'' باجوہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز ابھرا جس پر سیدن شاہ تلملا کر رہ گیا۔ اس کا غصہ عروج پر پہنچ گیا تھا مگر کمال برداشت سے اس نے تحمل سے کہا۔

''دیکھو ڈی ایس پی......! وہ ہمارے مرید ہیں۔ ظاہر ہے وہ ہمیں اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ تم نے یہ بڑی غلطی کی ہے کہ ان کے گھر پر چھاپہ مار کر انہیں یہاں لے آئے ہو۔ یہاں سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جب تک میں کچھ نہیں چاہوں گا۔''

''میرا مدعا بھی یہی ہے شاہ جی کہ اگر ملزم آپ کے پاس ہے تو دے دیں۔ ورنہ پولیس کی بھی اپنی مجبوریاں ہیں۔ ہم پر بھی بہت دباؤ ہے۔ ہم ملزم کے والدین کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' ڈی ایس پی نے سوالیہ انداز میں سیدن شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چونک گیا۔

''کس کا دباؤ ہے تم پر؟'' اس نے پوچھا۔

''جو اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔'' رفاقت نے عام سے لہجے میں کہا جیسے وہ اس کی بات کو اہمیت نہ دینا چاہتا ہو۔

''تمہیں معلوم ہے کہ جتنا دباؤ ہم ڈال سکتے ہیں، تم تصور بھی نہیں کر سکتے، تمہارا تبادلہ تو معمولی سی بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ اور بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' سیدن شاہ کے لہجے میں کھلی دھمکی تھی۔

''شاہ جی میں پولیس کا ملازم ہوں، مجھے جہاں ڈیوٹی کرنے کے لئے کہا جائے گا، میں وہیں چلا جاؤں گا۔ لیکن آپ کہاں جائیں گے؟''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو، تیرے جیسے کئی ڈی ایس پی میری جیب میں پڑے ہیں۔ جاؤ چلے جاؤ۔ میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح رب نواز کو یہاں سے لے جا سکتے ہو۔ انہیں بھی یہیں چھوڑ جاؤ، ورنہ تم بہت پچھتاؤ گے۔'' سیدن شاہ اچانک غصے میں بپھرتے ہوئے بولا تو ڈی ایس پی کھڑا ہو گیا اور انتہائی تحمل سے بولا۔

''میں اگر یہاں تک آیا ہوں تو کچھ سوچ کر ہی آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑ گیا۔ تبھی پیراں دتہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے گیا۔ اس وقت تک باجوہ کمرے سے باہر

چلا گیا تھا۔

''باجوہ صاحب......! بات سنیں۔'' پیراں دتہ نے کہا تو باجوہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہا۔ تب وہ بولا۔ ''باجوہ صاحب......! شاہ جی بڑی ضدی طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے مریدین کے بارے میں کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا آپ میری بات سنیں، معاملہ کسی اور طرح بھی حل ہو سکتا ہے؟

''کیسے؟'' باجوہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں، کرنا آپ ہی کو ہے سب کچھ، لیکن میری ایک رائے ہے، اگر آپ کو پسند آجائے تو......''

''بولو......!'' باجوہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا مقصد اس کیس کو حل کرنا ہے، ہم بھی یہ جانتے ہیں کہ آپ اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پرکھوں سے یہاں کے معاملات شاہ صاحب ہی حل کرتے آئے ہیں۔ اس طرح ہم یہ معاملہ حل کر سکتے ہیں اگر آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں تو......!'' پیراں دتہ نے انتہائی تحمل سے اپنی بات کہی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' باجوہ نے وضاحت چاہی۔

''یہ معاملہ اگر صلح صفائی کے ساتھ ختم ہو جائے تو اچھا نہیں ہے؟'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''یہ تو فریقین کی رضامندی پر ہے نا۔''

''اس لئے میں عرض کر رہا ہوں کہ ہم فریقین کو بلا کر بات کرتے ہیں۔ اگر اس میں راضی نامہ ہو گیا تو ٹھیک ہم آپ کو آگاہ کر دیں گے۔ اور اگر راضی نامہ نہ ہوا تو میرا آپ سے یہ وعدہ ہے، ہم رب نواز آپ کو دے دیں گے۔ اس میں زیادہ دن نہیں محض دو دن آپ ہمیں دیں۔''

پیراں دتہ نے پوری طرح معاملہ سنبھالتے ہوئے کہا تو رفاقت باجوہ ایک دم سے نرم پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے، اگر تمہاری اس بات کی تائید شاہ جی کر دیں تو میں دو دن کیا، چار دن دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔''

''باجوہ صاحب......! میں جو بات کر رہا ہوں تو شاہ جی کی تائید ہی سے کر رہا ہوں۔ کل شام تک صلح نامہ آپ تک پہنچ جائے گا یا پھر رب نواز کو پیش کر دیں گے۔'' پیراں دتہ نے حتمی

لہجے میں کہا تو رفاقت باجوہ نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ وہ چند قدم آگے بڑھ گیا۔ حویلی سے باہر آ کر اس نے ایک نگاہ رب نواز کے والدین پر ڈالی جو حواس باختہ سے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور قریب کھڑے حوالدار سے کہا۔ ”انہیں جانے دو“ یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ حوالدار نے جنداں اور گامن کو چھوڑ دیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد نفری حویلی سے دور ہوتی ہوئی چلی گئی۔ نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد پیراں دتہ حویلی میں چلا گیا اور ساری بات سیدن شاہ سے کہہ دی۔ وہ اس وقت تک سوچ چکا تھا کہ معاملہ ویسا نہیں ہے جس طرح وہ محسوس کر رہا ہے۔ اس کا سارا دھیان اس شہری لڑکے علی کی طرف جا رہا تھا جو کچھ دیر اس کے قید خانے میں رہا تھا۔ وہی شہر گیا اور ایسا سب کچھ ہو رہا ہے۔

”پیراں دتہ......! ابھی سب کو میرے سامنے لاؤ۔“ سیدن شاہ نے حکم دیا۔

”جیسے حکم سائیں کا“ پیراں دتہ نے تقریباً جھکتے ہوئے کہا اور باہر کی طرف چلا گیا۔ اسے حکم کی تعمیل کرنا تھی۔ جبکہ سیدن شاہ سوچنے لگا کہ اس معاملے کو کس طرح حل کرنا ہے۔

پیراں دتہ نے دوپہر بھی نہیں ڈھلنے دی تھی۔ اس نے اماں فیضاں کو بھیرے سمیت حویلی کے اس کمرے میں لا کھڑا کیا جو مریدین سے ملاقات کے لئے مخصوص تھا۔ گامن اور جنداں تو پہلے ہی وہیں پر تھے۔ اماں فیضاں تو ویسے ہی اس زبردستی کے بلاوے پر حواس باختہ تھی۔ اس پر جب اس نے گامن اور جنداں کو وہیں دیکھا تو ایک لمحے کے لئے وہ حوصلہ ہی ہار گئی۔ ضرور واس کے یا بھیرے کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے ورنہ وہ یوں زبردستی اسے لے کر یہاں نہ آتے۔ اسے خوف نے گھیر لیا تھا۔ جو سیدن شاہ کے انتظار کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی سر اٹھا کر دیکھ لیتی، اس کی نگاہ جب بھی گامن اور جنداں پر پڑی انہوں نے سر جھکا لیا۔ کتنا ہی وقت یونہی گزر گیا۔ تب کہیں جا کر سیدن شاہ اس کمرے میں آیا۔ وہ اپنی مسند خاص پر بیٹھا اور چند لمحوں تک ان سب کو دیکھتا رہا۔ پھر انتہائی غضب ناک انداز میں بولا۔

”او مائی فیضاں......! کیا تمہیں ہمارے انصاف پر کوئی شک ہو گیا تھا جو تو میرے پاس نہیں آئی، منہ اٹھا کے تھانے چلی گئی۔“ اس کے یوں کہنے پر اماں فیضاں کے جیسے دل میں تیر پیوست ہو گیا۔ تبھی وہ تیزی سے بولی۔

”سائیں......! میں کیا کرتی، میرا بیٹا قتل ہوا ہے، شاید میں صبر کر لیتی لیکن میرے

ساتھ تو کسی نے بھی انصاف نہیں کیا۔ میں سوال کرتی ہوں، میرے پتر کا جنازہ پڑھنے آپ کیوں نہیں آئے۔“ یہ ماں کی فریاد نہیں بلکہ ایک چیخ تھی جس سے سیدن شاہ کے کان تک پھٹ گئے۔ وہ بلبلا اٹھا اور تیزی سے بولا۔

”وہ تھا ہی اس قابل......! جسے کسی کی عزت اور غیرت کا کوئی پاس نہ ہو اُس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اس طرح تھانے جا کر، ایف آئی آر لکھوا کر تم اپنے بیٹے کے لئے انصاف لے لو گی۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ انصاف ہم دیں گے تمہیں، ورنہ جاؤ دھکے کھاتی پھرو......!“

”سائیں میں آپ سے کیا انصاف مانگوں، آپ نے تو میرے بیٹے کے قاتل کو پناہ دے رکھی ہے، اور رہی میرے سانول کی بات......! اس نے کوئی غلط نہیں کیا، اس نے مہرو سے شادی کرنا چاہی اسے عزت سے رکھا۔“

”اپنی بکواس بند کرو۔ اور سنو، ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ میری بات مانتی ہے یا پھر اپنے بیٹے کے ساتھ دوسرے بیٹے کی قبر بھی تیار کروانی ہے...... بولو جواب دو......!“

”یہ ظلم ہے سائیں......! اماں فیضاں پوری جان سے لرز گئی۔ اسے جس بات کا خوف تھا وہی سیدن شاہ نے دھمکی کی صورت میں کہہ دیا تھا۔ اس لمحے وہ پچھتانے لگی تھی کہ کیوں اس نے خان محمد کی بات مانی، اور اگر اس نے بات مان ہی لی تھی تو اب تک اسے اسی کی بستی میں چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیا وہاں جا کر بھی وہ محفوظ رہتی؟ کیا وہاں پر جا کر بھیرا ان کے ظلم کا شکار نہیں ہو سکتا تھا؟

”کیا سوچنے لگی ہو فیضاں......! جواب دو۔“ سیدن شاہ کی گرجتی ہوئی آواز کسی کوڑے کی مانند اس پر پڑی وہ پھر سے لرز گئی۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا جا رہا تھا۔ وہ خاموش رہی تو سیدن شاہ نے کہا۔ ”سنو......! یہ کل تیرے گھر قرآن کا میلہ لے کر آئیں گے اور تم رب نواز کو اپنے بیٹے کا قتل بخش دو گی۔“

سیدن شاہ کے یوں کہنے پر اماں فیضاں کو یوں لگا جیسے قاتل رب نواز نہیں وہ خود ہے۔ اسے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کرنا تھا۔ اسے دو جہانوں کے بادشاہ، کلام الٰہی کا پاس رکھنا تھا۔ پتہ نہیں یہ رسم کس نے بنائی تھی کہ بڑے سے بڑا جرم ہو جانے پر بھی زور آور قرآن پاک کا واسطہ دے کر اپنے جرم معاف کروا لیا کرتے تھے۔ اور بے چارہ مظلوم یہ جرم بخشنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

صرف کلام الٰہی کی لاج رکھنے کے لئے وہ سب کچھ بھول جانے پر مجبور ہوتا تھا۔ قرآن میلے کے نام پر سیدن شاہ نے اماں فیضاں کے تو جیسے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دے دیا تھا۔ اب وہ چاہتے ہوئے بھی تھانے نہیں جاسکتی تھی اور نہ ہی اپنے مقدمے کی پیروی کر سکتی تھی۔ اس کے سامنے صرف کلام الٰہی تھا جس کی لاج کے لئے اس نے معاف کرنا ہی تھا چاہے اس کے من میں انتقام کی جتنی بڑی آگ بھڑک رہی ہو۔ وہ بے بس سی ہو کر فرش پر گر گئی۔

''اور سنو......! مہرو کو تیرا بیٹا بھگا کر لے گیا تھا، اس نے اسے داغ دار کر دیا۔ اب مہرو کی شادی تیرے بیٹے بھیرے سے ہوگی۔ جاؤ اور جا کر اس کی شادی کی تیاری کرو۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر لاڑوئے سخن گامن کی طرف کر کے بولا۔ ''بول گامن، تجھے میرا فیصلہ منظور ہے کہ نہیں؟''

''سائیں......! کیسے قبول نہیں ہے۔ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہمارے لئے جو بھی کریں گے۔ میں اپنی بیٹی، بھیرے کو دینے پر تیار ہوں۔''

''یہ ظلم ہے سائیں، یہ ظلم ہے......'' اماں فیضاں نے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہا تو سیدن شاہ نے گرجتے ہوئے کہا۔

''خاموش......! فیصلہ ہو چکا، مان لے گی تو اچھا ہوگا، اپنے بیٹے کے سر پر سہرے دیکھے گی ورنہ......تو جانتی ہے تیرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ شکر کر میں نے تجھے تیری گستاخی کی سزا نہیں دی۔'' سیدن کے لہجے میں غرور اور نخوت تھی۔

اب مزید کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ فیضاں کو پوری طرح احساس تھا کہ سیدن شاہ نے یہ حکم کیوں سنایا ہے۔ اس کی صرف اور صرف یہی غلطی تھی کہ اس نے تھانے جا کر ایف آئی آر درج کیوں کروائی تھی۔ اب خان محمد بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ سیدن شاہ کو جہاں یہ معلوم تھا کہ وہ تھانے گئی ہے تو اسے یہ بھی خبر ضرور ہوگی کہ وہ کس کے ساتھ گئی تھی۔ یہ سب کچھ جان کر ہی اس نے حکم سنایا تھا۔ اور اب اسے یہ حکم ماننا ہی تھا۔

سیدن شاہ اٹھ کر اندر چلا گیا تو پیراں دتہ نے انہیں اس کمرے سے چلے جانا کا حکم دے دیا۔ اماں فیضاں روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

مہرو کے لئے وہ صبح انتہائی دردناک تھی۔ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ

ہی یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ وہ تو پہلے ہی پورے علاقے میں رسوا ہو چکی تھی اور اب سیدن شاہ کا یہ حکم کہ اس کی شادی بھیرے سے کر دی جائے۔ اس پر ظلم یہ تھا کہ اس کے والدین راضی بھی ہو گئے تھے۔ ایسا صرف اور صرف رب نواز کو بچانے کے لئے ہو رہا تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ لڑکا جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، اس کے ساتھ شادی کا تصور بہت بھیانک تھا۔ گزری ہوئی کل میں جب اس کے والدین نے آ کر سیدن شاہ کا فیصلہ سنایا تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ دم بخود ہو گئی۔ اس نے احتجاج کرتے ہوئے اپنی ماں سے کہا تھا۔

''یہ کیسا فیصلہ ہے اماں......؟ تو نے میری زندگی کا بھی خیال نہیں کیا۔ اور پھر اس سے جس کے بھائی کو تیرے بیٹے نے قتل کر دیا تھا۔ وہ کیا ساری زندگی......''

''خاموش ہو جاؤ اور ایک لفظ بھی مت کہنا مہرو، یہ پیر سائیں کا حکم ہے۔'' اماں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا تو اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں ایسے حکم کو نہیں مانتی جو کسی کی زندگی تباہ کر دے۔'' مہرو کے لہجے میں سے آگ چھلک اٹھی تھی۔

''تو پھر تو برباد ہو جائے گی۔ نہ تم رہو گی اور نہ تیرا بھائی۔'' اماں نے کہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''اگر اس کے بھائی کو تیرے بھائی نے قتل کیا تھا تو کس کے لئے، تیرے لیے ہی نا۔ سارا قصور سانول کا ہی نہیں تھا، یہ تو شکر کر تیرے بھائی نے اسے قتل کر کے تیری عزت بچالی۔''

''اماں یہ تو کہہ رہی ہے؟'' مہرو نے حیرت سے کہا۔ ''تو......تو مجھے قصوروار سمجھتی ہے، تیرے خیال میں اسے میں نے کہا تھا کہ وہ مجھے بھگا کر لے جائے۔''

''بس بس زیادہ باتیں نہ کر، اور سن، تیرا باپ آ جائے نا تو اس کے سامنے ایسی بکواس لے کر نہ بیٹھ جانا۔'' اس کی ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں نہ کہوں، میری زندگی برباد ہو رہی ہے اور میں......'' مہرو نے کہنا چاہا تو اماں بول اٹھی۔

''تجھے کہا ہے نا بس کر۔ اگر تو اب سننا ہی چاہتی ہے نا تو سُن......! تیری جیسی کئی بیٹیاں میں اپنے بیٹے پر وار دوں۔ اب میں تیری کوئی بات نہیں سننے والی۔'' جنداں نے کہا اور اٹھ گئی۔ مہرو حیرت سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی جو اسے خود ساری زندگی سسکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ماں سے کہنا

سنتا ہی فضول ہے۔ یہ وہ سوچ کر اس نے اپنے باپ کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ مہرو کو اگر تھوڑی بہت امید تھی تو فقط اس سے۔ وہ تو اس کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اسے کسی طور پر اس آگ میں پھینکنے کی اجازت نہیں دے گا۔ مگر مہرو کی اس اُمید پر بھی پانی پھر گیا۔ اس نے جب اپنے باپ کے سامنے اپنی فریاد رکھی تو وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر انتہائی مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"میری دھی......! اب تیرے باپ کی عزت اور تیرے بھائی کی زندگی، بس تیرے ہاتھ میں ہے، اب تو چاہے، فیصلہ تم پر چھوڑا۔" یہ کہہ کر وہ جیسے نڈھال سا ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ مہرو سر تا پا لرز گئی۔

ساری رات اسی سوچ بچار میں گزر گئی تھی۔ مہرو کے لئے وہ سیاہ رات تھی جس کی صبح کبھی بھی نہیں ہونے والی تھی۔ اسے اپنا آپ قربان کرنا تھا اور باپ کی لاج رکھنا تھی۔ اسے فقط یہی دکھ تھا کہ ایک بار ہی اسے مار دیا جائے لیکن زندگی بھر کی اذیت تو نہ دی جائے۔ اسے سب سے بڑا دکھ تو یہ تھا کہ اس کی زندگی کا فیصلہ دوسرے کر رہے تھے۔ اور اسے اتنی حیثیت بھی نہیں دی کہ اس سے پوچھ ہی لیا جائے۔ وہ اپنے ماضی کو ٹٹولتی رہی لیکن کہیں بھی اتنا بڑا گناہ اس نے نہیں کیا تھا جس کی اتنی بھیانک سزا اسے مل رہی تھی۔ ایک ایک چہرہ اس کی نگاہوں میں پھیر گیا، کوئی بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا۔

پوہ پھٹتے ہی اس کی ماں نے حکم صادر کر دیا تھا کہ وہ نہا دھو کر وضو کر لے، اسے قرآن لے کر سانول کے گھر جانا ہے۔ ان کی یہی روایت تھی کہ گھر کی لڑکیاں ہاتھ پر قرآن اٹھائے اس کا واسطہ لے کر جاتی ہیں۔ جنداں نے اپنے قریبی رشتے داروں کی لڑکیاں بھی بلوالی ہوئیں تھیں کہ بیٹیاں جا کر معافی مانگیں۔ مہرو مسلسل سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ لیکن وہ تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ ہونا تھا وہ سیدن شاہ نے کر دیا تھا اور اسے اس کے والدین نے ہی قبول کر لیا تھا۔ اب عافیت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے روشن ہوتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے رب سے کہا۔ "اے اللہ سائیں......! میں تو اپنے باپ کی مان رہی ہوں، اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ تو وہی کر جو میرے حق میں بہتر ہے۔" جیسے ہی اس نے دل ہی دل میں یہ کہا اسے قدرے سکون محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن سے بہت سارا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے سنا تھا کہ جب سارے در بند ہو جائیں تو فقط ایک ہی در کھلا ہوتا ہے جہاں سے بندے پر رحم ہو جاتا ہے۔ وہ در صرف اور صرف رب عظیم کا در ہے۔

سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا نے تپش کا احساس زائل کر دیا تھا۔ چند لڑکیوں کے پیچھے رب نواز اور اس کے والدین تھے۔ سب سے آگے مہرو تھی، جس کے ہاتھ میں قرآن پاک پکڑا ہوا تھا۔ جس پر لڑکیوں نے سبز چادر کا سایہ کیا ہوا تھا۔ یہ سب دھیرے دھیرے کچی بستی کی ایک گلی سے گزر رہے اور ان کا رخ فیضاں مائی کے گھر کی جانب تھا۔ پورا گاؤں انہیں بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا، کسی کی نگاہ میں احترام تھا اور کسی کی نظر میں طنز، وہ سب سے بے نیاز معافی مانگنے کے لئے قرآن کا واسطہ دینے جا رہے تھے۔ مہرو کے دل میں نجانے کیا کچھ اٹھ رہا تھا۔ اس نے سب کی سنی تھیں، ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے اللہ پر یقین رکھ لیا تھا۔ اس کے اپنوں نے جو اس پر ظلم کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ یوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ اماں فیضاں کے گھر میں داخل ہو گئے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے دروازے پر وہ لوگ قرآن کا میلہ لے کر آ رہے ہیں۔ وہ بھی مجبور تھی کسی طرف نہیں جا سکتی تھی۔ ان دیکھی آہنی زنجیروں کے ساتھ اسے باندھ دیا گیا تھا۔ اس نے انہیں معاف کرنا ہی تھا کہ یہ سیدن شاہ کا حکم تھا۔ ورنہ وہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی۔ جب سے سیدن شاہ نے اسے یہ حکم دیا تھا وہ خود کو ہی سمجھانے پر مجبور تھی کہ اس کے بھیرے کو پھانسی کے تختے سے اتار کر عمر قید کی سزا بدل دی گئی ہے۔ وہ بھیرا جس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ اس کے دروازے پر آ چکے تھے۔ اس لئے مجبوراً اسے اٹھ کر ان کا استقبال کرنا تھا، اسے ان لوگوں کی نہیں دو جہانوں کے بادشاہ کی عزت کرنا تھی۔ اس کے واسطے ہی اس نے انہیں معاف کرنا تھا۔ ورنہ کوئی ماں اپنے بیٹے کے قاتل کو کس طرح بخش سکتی ہے۔ اماں فیضاں اٹھ کھڑی ہوئی اور صحن کے درمیان آ گئی۔ وہ سب دروازہ پار کر کے صحن میں آ گئے۔ ان سب کی نگاہیں اماں فیضاں پر تھیں، جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ چند لمحوں تک ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر گامن نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بہن فیضاں......! ہمیں معاف کر دے، ہم سب سے بہت بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ میرے بیٹے کی زندگی اب تیرے ہاتھ میں ہے، تو اسے معاف کر دے۔"

اماں فیضاں بت بنی کھڑی رہی تو جنداں بولی۔

"بہن......! ہم اپنی بیٹیوں کے ساتھ تیرے در پر آئے ہیں۔ ہمارا واسطہ یہ دو جہان کا بادشاہ ہے۔ ہمیں معاف کر دے۔"

اماں فیضاں یوں ساکت کھڑی رہی جیسے اس کے بدن میں جان ہی نہ ہو۔ تبھی رب نواز آگے بڑھا اور اماں فیضاں کے قدموں میں جا گرا اور بہت ہی گریہ زاری کرتے ہوئے بولا۔

''اماں......! تو ایک بار مجھے معاف کردے، میں تجھے تیرا سانول بن کے دکھاؤں گا۔ مجھے معاف کردے اماں......! تجھے قرآن کا واسطہ......!''

تبھی اماں فیضاں کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی، اس نے رب نواز کو پرے کیا اور قرآن پاک کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ مہرو نے قرآن اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس دوران دونوں کی نگاہیں ملی، دونوں کی آنکھوں میں مجبوریاں جھلک رہی تھیں۔ دونوں کی نگاہوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹنے کے جرم کا شکوہ مچل رہا تھا۔ اماں فیضاں نے قرآن پاک پکڑا اسے چوما اور پھر اندر کمرے میں اونچے طاق پر رکھ دیا۔ اماں نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ وہ لوگ صحن میں یونہی کھڑے تھے۔ گامن نے ایک کاغذ اماں کی طرف بڑھایا تاکہ وہ صلح نامے پر انگوٹھا لگا دے۔ اس میں یہی درج تھا کہ اماں فیضاں نے رب نواز کو اپنے بیٹے کا قتل معاف کیا، جس کے بدلے میں مہرو کی شادی، بھیرے سے کردی جائے گی۔ اماں فیضاں نے یوں انگوٹھا لگا دیا جیسے اپنی قسمت پر مہر لگا دی ہو۔

☆☆☆

اس شام سردار امین خاں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اپنے بنگلے کے پائیں باغ میں تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر اللہ بخش موجود تھا۔ دونوں میں کافی دیر سے خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اللہ بخش کے آنے سے پہلے سردار امین خان کا موڈ بہت خوشگوار تھا، اسی لئے وہ اپنی شام اس پائیں باغ میں گزارنا چاہتا تھا۔ اس کی تنہائی کو اللہ بخش نے توڑا اور بہت بری خبر سنائی تھی کہ اماں فیضاں نے رب نواز کو معاف کر دیا ہے۔ اس خبر نے سردار امین خان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ نجانے کیا کچھ اور کتنا آگے تک سوچ چکا تھا۔ اسی قتل کو وہ سیدن شاہ کے روحانی حصار کو توڑنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہی بنیاد تھی جس پر اس نے بہت کچھ کرنا تھا، اور وہی بنیاد ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ سردار امین خان کو زبردست دھچکا لگا تھا جس سے وہ کتنی دیر تک سنبھل ہی نہیں پایا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری محنت ضائع گئی۔ نہ رفاقت باجوہ اب کچھ کرسکتا ہے اور نہ ہی خان محمد......''

''جی سائیں......! انہوں نے معاہدہ پیش کر دیا ہے۔''

''معاہدہ......! کیا مطلب؟'' امین خان نے چونکتے ہوئے کہا۔

''وہ صلح ایک معاہدہ ہی ہے، رب نواز کا قتل اس شرط پر معاف کیا گیا ہے کہ اس کی بہن کی شادی مقتول کے بھائی کے ساتھ کر دی جائے۔ سب کو باندھ کر رکھ دیا ہے انہوں نے۔'' اللہ بخش نے تفصیل بتائی تو وہ پھر سوچنے لگا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے سیدن شاہ ہماری یہ چال سمجھ گیا ہے۔'' پھر ایک دو لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''لیکن کیسے سمجھا وہ......؟ کہاں غلطی ہوئی ہم سے۔''

''کہیں بھی غلطی نہیں ہوئی سائیں، بس یہ قسمت کی بات تھی۔'' اس نے کہا تو امین خان تیزی سے بولا۔

''قسمت نہیں اللہ بخش، قسمت نہیں، ضرور کچھ ایسا ہوا ہے۔ اور پھر تم نے اس قدر مایوسی کی بات کیوں کی ہے۔ کیا ہم اپنی کوشش ترک کر دیں گے۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا اللہ بخش، ایک ناکامی سے ہمارا حوصلہ پست نہیں ہوگا۔ ہم اس وقت تک کوشش کرتے رہیں گے جب تک سیدن شاہ کو الیکشن سے باہر نہیں کر دیتے۔''

''تو سائیں......! پھر اس کے لئے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ یہ معاملہ تو ختم سمجھیں۔'' اس نے اپنی رائے دی۔

''ٹھیک ہے، اگر یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے............'' یہ کہتے کہتے وہ چونکا...... مگر کیسے ختم ہو گیا۔ ایف آئی آر تو ہے نا، اسے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ صلح ایک معاہدہ ہی ہے نا، تو معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ کیا اس کی کوئی حد مقرر ہے کہ مقتول کے بھائی کے ساتھ کب تک شادی ہوگی؟''

''اس کے بارے میں تو معلوم نہیں۔'' اللہ بخش نے صاف گوئی سے کہا۔

''تو پھر پتہ کرو......! پوری بات پتہ کرو اور باجوہ سے کہو کہ کاغذات میں یہ معاملہ ختم نہیں ہونا چاہیے۔ کسی نہ کسی طرح اسے عدالت میں لے جائے۔ تھوڑا وقت لو ان سے، ممکن ہے ان دنوں میں حالات ہمارے حق میں ہو جائیں اور ہم............'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی سوچ میں گم ہو کر خاموش ہو گیا جیسے کوئی نیا نکتہ اس کے ذہن میں آ گیا ہو۔ اللہ بخش اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتا رہا کہ وہ کچھ کہے گا۔ کافی دیر تک جب اس نے کچھ نہیں کہا تو اجازت چاہی۔

''سائیں......! مجھے اجازت ہے۔''

''نہیں...... وہ...... پتہ کرو اس لڑکے کا جو وہاں پر گیا تھا۔ اس سے میری ملاقات

کراؤ۔"

"سائیں......! آپ کا اشارہ بی بی سائیں کے کلاس فیلو کی طرف ہے جو روہی میں......؟"

"ہاں...... ہاں...... وہی...... وہ ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔ اب تو اس کے امتحان بھی ختم ہو چکے ہوں گے۔"

"سائیں......! وہ لڑکا ہمارے کام تو آسکتا ہے لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہوگا نا کہ وہ ہمارے کام آنے کی حامی بھرے گا یا نہیں۔"

"اللہ بخش تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ دولت کیا کچھ نہیں کر سکتی، میں نے سنا ہے کہ وہ ایک غریب سرکاری ملازم کا بیٹا ہے۔ اسے بھی نوکری کی ضرورت ہوگی۔ ہم اسے اس کی اوقات سے زیادہ نواز دیں گے۔ بس تم اس کی میرے ساتھ ملاقات کا بندوبست کراؤ۔"

"ٹھیک ہے سائیں...... جیسے آپ کی مرضی۔ میں ایک دو دن میں ہی اسے آپ کے ساتھ ملا دوں گا۔ اور باجوہ کو بھی سمجھا دوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں......! بس اب تم جاؤ، جتنی جلدی یہ کام ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔" سردار امین خان نے کہا اور پھر اپنی سوچوں میں کھو گیا۔

اس نے تو یہی سمجھا تھا کہ اسے ایک مضبوط بنیاد مل گئی ہے اور علاقے میں خان محمد جیسا آدمی اسے میسر آگیا ہے۔ اب اتنا زیادہ مسئلہ نہیں ہوگا کہ جو وہ چاہے گا وہی ہوگا۔ مگر ہوا اس کی سوچ کے برعکس۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس معاملے پر بھرپور توجہ دے گا۔

☆☆☆

سورج سارا دن اپنی آب و تاب دکھا کر مغرب کی آغوش میں چھپ رہا تھا۔ اس کی تپش ماند پڑ چکی تھی اور شاید اسی جلال میں اس نے مغربی افق کو سرخ کیا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی، اس لئے دور تا حد نگاہ تک سنہری ٹیلے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ساکت ہو، یہ ٹیلے ریت کے نہیں پختہ مٹی کے ہوں۔ وہ جون کے ابتدائی دن تھے اور ان دنوں روہی گرم ترین ہوا کرتی ہے۔ ایسے ماحول میں علی تیز تیز قدموں سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا، بس ایک اضافہ تھا، اس نے اپنا چہرہ ایک بڑے سارے رومال میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ مغرب ہو جانے سے پہلے کچی بستی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ بڑی سڑک سے چھوٹی ذیلی سڑک تک اس کا ایک

دوست اسے گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اس کی گاڑی کہیں صحرا میں پھنس نہ جائے اس لئے وہ علی کو ڈراپ کر کے واپس چلا گیا تھا، جبکہ علی وہاں سے پیدل کچی بستی کی جانب چل پڑا تھا۔

اس کے فائنل امتحان کب کے ختم ہو چکے تھے اور یہ سب اس نے اپنے والد کی خوشی کے لئے کیا تھا۔ اسے اب نتیجے کا انتظار نہیں تھا، امتحان کے بعد جو چند دن اس نے شہر میں گذارے تھے، یہی سوچتے ہوئے کہ وہ اپنے والدین کو بتا کر کچی بستی جائے یا بالکل ہی نہ بتائے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے بتایا تو ایک بحث شروع ہو جائے گی، اسے روکنے کے لئے ہزار دلائل دیئے جائیں گے۔ ممکن ہے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کیا جائے۔ لیکن اگر وہ نہیں بتاتا تو پھر وہ پریشان ہوں گے۔ وہ اپنے والدین کو خواہ مخواہ کی پریشانی نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر آج صبح اس نے ایک کاغذ پر اپنے جانے کے بارے میں اطلاع دی۔ اسے اپنے سرہانے پر رکھا اور گھر سے نکل گیا۔ پھر دوست کے انتظار میں، یہاں تک آتے ہوئے اسے مغرب ہو چلی تھی۔ اس کے قدم اور تیز ہو گئے اسے کچی بستی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور وہ روہی کا باشندہ لگ رہا تھا۔ وہ سیدھا مسجد میں گیا، جہاں جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے وضو کیا اور جماعت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ تیسری رکعت تھی۔ میاں جی امامت کر رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے سلام پھیرا یہ بقیہ نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ وہاں موجود چند نمازیوں نے اسے دیکھا اور ان میں حیرت بھری منمناہٹ شروع ہو گئی۔ میاں جی نے علی کی طرف بغور دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ جب تک علی نے نماز ختم کی دوسرے نمازی جا چکے تھے۔ بلاشبہ اس کی آمد کے بارے کچی بستی میں اطلاع ہو جانے والی تھی۔ میاں جی اس کی طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے میاں جی کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ علی ان سے گلے ملا۔ تب انہوں نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین تھا جوان تم ضرور آؤ گے۔"

تب ان سے الگ ہوتے ہوئے علی نے کہا۔ "کیا میری پیاس شہر میں دور ہو سکتی تھی۔"

"نہیں......! تم جس راہ کے راہی ہو چکے ہو، وہاں پیاس ہمیشہ شدید رہی ہے۔ بجھتی نہیں بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے علی کا ہاتھ پکڑا اور وہیں صف پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"تم بیٹھو، میں تمہارے لئے پانی لے کر آتا ہوں۔"

"میں لے لیتا ہوں میاں جی۔"

"نہ علی نہ......! مجھے مہمان نوازی کی سعادت حاصل کر لینے دے۔" یہ کہہ کر اٹھے۔ کونے میں پڑے ہوئے گھڑے میں سے پیالہ بھرا اور اس کی جانب بڑھا دیا۔ علی نے پیالے میں سے سارا پانی پیا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اور دھیرے سے پوچھا۔

"یہاں پر سب خیریت ہے۔"

"ہاں......! جیسے پہلے چل رہا تھا، ویسے ہی ہے۔ بہن فیضاں سے ملو گے تو ساری باتیں تجھے معلوم ہو جائیں گی۔ تم بتاؤ، کتنے دنوں کے لئے آئے ہو؟"

"ہمیشہ کے لئے، ارادہ تو یہی ہے، باقی جو مالک کو منظور ہے۔" علی نے دھیرے سے کہا۔

"اگر ارادے میں یقین شامل ہے تو مالک کائنات خواہش پوری کر دیتا ہے۔" یہ کہہ وہ چند لمحے سوچتے رہے جیسے مراقبے میں ہوں، پھر سر اٹھا کر بولے۔ "ابھی تم جاؤ، بہن فیضاں سے ملو کل باتیں ہوں گی۔ چاہو تو عشاء کے بعد آ جانا۔" میاں جی نے کہا تو علی سعادت مندی سے اُٹھ گیا۔ میاں جی اسے مسجد سے باہر تک چھوڑنے کے لئے آئے۔

علی جیسے ہی اماں فیضاں کے دروازے پر جا کے رُکا ایک لمحے کے لئے اس کا دل بھر آیا۔ اسے شدت کے ساتھ سانول کی یاد آئی تھی۔ وہی پہلا شخص تھا، جو روہی میں اسے ملا تھا، چند دنوں کے ساتھ نے دوستی کا کتنا لمبا سفر طے کر لیا تھا اس نے، اور پھر یہ سانول ہی تھا جس نے اس کی زندگی کا زاویہ نگاہ ہی بدل دیا تھا۔ نجانے وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑا رہتا کہ اچانک اس کے سامنے اماں فیضاں آن کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم اماں......!" علی نے نہایت ادب سے کہا تو اماں سلام کا جواب دیتے ہوئے سسک پڑی۔

"آ جا پتر......! آ جا...... اندر آ جا۔" اماں نے راستہ دیتے ہوئے کہا تو علی بولا۔

"اماں......! ابھی تو میں آ کے کھڑا ہوا ہوں۔ آپ......!"

"مجھے لگا، جیسے میرا سانول دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ مجھے بلا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیو اور کیسے یہاں تک آ گئی ہوں۔" اماں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور علی کے سر پر پیار دیا۔ شا بھیرے نے آواز سن لیں تھیں۔ اس لئے وہ تیزی سے آیا اور آتے ہی علی کے گلے لگ گیا۔

"بھلا علی......! آ گیا تو......! میں بڑا اداس ہو رہا تھا، مجھے بڑی یاد آتی تھی تیری۔ اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔" وہ اپنی ہی دھن میں کہے چلا جا رہا تھا۔

وہ تینوں چلتے ہوئے صحن میں بچھی چارپائیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ اماں فیضاں نے اس کے گھر کا حال احوال پوچھا اور کھانا لانے کے لئے اٹھ گئی۔

"سناؤ اماں کیسے گزاری؟" علی نے پوچھا جب اماں کھانے کے خالی برتن واپس رکھ کے آ گئی۔

"کیا سناؤں پتر......! ہم سیدن شاہ کے حکم پر مجبور لوگ، اسی کی مانتے ہیں۔" اماں نے روہانسے لہجے میں کہا اور پھر ساری روداد سنا دی۔ اس دوران بھیرا نجانے کب سو گیا۔

"اماں......! یہ تو ظلم ہے نا، ایک طرف اس نے قاتل کو پناہ دے رکھی ہے۔ پھر قتل معاف کروا رہا ہے اور دوسرا دو انسانوں کی زندگی بھی برباد کر رہا ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔"

"تو پھر میں کیا کرتی بیٹا......! میں اپنا دوسرا بیٹا بھی گنوا دوں" اماں نے لاچاری سے کہا۔

"نہیں، کچھ نہیں ہوگا، آپ نے اگر معاف کر دیا ہے تو کر دیا، چاہے دل پر پتھر رکھ کے ہی سہی، لیکن اب بھیرے اور مہرو کی زندگی تو تباہ نہیں کرنی چاہیے نا۔"

"تم بتاؤ نا، میں کیا کروں......؟" اماں نے پھر بے بسی میں کہا۔

"کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ گیا ہوں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ نے فکر مند نہیں ہونا۔"

علی نے کہا اور پھر وقت کا اندازہ کیا گیا۔ رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ تب اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اماں......! میں جا رہا ہوں سونے کے لئے، ابھی میں نے نماز بھی پڑھنی ہے۔ آپ آرام کریں صبح باتیں ہوں گی۔"

"میں تمہارا بستر بچھا......" اماں نے کہنا چاہا تو علی نے ٹوک دیا۔

"نہیں، میں خود کر لوں گا۔ آپ آرام کرو۔" علی نے جلدی سے کہا اور باہر گوپے کی سمت چل دیا۔

علی نے فجر مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد وہ میاں جی سے باتیں کرنا چاہتا تھا اسے انتظار تھا کہ باقی نمازی چلے جائیں تو وہ اپنی بات کہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی ایک ادھیڑ عمر نمازی

نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوئے نوجوان تو پھر یہاں آ گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز بھری حقارت تھی۔

''جی، میں پھر آ گیا ہوں۔'' علی نے اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہیں پتہ ہے کہ پیر سیدن شاہ تمہیں پسند نہیں کرتے اور تیری وجہ سے ہی پہلے یہاں فساد ہوا تھا، تمہارے لئے اچھا یہی ہے کہ تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔'' اس کا لہجہ ہنوز ایسا ہی تھا۔ جس پر علی نے اس کی جانب دیکھا اور نہایت تحمل سے کہا۔

''بزرگوار......! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ فساد میری وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور رہی پیر سیدن شاہ کی بات، مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کہ وہ کسے پسند کرتا ہے اور کسے نہیں۔ اس کی اپنی مرضی ہے اور رہی پچھتانے کی......''

''علی......! خاموش ہو جاؤ......'' میاں جی نے اسے ٹوکا تو وہ خاموش ہو گیا۔ تب میاں جی نے اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ یہ میرا مہمان ہے۔''

''تو میاں جی، اگر اس کی وجہ سے......'' ایک اور بزرگ سے شخص نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا، اس نے اگر کچھ کیا بھی تو یہ خود ہی بھگتے گا، تمہیں مدد کے لئے نہیں پکارے گا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔'' اس ادھیڑ عمر شخص نے حاکمانہ لہجے میں۔

''ایسا ہی سمجھ لو......'' میاں جی نے کسی گھبراہٹ کے بغیر کہا۔

''سوچ لو میاں، کہیں اس مسجد کی امامت سے بھی جاؤ۔'' اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ میاں، اپنا راستہ لو۔ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے مجھے نماز پڑھنی ہے، یہاں نہ سہی وہاں پڑھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم بات کرتے ہیں اور اپنا فیصلہ تمہیں سناتے ہیں۔ لگتا ہے کہ تم اب امامت کے قابل نہیں رہے تمہارے یہاں فسادی لوگ آتے ہیں جو پیر سائیں کی عزت نہیں کرتے۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ پیر سائیں کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والا شخص ہمارا دشمن ہے۔''

''یار......! تم نے کیا فیصلہ سنانا ہے میرے بھائی، میں خود ہی یہ مسجد چھوڑ دیتا ہوں۔'' میاں جی نے کہا اور اٹھ گئے۔ اپنا رومال کاندھے پر رکھا اور علی سے کہا۔ ''آؤ بیٹا......! اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ کسی درخت تلے جا کر ڈیرہ لگاتے ہیں۔''

علی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اٹھ کر میاں جی کے ساتھ چل دیا۔ اس وقت سورج طلوع ہو کر روئے زمین پر اپنی کرنیں نچھاور کر رہا تھا جب وہ دونوں مسجد سے نکل کر ایک گلی میں چل پڑے پھر وہ دونوں بستی میں سے نکلتے چلے گئے۔ دونوں کے درمیان خاموشی طاری تھی۔ علی کے دل میں بہت ساری باتیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ میاں جی کی خاموشی کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ دونوں چلتے چلے جا رہے تھے۔ بستی سے نکلنے کے بعد جب میاں جی ایک خاص راستے پر ہو لئے تو علی سمجھ گیا۔ وہ سانول کی قبر پر جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دونوں سانول کی قبر تک آ گئے۔ میاں جی نے سرہانے کی جانب کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ علی نے بھی ایسے ہی کیا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد میاں جی نے مسکراتی آنکھوں سے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''علی بیٹا......! تمہیں کوئی گھبراہٹ تو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گئے تو وہ بھی بیٹھ گیا۔

''نہیں میاں جی......! بس یہ لوگوں کا رویہ اچانک......؟'' علی نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ایسا ہونا ہی تھا بیٹا، مگر اتنی جلدی ہو جائے گا، اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ خیر......! یہ اوپر والے کے معاملات ہیں۔ ہم اس میں دخل انداز نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔''

''میاں جی......! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ آپ نے اب تک اپنے رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں بنایا۔ آج جیسے انہوں نے مسجد......''

''میرے جیسے لوگ اپنا ٹھکانہ بنا ہی نہیں سکتے، ہمیں تو جہاں کہیں جانا ہے وہیں چلے جاتے ہیں۔ ٹھکانہ تو بندے کا ایک ہی ہوتا ہے، تم ان چکروں میں مت پڑو اور میری بات غور سے سنو......'' میاں جی نے گہری سنجیدگی سے کہا تو علی ہمہ تن گوش ہو گیا۔ تب وہ بولے۔ ''اب اگر تم آ ہی گئے ہو تو پھر تمہارے ذمے ایک بہت بڑا کام لگ گیا ہے۔ وہ کام کیا ہے، یہ میں نہیں جانتا، وہ خود بخود تیرے سامنے آ جائے گا۔ اور تجھے بڑی جرأت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔''

"میں آپ کی بات سمجھ تو رہا ہوں لیکن اس کی روح سمجھنے سے قاصر ہوں۔" علی نے صاف لفظوں میں کہا تا کہ بات اس پر کھل جائے۔

"اوئے......! بات کی روح......! علی تم کیا جانتے ہو روح کے بارے میں۔" میاں جی نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا لیکن انداز ایسا ہی تھا جیسے دھیان کسی اور جانب ہو۔

"آپ ہی بتائیں گے میاں جی۔" علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں کیا بتا پاؤں گا۔ اس شے کے بارے میں جسے رب نے پوشیدہ رکھا، جس کا بھید اس نے کسی کو نہیں دیا۔ ہاں......! مگر یہ گواہی موجود ہے کہ روح ہے، اپنا وجود رکھتی ہے، اس کا احساس ہمیں ہوتا ہے، لیکن کیسے......؟ کسی بھی بدن میں زندگی کی رمق سے، روح کا ہونا ثابت ہو جاتا ہے لیکن اس کی ماہیت کے بارے میں غور و فکر نا لا حاصل اور فضول کوشش ہے۔ ہمیں روح کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب اس کا اظہار ہوتا ہے، جب بدن پر موت طاری ہو جاتی ہے تو ہم بے ساختہ کہہ دیتے ہیں کہ روح پرواز کر گئی ہے۔ اب یہ جسم بے روح ہے۔" میاں جی نے بہت تحمل سے علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "میں روح کی ماہیت پر بحث کر کے تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں اس سے تمہیں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں۔ جس طرح تم روح کو دیکھ نہیں سکتے، اس کی ماہیت کو نہیں جان سکتے، بالکل اسی طرح تم اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں کو تو جان سکتے ہو، ان کی گنتی اور شمار کر سکتے ہو لیکن کیا اس کے رحم کی ماہیت کو جان سکتے ہو۔ اس تک تمہاری رسائی ممکن ہے؟"

"بلاشبہ نہیں میاں جی......!"

"لیکن تم اللہ کے رحمان ہونے اور اس کے رحم کا احساس کر سکتے ہو۔ انسان جب اللہ کی راہ پر چلتا ہے نا تو اسے اس کی مزدوری کی اجرت ملتی ہے۔ انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ یہ سب کہاں سے اور کیسے ہو رہا ہے، لیکن اسے مزدوری ملتی ضرور ہے۔ اب مزدور کا کام یہ ہے کہ وہ خلوص نیت سے محنت کرتا چلا جائے۔ یہ مت سوچے کہ مجھے اجرت اور انعام کیسے ملے گا، یہ اللہ کا بھید ہے، جیسے روح ایک بھید ہے۔ انسان اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہے مگر کہاں تک؟ خود ہی ہانپ جاتا ہے۔ تو پھر لا حاصل ہانپنے سے مزدوری کرنا بہتر نہیں ہے۔"

"بے شک میاں جی۔" علی نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"تو بیٹا......! اس سارے معاملے کی کنجی یقین ہے، تم دعا یہ کیا کرو کہ جو مزدوری تم نے

کی ہے، اسے قبولیت مل جائے۔ اب تمہیں نہیں پتہ کہ قبول کیسے ہو گی، ہاں قبول ہو جانے کے بعد جو تمہیں اجرت ملے گی یا تمہارے یقین اور خلوص کی بنیاد پر جو تمہیں انعام ملے گا، تب تمہیں اندازہ ہو گا۔ اور سن لو......! یقین تبھی آتا ہے جب انسان عشق کرتا ہے۔"

"میاں جی......! آپ جو مجھے سمجھانا چاہ رہے ہیں، وہ یہی ہے نا کہ میں جو اللہ کی راہ پر چل رہا ہوں مجھے پورے یقین کے ساتھ مزدوری کرنا ہے، اجرت یا انعام کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے سمجھ میں آتی ہے، لیکن......! یہ جو عشق کا معاملہ ہے، یہ میری سمجھ میں آنے والے شے نہیں ہے۔ میں عشق کیسے کروں؟"

"میں نے بتایا ہے نا کہ یقین کنجی ہے۔ اور سنو......! عشق بھی روح کی مانند ہے، جس طرح روح کو اپنے اظہار کے لئے مادی جسم کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح عشق کو بھی ایسے دل کی ضرورت ہوتی ہے جو درد برداشت کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ یہ عشق جب ہو جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے، دکھائی نہیں دیتا۔ تم عشق کو نہ سمجھنے کی بات کر رہے ہو جبکہ تم سرتاپا عشق میں ڈوب گئے ہو۔ اچھا چلو مجھے بتاؤ......! کیوں اس صحرا میں ریت پھانکنے تم آ گئے ہو......؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں۔ کیا زور زبردستی ہوئی ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، لیکن میں تو ان بے چاروں......"

"وہ بے چارے تمہارے کیا لگتے ہیں، تمہارے اندر جذبہ ہمدردی کیوں جاگا؟ یہی ابتدائے عشق ہے۔ اب ہوتا یوں ہے، عشق تو ہمارے اندر بسیرا کر لیتا ہے۔ لیکن اسے ہم سمجھ نہیں پاتے، اور اسی ناسمجھی میں اس خالص عنائت کو اپنی نفسانی خواہشات کے ساتھ نہ صرف گدلا کر لیتے ہیں بلکہ اسے زہر آلود بھی بنا دیتے ہیں۔ اللہ تک رسائی کا راستہ خدمت انسانیت ہے۔ جس کی ابتداء تم کر چکے ہو۔ اب جس قدر تمہارا اللہ پر یقین ہو گا، اتنا ہی تمہارا عشق گہرا ہوتا چلا جائے گا۔"

"کیا آپ مجھے عشق کے بارے میں..........." علی نے کہنا چاہا لیکن میاں جی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"علی......! وقت بہت کم ہے، اور کرنے والی باتیں بہت زیادہ ہے۔ تم لفظوں میں نہ الجھو، بلکہ تمہارا دل ہی تمہارا مرشد ہے، اس کی سنو وہ کیا کہتا ہے، تمہیں بہت ساری باتیں وہیں سے معلوم ہو جائیں گی۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سن لو۔" انہوں نے کچھ اس طرح سے کہا کہ علی چونک گیا۔ ایک خوف کی لہر اٹھی جس نے اسے پورے بدن سے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ یہ بات

پوچھنا چاہتا تھا کہ میاں جی نے کہا ''آؤ چلیں......!'' یہ کہہ کر میاں جی چل پڑے تو علی بھی ان کے ان کے ساتھ ہولیا۔ چند قدم چلنے کے بعد کہا۔ ''میں...... میں تمہیں بتاؤں گا کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ وہ سب بھی بتاؤں گا جو تم جاننا چاہتے ہو، لیکن اس سے پہلے تمہیں حوصلہ، عزم اور جذب کی ضرورت ہوگی، اپنے اندر کو وسعت دو...... اتنی وسعت کے بہت کچھ سما جائے۔ جتنا برتن ہوگا وہ اتنا ہی بھرے گا نا...... اور اب یہ مت پوچھنا کہ یہ کیسے ہوگا...... اب بچوں جیسے سوال پوچھنا چھوڑ دو میرے بچے۔''

''میاں جی......! آپ کچھ ایسی باتیں نہیں کر رہے جس سے میں جو سمجھ رہا ہوں۔ کہیں وہ......''

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ بستی میں آکر انہوں نے کہا

''اب جاؤ بہن فیضاں کے گھر، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔''

اس پر علی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بلکہ اپنا رخ بدل کر اماں کے گھر کی جانب چل دیا۔ اس کے ذہن پر میاں جی پوری طرح سوار تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آج میاں جی اتنے بدلے ہوئے کیوں ہیں؟

اماں فیضاں واقعی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دروازے کی طرف تھیں اسے دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ گئی۔ بھیرا ریوڑ لے کر جا چکا تھا۔

''بیٹھ پتر......! میں تیرے لئے کھانا لے کر آؤں۔''

''ٹھیک ہے اماں......! جلدی سے لے آ، پھر میں بھیرے کے پاس جاؤں، وہ بے چارہ اکیلا ہوگا۔'' اس نے چارپائی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، اول تو وہ اکیلا ہی ریوڑ چرا لیتا ہے، لیکن میں نے ایک آدمی کا بندوبست کر دیا ہے، وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے، تو کھانا کھا کے آرام کر۔''

''نہیں اماں......! میں نے جانا ہے اس کے پاس۔ بس آپ جلدی سے مجھے کھانا دے دو۔'' علی نے اصرار کیا۔ تو اماں بھی خاموش ہوگی۔

اس وقت علی کچی بستی سے باہر آ گیا تھا اور قدرے تیز قدموں سے اس جانب چلا جا رہا تھا جہاں بھیرا ریوڑ چرانے کے لئے نکلا ہوا تھا۔ وہ چار جانب سے بے نیاز چلتا جا رہا تھا۔ اس کا

سارا دھیان میاں جی کی باتوں کی طرف تھا۔ وہ ایک ایک بات کو بڑی توجہ سے سمجھنا چاہ رہا تھا جس میں اس کے لئے بہت سارے اشارے تھے۔ وہ انہی باتوں میں الجھتا ہوا بھیرے تک جا پہنچا ریوڑ پھیلا ہوا تھا اور بھیرے کے ساتھ ایک شخص دور ایک درخت کے نیچے بیٹھے نگرانی کر رہے تھے۔ یہ بھی ان کے پاس چلا گیا۔ اور پھر دوپہر ڈھل جانے تک علی ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران بہت ساری باتیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ بھیرے اور مہرو کی شادی بھی زیر بحث آئی، بھیرے کو اس بات پر حیرت تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو کس طرح برداشت کر پائے گا؟

ظہر کا وقت ہوا تو علی وہاں ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ اس کا رخ مسجد کی طرف تھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے خیال آیا کہ صبح کی نماز کے بعد نمازیوں کا اس کے ساتھ کیسا رویہ تھا۔ اس کے قدم بجائے مسجد کے اس جنڈ کے درخت کی طرف اٹھ گئے جہاں میاں جی بیٹھا کرتے تھے۔ علی وہاں پہنچا تو میاں جی موجود نہیں تھے۔ ان کی بچھائی ہوئی صف ویسے ہی پڑی تھی اور ایک شخص وہاں پر بیٹھا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔

''میاں جی کدھر گئے؟''

''وضو کرنے گئے ہوئے ہیں، میں نے کہا تھا کہ پانی لا دوں مگر وہ خود چلے گئے ٹوبے کی طرف۔''

''کیا انہوں نے نماز پڑھ لی ہے؟''

''ابھی نہیں، کہہ رہے تھے کہ ایک بندے کا انتظار ہے، وہ آ جائے تو جماعت کروائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پوچھا۔ ''اگر آپ نے وضو کر لیا ہے تو......''

علی نے جلدی سے وضو کیا اور آ کر صف پہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ بستی کی طرف سے آنے والے راستے پر تھا۔ چند لمحے گزرے ہوں گے کہ میاں جی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

''میاں جی اذان دوں......!'' اس شخص نے پوچھا۔

''ہاں دو......! لیکن ٹھہرو...... احمد بخش، یہاں نہیں، وہاں......'' میاں جی نے جنڈ سے قدرے دور اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ صف ادھر بچھاؤ۔''

علی نے تعمیل حکم میں صفیں بچھائیں۔ احمد بخش نے اذان دی۔ اور میاں جی نے امامت کروائی۔ بقیہ نماز سے فراغت کے بعد صفیں دوبارہ جنڈ کے درخت تلے بچھا دیں گئیں۔ چند لمحے

خاموشی کے بعد میاں جی نے کہا۔

"علی......! اب مسجد یہاں بنے گی اور اس کے ساتھ مدرسہ بھی بنانا ہے۔ اور اگر میں نہ رہوں تو میرا وجود خاکی یہاں دفن کرنا، یہ میری وصیت ہے۔" ان کے لہجے میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ علی کے بدن میں پھر سے ایک انجانی لہر سرائیت کر گئی۔ تبھی اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں صبح سے آپ کی باتوں پر غور کر رہا ہوں اور آپ......"

"میری باتوں پر غور کرنا، بس حوصلہ نہیں ہارنا (وہ ذات رب کریم کی بہت عظیم ہے۔ وہ مختار کل ہے، اور نبی ﷺ کی ذات تمام انسانوں میں افضل ترین ہے۔ اللہ رب العزت اور نبی آخر الزماں ﷺ کے درمیان ایک تعلق عشق کا بھی ہے۔ جس کی سمجھ نہ لفظوں میں آسکتی ہے، نہ تفسیروں میں، اگر اللہ چاہے تو یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ساری باتیں سمجھ میں آجائیں، سارے راز آشکار ہو جائیں۔ اور ایسا ہوتا ہے علی......! جب قبولیت ہو جائے۔ یہ قبولیت صرف اور فقط نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے واسطے اور وسیلے سے ملتی ہے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ بس یہ جان لو کہ عشق فنا بھی ہے اور بقا بھی)...... وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں اس فنا و بقا کے فلسفے کی سمجھ آجائے گی۔"

"میاں جی، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز فنا بھی ہے اور پھر وہ بقا بھی ہو؟" علی نے باتوں کا رخ ایک خاص جانب موڑنا چاہا۔

"(ممکن ہے، بلکہ یہ عین فطرت ہے، جب تک فنا نہیں ہے اس وقت تک بقا بھی نہیں ہوتی۔)" میاں جی نے کہا اور صف پر لیٹ گئے۔ احمد بخش انہیں دبانے لگا۔ میاں جی نے اپنی پگڑی کھولی اور چہرے پر لے لی۔ علی ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور بے چین ہو رہا تھا۔ جیسے کسی انہونی ہو جانے کا اسے یقین ہو۔ کافی دیر تک جب میاں جی ساکت رہے تو علی نے گھبرا کر میاں جی کو آواز دی۔ لیکن اسے جواب نہیں ملا۔ علی نے ڈرتے ڈرتے انہیں ہلایا، پھر پگڑی کا پلو ان کے چہرے پر سے ہٹایا تو وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ ایسی نیند جس کی بیداری فقط روز قیامت ہونے والی ہے۔

کچھ دیر بعد علی اور احمد بخش کو یقین ہو گیا کہ میاں جی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" علی نے زیر لب کہا اور پگڑی کا پلو ان کے چہرے پر ڈال دیا۔

☆☆☆

سورج طلوع ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ چاندنی شہر بھر کی چھتوں پر کسی چادر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ پہلے پہر کا چاند مغرب کی جانب محو سفر تھا۔ ایسے میں فرزانہ خاں اپنے کمرے میں پر سکون چاندنی کو تکتی چلی جا رہی تھی لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ نجانے اتنی سوچیں اس کے دماغ میں کہاں سے آگئی تھیں۔ شام ڈھلتے ہی عجیب سی بے چینی اس کے من میں سرائیت کر گئی تھی۔ جیسے کوئی چیز اس کے ہاتھ سے پھسل کر چکنے فرش پر ٹوٹ گئی ہو۔ یا شاید اس کا اپنا وجود دھیرے دھیرے پگھل رہا ہو، اور یہ دھیرے دھیرے گھلتا ہوا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسے وہ کوئی خوشبو ہے۔ یا پھر جیسے اس کی بہت ہی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ کون سی شے اور کس طرح کھو گئی ہے، اس کی اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اور یہی نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت اسے بے چین کر رہی تھی۔ بے سکونی اپنی انتہا کو پہنچی تو کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ اے سی کی مصنوعی خنکی سے اس کا دل گھبرا گیا تھا، تازہ ہوا کا جھونکا اسے زندگی کا احساس دے گیا تو وہ وہیں پر جم گئی۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ اس وجہ تک رسائی حاصل کر لینا چاہتی تھی لیکن کوئی معقول وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اسے یہ احساس تو تھا کہ جب بھی کبھی اسے اپنی اس بے کلی کا ادراک ہوگا تو اس کی بنیاد میں علی کا وجود ضرور ہوگا لیکن کیسے؟ یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ جس دن علی نے اسے سے کہا تھا کہ "محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اسی لئے تو میں نے کہا ہے کہ ہم خود پر نگاہ ہی نہیں کرتے۔ کیا ہم اتنی ہمت، اتنا حوصلہ رکھتے ہیں کہ نتائج کو کھلے دل سے قبول کر لیں۔ ہجر و وصال دونوں ہی ہیں اور پھر یہ نصیب کی بات ہے کس کے حصے میں کیا آتا ہے۔ محبت کے لئے اہل ہونا ہی سب سے بڑی منزل ہے۔" اس دن سے وہ اسی پر غور کرتی چلی آرہی تھی کہ محبت کے لئے اہل کیسے ہوتے ہیں۔ ایسی کیا باتیں ہیں جو کسی کو محبت کرنے کے لئے اہل بنا دیتی ہیں۔ کیا وہ اس قابل ہی نہیں کہ کسی سے محبت کر سکے۔ اس دن وہ بہت روئی تھی۔ اتنا کہ شاید پوری زندگی اس نے اتنے آنسو نہیں بہائے جتنے اس دن بہا دیئے تھے۔ اس دن فرزانہ نے سوچا تھا کہ شاید وہ محبت ہی کو نہیں سمجھتی اس لئے وہ محبت کے لئے اہل نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس سے کسی نے محبت نہیں کی تھی۔ اس کی ماں مریم بی بی جو خاندانی جبر کا شکار تھی اپنی بیٹی کو وہ محبت نہ دے پائی جتنی وہ اپنے بیٹے سے کرتی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کا بھائی اسد خان تھا۔ جسے ہمیشہ

ہر معاملے میں فوقیت ملتی تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس کے لاشعور میں یہی بات بیٹھ گئی تھی کہ لڑکیاں خاندان کی عزت کا باعث نہیں ہوتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ باپ کا خوف اس کے لاشعور میں پروان چڑھتا گیا جو اس کی ماں اسے ہمہ وقت باور کراتی رہتی تھی۔ ایک دولت مند گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ محبت کے لئے ترستی رہی۔ بچپن کی بے بسی گذری، جوانی میں آئی تو اس کا بھائی پڑھنے کے لئے برطانیہ جا چکا تھا۔ اس کی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی اور تب سے اسے اپنی اہمیت منوانے کا جو ردعمل دیا ہوا تھا دھیرے دھیرے ظاہر ہونے لگا۔ باپ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنی بیٹی کو توجہ دے لیکن وقت گزر چکا تھا۔ پرورش کے دوران شخصیت کی تعمیر میں جو ضد، اکھڑ پن، احساس کمتری کے پتھر لگ گئے تھے اب ہٹائے نہیں جا سکتے تھے۔ علی کی مزاحمت نے ایک خواب سے جگا دیا تھا، اسے پھر سے بے اہمیت ہونے کا احساس دے دیا تھا، وہ اس خواب سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس کے نزدیک محبت کا مطلب دوسروں کو اپنا دست نگر بنا لینے کا نام تھا، اور علی اس کا دست نگر نہیں ہوا تھا۔

علی سے آخری ملاقات کے بعد فرزانہ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ وہ جو محبت کا دعویٰ کر رہی تھی، علی نے اسے اہل ہی نہیں مانا تھا، اسی دن سے وہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کیا شے ہے جسے علی محبت کہتا ہے؟ وہ جب بھی اس سوال پر سوچتی، اس کی سوچ اس حد پر آ کر رک جاتی کہ اس کا جواب تو بلاشبہ علی ہی دے سکتا ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ اس سے ملے، پوچھے اور خود کہ اہل ثابت کرے لیکن وہ پھر اسے ملا ہی نہیں۔ وہ شہر سے غائب ہو چکا تھا، اس نے کوشش کر کے علی کے گھر سے بھی معلوم کروایا تھا۔ وہ بھی نہیں بتا سکے کہ وہ کہاں ہے۔ پھر وہ تھک ہار گئی اور سارے رابطے ختم کر کے، اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ چند دن اس نے تنہائی میں گزارے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے ساری سوچیں سلب ہو چکی ہیں۔ وہ اس دنیا میں واحد لڑکی ہے جس کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ وقعت۔ اس کا وجود بے معنی ہے۔ جس وقت اس نے یہ فیصلہ کیا تھا، اس وقت سے ہی ایک انجانی آسودگی اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھی۔ اس کی وحشتوں میں کسی قدر کمی آئی تھی کہ سرشام پھر سے عجیب اور نہ سمجھ آنے والی بے کلی نے اسے گھیر لیا تھا۔ پوری رات گزر گئی تھی۔ بستر بھی اچھا نہ لگا تو کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ بس اس کے سامنے کا منظر تھا، وہ تھی اور سوچوں سے اکتایا ہوا دماغ تھا۔ وقت گزرنے کا احساس نہیں تھا۔ اچانک ایک طرف سے صدائے تکبیر بلند ہوئی۔ کوئی بہت ہی خوش الحانی سے اذان دے رہا تھا۔ فرزانہ کی تمام تر توجہ اس جانب ہو گئی۔ ایک

ایک لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکراتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی پیاسے کو ٹھنڈا میٹھا پانی مل جائے۔ اذان ختم ہو گئی تو وہ چونکی۔ اس نے اپنے سراپے پر نگاہ دوڑائی اور پھر وارڈروب کی جانب بڑھی۔ ایک لباس پسند کیا اور باتھ روم میں گھس گی۔

وہ جائے نماز بچھائے فجر کی آخری رکعت میں تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سلام پھیرا تو اسے یوں لگا جیسے سارے زمانے کا سکون اس کے دل میں سمٹ آیا ہو۔ ایک ایسی الوہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی کہ چند لمحوں تک اسے احساس ہی نہیں رہا کہ وہ کہاں بیٹھی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے تو ابھی اپنے رب سے دعا بھی مانگنی ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیئے لیکن لفظ اس کے ذہن سے محو ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے رب سے کیا مانگے۔ بس اک احساس تھا کہ مانگنا ہے، کیا مانگنا ہے، یہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔ وہ کچھ بھی نہ مانگ سکی، بس ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہی۔ پھر نجانے کیا ہوا، وہ ہوش میں آ گئی۔ اس کے لبوں پر صرف اتنا آیا کہ ”اے اللہ......! تو میرا خالق ہے اور میں تیری مخلوق، تو میرا سب حال جانتا ہے۔ میرے لئے جو بہتر ہے تو وہی کر، مجھے سمجھ عطا کر کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بس مجھے سکون دے دے۔ اس اہل کر دے کہ میں محبت کر سکوں۔ اے اللہ تو ہی میرا پالنہار ہے، تو سب جانتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے، اٹھی، جائے نماز تہہ کی، اسے بیڈ کے ایک جانب رکھا اور پھر لیٹ گئی۔ وہ کچھ دیر پہلے والی کیفیت کو سمجھا چاہ رہی تھی۔ لیکن اس کا وقت ہی نہیں ملا۔ وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ کچھ دیر بعد اسے یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ سورج کی کرن اس کے کمرے میں داخل ہو کر روشنی کر رہی ہے۔

نجانے وہ کون سی جگہ تھی۔ اس نے پہلے زندگی میں اتنی خوبصورت جگہ نہیں دیکھی تھی، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پھولوں کی اس قدر بہتات تھی کہ اسے لگا جیسے یہ کوئی پھولوں کا نگر ہو۔ کسی جانب سفید پھول ہیں تو کہیں چھوٹے چھوٹے کانسی کے پھول لہلہا رہے ہیں۔ پیلے پھولوں کے ساتھ سرخ گلاب، یہ سبزہ اوپر تک کہیں چلا گیا تھا جس کے درمیان میں سے ایک آبشار بہہ رہی تھی۔ اور وہ خود ایک لکڑی کے کاٹیج میں بیٹھی، جس کی کھڑکی سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ صبح کا وقت تھا اور ہلکی ہلکی دھند نے سارا ماحول ہی خوابناک بنا دیا تھا۔ اڑتی ہوئیں تتلیاں، پرندوں کی آوازیں آبشار کا شور سب کچھ ہم آہنگ ہو کر ایک الوہی منظر بنا رہا تھا، اس کے ذہن میں کہیں دور تک کچھ نہیں تھا، اسے بس یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس منظر کا خود بھی حصہ ہے۔ تبھی اس سبزے

میں سے ایک سفید براق گھوڑا نمودار ہوا جس کی سنہری رنگ کی زین تھی۔گھوڑا لکی چال چلتا ہوا، اس کی جانب آ رہا تھا۔اس نے غور سے اس پر سوار نوجوان کو دیکھنا چاہا لیکن اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ شخص کون ہے۔اس کی ساری توجہ اس کا چہرہ پہچاننے کی جانب مرکوز ہوگئی۔لمحہ لمحہ وہ اس کے نزدیک آتے جا رہے تھے اور پھر وہ گھوڑا اپنے سوار سمیت اس کی کھڑکی کے قریب آ کر رک گیا۔ سوار نے اپنے چہرے پر سے رومال ہٹایا۔اس کا دل دھک سے رہ گیا۔وہ علی تھا اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔وہ کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔

"آؤ علی اندر آ جاؤ......!" اس نے پورے خلوص سے کہا۔

"نہیں......! میرے پاس وقت نہیں ہے فرزانہ......! مجھے بہت ساری ذمے داریاں نبھانی ہیں۔تم بہت اچھی ہو، میں تمہیں یہی کہنے آیا تھا۔" علی کے لہجے میں انتہائی خوشگواریت تھی۔

"بس اتنی سی بات......! کچھ اور نہیں کہو گے؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"اپنے دل سے پوچھو......! وہ جو کہے وہی مانو......تم محبت کی راہ پر ہو اور یہ راستہ سیدھا راستہ ہے۔تم پہلی بار مجھے اچھی لگی ہو۔" علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پسند ہے یہ راستہ؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں......!" علی نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں اس راہ پر چلوں گی۔" اس نے کہا پھر اگلے ہی لمحے بولی۔"کیا اس طرح میں محبت کے قابل ہو جاؤں گی۔"

"کیوں نہیں......! یہی راستہ محبت کا راستہ ہے، اور اس پر وہی لوگ چلتے ہیں، جو محبت کے اہل ہوتے ہیں۔بس خلوص شرط ہے۔میری دعا ہے کہ تم ثابت قدم رہو۔" علی نے کہا اور پھر اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا۔نہ اسے الوداع کہا اور نہ ہی اجازت لی۔گھوڑا مڑا اور واپس اسی سمت چلا گیا۔وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔یہاں تک کہ وہ دور کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

فرزانہ کی آنکھ کھل گئی۔چند لمحوں تک اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خواب میں تھی یا حقیقت تھی۔خلاؤں جیسی کیفیت میں تھی۔پھر اسے ہوش اس وقت آیا جب ایک تیز قسم کی خوشبو نے اپنا احساس دلایا۔تب اسے پتہ چلا کہ وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر ہے۔اس نے خواب کی ساری کیفیت کو یاد کیا۔ایک ایک لمحہ، ایک ایک جزئیات اسے یاد تھی۔وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر بہت کچھ سمجھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔وہ جان گئی تھی کہ محبت کے لئے انسان کیسے اہل ہوتا ہے۔اس

نے اپنے سر کو آنچل سے ڈھکا اور آنکھیں موند لیں۔اب اس پر بھی بہت ساری ذمے داریاں تھیں۔

☆☆☆

کچی بستی سے باہر جنڈ کے درخت تلے، جہاں چند دن پہلے تک میاں جی بیٹھا کرتے تھے۔اب وہاں پر علی بیٹھا ہوا تھا۔اسی نے میاں جی کی آخری رسومات ادا کی تھیں۔وہ ان کا جسد خاکی اماں فیضاں کے گھر لے گیا۔وہیں رکھا اور اس کی جیب میں جو آخری پونجی تھی وہ اس نے احمد بخش کو دی کہ وہ قریبی بستی سے کفن خرید لائے۔اسے بھیج کر خود وہیں آ گیا جہاں میاں جی نے نماز پڑھائی تھی۔اس نے خود اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کی اور واپس گھر آ گیا۔اس وقت تک احمد بخش آ گیا تھا۔علی نے خود میاں جی کو غسل دیا۔تب تک کچی بستی اور گردونواح میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ میاں جی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔لوگ اماں فیضاں کے گھر کے باہر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔میت تیار ہو چکی تو اسے لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا۔اور پھر میاں جی کو وہیں دفنا دیا گیا جہاں انہوں نے وصیت کی تھی۔تب اس دن سے علی وہیں بیٹھا تھا۔وہ ایک بار بھی پلٹ کر اماں فیضاں کے گھر نہیں گیا تھا۔وہیں صبح وشام اسے کھانا دے جاتی جسے وہ خاموشی سے کھا لیتا۔یوں چند دن گزر گئے۔

علی کی زندگی بدل چکی تھی۔اسے میاں جی کی باتوں سے اشارے تو مل گئے تھے کہ کچھ نہ کچھ انہونا ہونے والا ہے۔لیکن اچانک ایسا ہو جائے گا، اس کی اسے خبر نہیں تھیں۔یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔جس وقت وہ میاں جی کا جسد خاکی قبر میں اتار رہا تھا، انہی لمحات میں نجانے اس میں اتنا حوصلہ اور عزم کہاں سے آ گیا تھا کہ اس نے اپنے آنسو خشک کر لئے۔بڑی تعداد میں لوگ وہاں پر موجود تھے۔ان میں وہ نمازی بھی تھے جنہوں نے مسجد میں ان سے تلخ کلامی کی تھی۔میاں جی کی قبر پر مٹی ڈال کر جب فاتحہ پڑھ لی گئی تو اس نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہاں پر موجود تمام لوگوں......! آپ میں بہت سارے میرے بزرگ ہیں، بہت سارے میرے ہم عمر اور کچھ چھوٹے ہیں میں آپ سب سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ اگر میاں جی سے کسی کا کوئی مطالبہ ہے تو براہ کرم ابھی مجھے بتائے یا پھر بعد میں مجھ سے رابطہ کر لے۔" یہ کہہ کر اس نے مجمع پر نگاہ ڈالی اور انتظار کیا کہ کوئی بولے گا۔مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ہر جانب خاموشی طاری تھی۔جب کوئی بھی نہیں بولا تو اس نے کہا۔"اگر کسی کا کوئی مطالبہ ہو اور وہ یہاں پر موجود نہیں ہے تو وہ بھی مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ میں یہاں پر آپ سب کی

موجودگی میں ایک اعلان کرنے جا رہا ہوں۔ میاں جی کی وصیت ہے کہ میں انہیں یہاں دفن کروں۔ یہ بات پوری ہوگئی۔ دوسری ان کی وصیت یہ تھی کہ جہاں آپ لوگ کھڑے ہیں یہاں پر ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا جائے۔ میں آپ سب سے تعاون کا طلب گار ہوں۔"

"جب بستی میں ایک مسجد موجود ہے تو پھر ایک نئی مسجد بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" ایک نمازی نے دبی دبی آواز میں کہا تو علی نے اس کی جانب غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ ضرورت ہے یا نہیں ہے، لیکن یہ میاں جی کا حکم ہے، ان کی وصیت ہے۔ یہ میں نے کرنا ہے میں پھر کہتا ہوں کہ میں آپ سے تعاون کا طلب گار ہوں۔"

"بچے یہ تم غلط کر رہے ہو۔ کوئی بھی تم سے تعاون نہیں کرے گا۔ مسجد ہے، بچے پڑھ رہے ہیں، بس ٹھیک ہے، تم کوئی اور کام کرو۔"

"اور کیا کام کرے گا، اس کے یہاں رہنے کا جواز ہی کیا ہے۔" ایک طرف سے آواز آئی تو لوگ منتشر ہونے لگے۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ اس نزاعی کیفیت میں وہ گواہ بنیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ سارا مجمع چھٹ گیا اور وہاں فقط احمد بخش رہ گیا۔

"علی بھائی......! میں آپ کی مدد کروں گا۔"

اس کے یوں کہنے پر علی کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے احمد بخش کو گلے سے لگایا اور پھر وہ وہیں صف بچھا کر بیٹھ گئے۔ تب سے وہ دونوں وہیں موجود تھے۔ احمد بخش اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا لیکن زیادہ وقت وہ وہیں گزارتا۔

اس دن سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ علی تنہا بیٹھا ذکر میں مصروف تھا کہ مہرو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ علی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور اس کی طرف سے کچھ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوگیا۔ مہرو نے کچھ بھی نہ کہا اور بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ یوں کتنا سارا وقت یونہی گزر گیا۔ تب علی نے ہی یہ سکوت توڑا۔

"کیا بات ہے مہرو، کچھ کہنا چاہتی ہو؟" علی نے دھیرے سے کہا تو وہ الجھتی ہوئی بولی۔

"کچھ نہیں، بہت کچھ، یا شاید کچھ بھی نہیں......! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔"

"چلو جو تمہاری سمجھ میں آتا ہے وہی کہہ دو......!" علی نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو

بولی۔

"علی......! سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم دوبارہ یہاں کیوں آ گئے ہو۔" اس نے کہا تو علی نے چند لمحے سوچا اور کہا۔

"تم وفا کو سمجھتی ہو...... جانتی ہو یہ کیا ہوتی ہے؟"

"ہاں......! سمجھتی ہوں کہ وفا کسے کہتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"وہی نبھا رہا ہوں۔" علی نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے۔

"کیا ملا تجھے، ویرانے، بے سکونی، گھر سے بے گھری، لوگوں کی نفرتیں، طعنے......"

"تم نے تو بہت کچھ گنوا دیا ہے مہرو، لیکن تمہیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ مجھے یہاں سے کیا کچھ ملا ہے۔"

"میں تو جو دیکھ رہی ہوں، وہی کہہ رہی ہوں۔" مہرو نے سادگی سے کہہ دیا۔

"ہاں......! تمہیں ایسا ہی کہنا چاہیے۔ لیکن اک ذرا سی وفا کے بدلے، میں نے جو پالیا ہے، اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔" علی نے اصل بات سے پہلو بچاتے ہوئے عام سے انداز میں کہہ دیا۔

"میں بھی تو سنو، آخر تم نے کیا پالیا؟" مہرو آج نجانے کیا سوچ کر آئی تھی بحث کرتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا سن لوگی تم؟" علی نے پھر دامن بچایا۔

"سننا چاہتی ہوں، اس لئے تو کہہ رہی ہوں۔" مہرو نے ضد کی۔

"تو پھر سنو......! مجھے عشق ملا ہے۔" علی نے کہا پھر لحہ بھر توقف کے بعد کہا۔ "اب یہ مت پوچھنا بچوں کی طرح کہ عشق ہوتا کیا ہے۔ یہ نہ کسی کی سمجھ میں آیا ہے اور نہ شاید آئے گا۔ یہ تو وہی جانتا ہے جسے ہو جائے۔ تم جسے بے گھری اور ویرانہ کہہ رہی ہو، میرے لئے ساری دنیا اب ایک جیسی ہے۔ یہ ساری دنیا میرا گھر ہے۔ کیونکہ یہ اس نے بنائی ہے، جس سے میں عشق کرتا ہوں۔ لوگوں کی نفرتیں میرے لئے کوئی حیثیت اس لئے نہیں رکھتیں کہ مجھے اس کی محبت ملتی ہے، اس کی محبت کے سامنے ساری نفرتیں ہیچ ہیں۔"

"تم کیوں اپنا آپ یہاں پر ضائع کر رہے ہو۔ آخر کیا مقصد ہے تمہارا۔" مہرو نے تیزی سے کہا۔

"یہ بات تمہیں کس نے کہہ دی۔" علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں سچائی چھلک رہی تھی۔

"سارا گاؤں کہہ رہا ہے، میرا بھائی رب نواز کہہ رہا تھا کہ تم اس کچی بستی میں کسی خاص مقصد کے تحت آئے ہو، یہاں کے لوگوں کو بہکانے، اب دیکھو......! تم نے جو مسجد اور مدرسہ بنانے کا اعلان کیا ہے، ساری بستی میں اس بات پر تبصرے ہو رہے ہیں، لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔"

"تم کیا کہتی ہو......!" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں......؟ میں نے کیا کہنا، میری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم نہیں جانتے ہم عورتوں کی قدر یہاں ڈنگروں جیسی ہے ہمیں کون پوچھتا ہے۔" مہرو نے تلخی سے کہا۔

"کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ آئندہ آنے والی نسل عورتوں کی عزت کرے۔ تیرے اور میرے نبی ﷺ جو رحمت العالمین ہیں انہوں نے جو عورتوں کو حقوق دیتے ہیں۔ اس کے مطابق عورتیں زندگی گزار سکیں۔"

"میں تو اب بھی چاہتی ہوں۔ میں نے میاں جی سے جو پڑھا......"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ میں جس سے عشق کرتا ہوں۔ اس کی باتیں، اس کے احکامات لوگوں کو بتاؤں۔ انہیں بتاؤں کہ اللہ نے اپنے پیارے اور لاڈلے نبی ﷺ کے ذریعے ہم تک جو پیغام پہنچایا ہے وہ لوگوں کو سناؤں۔ یہی میرا مقصد ہے مہرو۔"

"کیوں، تم ہی کیوں......؟" مہرو نے بچوں کی طرح کہا اور پھر بولی۔ "یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ میاں جی نے جس طرح زندگی بسر کی تم نہیں جانتے۔ یہاں صرف حکم چلتا ہے سیدن شاہ کا۔ اس نے اگر یہ کہہ دیا کہ تمہیں یہاں نہ رہنے دیا جائے تو یہ تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔"

"مہرو......! ظالم اس وقت تک ظلم کرتا ہے جب تک مظلوم اس کا ظلم سہتا ہے، جس دن مظلوم ڈٹ جاتا ہے، اس دن ظالم کا آخری دن شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر مجھے کوئی ڈر نہیں، میری قسمت میں جو لکھا ہے، جو میرا رب چاہے گا، وہ ہو کر رہے گا۔ مجھے کسی سیدن شاہ کا خوف نہیں۔"

"تمہیں خوف اس لئے نہیں ہے کہ ابھی تیرے ساتھ اس نے کچھ کیا نہیں۔"

"وہ جب ہوگا تو دیکھا جائے گا۔" علی نے مسکراتے ہوئے بات ختم کرنا چاہی لیکن مہرو

نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنی ہی رو میں کہتی چلی گئی۔

"تم یہاں پر اجنبی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم وہ کتنا ظالم آدمی ہے۔ سب کچھ تیرے سامنے ہوا، میں اس معاملے میں کتنی قصوروار ہوں کہ میرے بھائی کو بچانے کے لئے مجھے سولی پر لٹکنے کا حکم دے دیا گیا ہے اور میں مجبور ہوں۔ جس دن بھی اماں فیضاں نے کہا، مجھے بھیرے سے شادی کرنا ہوگی۔ بتاؤ، یہ ظلم نہیں ہے۔"

"اور تم بے قصور ہوتے ہوئے بھی سزا پاؤ گی۔ ایسا ہی ہے نا۔" علی نے دھیرے سے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ مہرو کوئی جواب دیتی۔ اس نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تم زندگی ہار جاؤ گی۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہونے والا نا......؟ لیکن سانول، تم سے محبت کرتا تھا، اس نے تمہیں پانے کی خاطر، اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ تم سے عشق کرتا تھا اور تم اس کی موت کو بے موت کہو گی۔ نہیں ایسا نہیں ہے مہرو......! میں جو اگر یہاں بیٹھا ہوں تو اس کے عشق کے صدقے۔ اس عاشق کا لہو اگر اس صحرا نے پیا ہے تو یہاں لازماً پھول کھلیں گے۔ تمہارے اندر جو خوف ہیں۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ نہ تمہیں محبت کا اندازہ ہے اور نہ وفا کے بارے میں جانتی ہو۔ تم خود ڈنگر کی مانند رہنا چاہتی ہو تو رہو۔ کس نے روکا ہے۔ سیدن شاہ نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا، بس......!"

"میں ماننے پر مجبور ہوں۔"

"کیوں......! ڈرتی ہو مر جاؤ گی۔ مرنا تو ہے۔ آج نہیں تو کل۔ تم ڈنگر رہنے پر راضی ہو، اس لئے تمہیں ڈنگر رکھا جاتا ہے۔ اور پھر محبت وہی کر سکتا ہے جو محبت کی لاج رکھتا ہے۔ سانول تیرے لئے مر گیا۔ کبھی سوچا وہ تم سے کس قدر محبت کرتا تھا۔" علی نے قدرے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو مہرو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"علی......! اس نے ہی تو بتایا کہ زندگی ہوتی کیا ہے۔ یہ آتش عشق کس بلا کا نام ہے۔ اس وقت جو میں تیرے پاس بیٹھی ہوں اور تجھے سمجھا رہی ہوں تو میرے اور تیرے درمیان کس کا تعلق ہے؟ سانول کا ہی ہے نا۔"

"یوں سانول کو بدنام نہ کرو۔ اس کی محبت کو گھٹیا ثابت مت کرو۔ جاؤ جا کر سوچو کہ سانول کی تم سے کتنی محبت تھی، وفا کا تقاضا یہی ہے کہ تم اس کے نام پر اپنی زندگی گزار دو۔ اور سنو......! مجھے سمجھانے مت آنا۔ میں اپنی زندگی کسی اور کے لئے وقف کر چکا ہوں۔ جاؤ اب

چلی جاؤ۔"

"ٹھیک ہے علی......! میں جا رہی ہوں، اگر سانول میرے من میں بس گیا تو دوبارہ تیرے پاس آؤں گی ورنہ اپنا چہرہ کبھی تجھے نہیں دکھاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور واپس چلی گئی۔ جبکہ علی اپنے جذبات قابو میں لانے لگا۔ اس کے سامنے سانول کا خون سے لت پت چہرہ آ گیا تھا۔

اسی دن عصر کے وقت جب احمد بخش اس کے پاس آیا تو علی نماز پڑھ چکا تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ چند لمحے احمد بخش کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"احمد بخش......! اب ہمیں میاں جی کی وصیت کے مطابق کام شروع کر دینا چاہیے۔"

"جیسے آپ کا حکم، بتائیں مجھے کیا کرنا ہے۔"

"ہمارے پاس کوئی روپے پیسے تھوڑی ہیں جو چیزیں خرید کر لائیں گے۔ یہ اللہ کی زمین ہے، یہیں سے گارا اور اینٹیں بنائیں گے۔ مسجد بنائیں گے اور مدرسہ تعمیر کریں گے۔ ہم اپنا کام بانٹ لیں گے۔ تم اینٹیں بنانا میں تمہیں گارا بنا دوں گا، پھر دونوں بھائی مل کر دیواریں چن لیں گے۔"

"جیسے آپ کا حکم علی بھائی۔"

"تو ٹھیک ہے، آج ہم اوزاروں کا بندوبست کر لیں، کل فجر کے بعد کام شروع کر دیں گے۔" علی نے کہا تو احمد بخش نے سر ہلایا جیسے وہ اس سے پوری طرح متفق ہو۔

☆☆☆

شام ہونے کو تھی۔ سورج نے مغربی افق کو چھو لیا تھا۔ جب فرزانہ خاں نے اپنی ملازمہ کو آواز دی۔ آواز کی بازگشت میں اس کی ملازمہ کمرے کے اندر آ گئی اور نہایت ادب سے کہا۔

"جی، بی بی سئین"

"بابا سائیں آ گئے ہیں؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"جی ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ ابھی مردانے میں ہیں، وہاں کچھ لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے، جب وہ آئیں تو انہیں بتانا، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔" فرزانہ کے لہجے میں انتہائی درجے کا تحمل تھا۔ اس پر ملازمہ نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"جیسے حکم بی بی سئین۔" یہ کہہ کر وہ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ تنہائی ملتے ہی فرزانہ خاں نے ایک بار پھر اپنے فیصلے کے بارے میں سوچا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی بابا سائیں سے ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لئے وہ اٹھی اور نماز مغرب ادا کرنے کی تیاری کرنے لگی۔

اس وقت فرزانہ خاں نے سلام پھیرا تھا جب ملازمہ اس کے کمرے میں آئی۔ وہ ایک جانب خاموش کھڑی ہو گئی۔ فرزانہ نے بڑے ہی خشوع وخضوع سے دعا مانگی۔ جائے نماز لپیٹتے ہوئے اس نے ملازمہ کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا تو وہ فوراً بولی۔ "خاں سائیں نے آپ کو یاد کیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" فرزانہ نے تحمل سے کہا تو ملازمہ پلٹ گئی۔

سردار امین خاں اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، اس کی نگاہیں داخلی دروازے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ فرزانہ کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا باپ انتظار میں ہے۔ اس نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ باپ نے اٹھ کر اسے پیار دیا اور پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آج ہماری بیٹی نے بڑے تکلفات سے وقت مانگا ہے ملاقات کے لئے، خیر تو ہے نا میرے بچے۔" باپ کے لہجے میں شفقت چھلک رہی تھی۔ تب اس نے کہا۔

"بابا سائیں......! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے میں آپ کی بھرپور مدد چاہوں گی۔"

"کیسا فیصلہ اور کیسی مدد......! صاف صاف بات کہو نا۔" امین خاں نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔

"بابا سائیں......! میں نے ایک این جی او بنانے کا سوچا ہے۔ میں چاہتی ہوں......"

ابھی اس نے بات مکمل نہیں کی تھی کہ امین خاں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہے بیٹا۔" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا "پہلی تو یہ بات ہے کہ ہمارا خاندان لوگوں کی خدمت کرنے والا نہیں۔ ان سے خدمت کروانے والا ہے۔ تم دیکھتی ہو کہ علاقے کے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہماری خدمت کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں ایسا کام نہیں کرتیں۔"

"لڑکیاں کیوں نہیں کرسکتی ایسا کام......؟اس خاندان میں.........."

"میں بحث کے موڈ میں نہیں ہوں بیٹا، خاندان کی روایت اوراس کے مطابق سارے فیصلے مرد ہی کرتے ہیں، عورتیں نہیں۔ میں نے اگر تمہاری ضد کی وجہ سے تمہیں تعلیم دلوادی ہے تو اس کا بے جافائدہ نہ اٹھاؤ میری بیٹی۔" امین خاں نے اسے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اگر مجھے تعلیم دلا کر خاندان کی روایت کو توڑا ہے تو یہ بھی سہی۔ میں ثابت کروں گی کہ میں مردوں سے زیادہ کام کرسکتی ہوں۔" فرزانہ کے لہجے میں بھی ادب اور تحمل تھا۔

"تم کیوں نہیں سمجھتی ہو۔ میں تمہارے بارے میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ تیرا بھائی اسد خاں اپنی تعلیم مکمل کرکے آجائے تو میں تمہیں اس گھر سے وداع کروں، بس ایک سال رہتا ہے اس کا۔ اگر تمہاری ماں ہوتی تو یہ باتیں وہ تم سے کرتی، خیر......!"

"لیکن باباسائیں......! میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میں نے ایک فلاحی تنظیم بنانی ہے۔ اس کے لئے میں ہوم ورک تیار کرچکی ہوں اور میں......"

"تمہاری یہ ساری محنت فضول ہوگی۔" یہ کہہ کر امین خاں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا"جب تک تمہیں ان سب باتوں کی سمجھ آئے گی۔ تم نے برطانیہ چلے جانا ہے۔ چھوڑ ان باتوں کو، بس تم کپڑے خریدو، پہنو، اپنی سہیلیوں کو بلا کر پارٹی وغیرہ کردیا کرو۔ اور خوش رہو۔"

"باباسائیں......! آپ کو بھی پتہ ہے کہ میں ضد کی کتنی پکی ہوں۔ میں آپ سے یہ سب منوالوں گی اس لئے آپ......"

"فرزانہ......! امین خاں نے غضب سے کہا۔" تم میری محبت اور شفقت کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ یہ نہ ہو کہ مجھے تم سے سخت لہجے میں بات کرنی پڑے۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میرے ساتھ بحث مت کرو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔" امین خان نے خود پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے اپنی بات ختم کی جس پر فرزانہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اسے اپنے باپ سے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے تو کبھی اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔ اور کہاں اب سختی سے منع کر رہے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی حیرت ہی اس کے باپ نے پڑھ لی تھی اس لئے اپنے لہجے میں حلاوت بھرتے ہوئے بولا۔ "بیٹی......! دیکھ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ تم اگر کسی کی مدد کرنا چاہو تو جتنا چاہو کرسکتی ہو۔ میں نے یہ خرچ ورچ کے معاملے میں پہلے تمہیں کبھی منع کیا ہے۔"

"بات یہ نہیں باباسائیں۔" فرزانہ نے باادب لہجے میں کہا۔

"تو کیا بات ہے پھر۔" امین خاں نے نرمی سے پوچھا۔

"باباسائیں......! میں آپ کی بیٹی ہوں اور جانتی ہوں کہ خاندانی وقار کیا ہوتا ہے اور ایک عورت کی اپنی عزت کیا ہوتی ہے۔ اب جبکہ میں نے تعلیم حاصل کرلی ہے تو خاندان کے وقار میں کیا کمی آگئی ہے۔ اب میں اپنا آپ منوانا چاہتی ہوں تو آپ مجھے منع کر رہے ہیں۔" فرزانہ نے اپنا موقف اپنے باپ کے سامنے رکھا۔

"تعلیم کی حد تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اس علاقے میں ہماری سیاسی ساکھ بھی ہے۔" امین خان نے دلیل دی۔

"جانتی ہوں باباسائیں......! میں آپ کی سیاسی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں اعتماد اتر آیا تھا۔

"تم کیا جانو یہ سیاسی معاملات کیا ہوتے ہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تمہیں یہ فلاحی تنظیم بنانے کا خیال کس نے دیا۔" امین خاں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"باباسائیں......! یہ خیال مجھے کسی نے نہیں دیا، میں نے خود فیصلہ کیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام تر سوجھ بوجھ صرف مردوں میں ہی ہوتی ہے، عورتوں میں نہیں ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں شکوہ بھرا ہوا تھا۔

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ یہاں کی سیاست، یہاں کے علاقائی معاملات، یہاں کی عوامی نفسیات کو تم نہیں جانتی ہو۔ اور پھر خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ ہمارے وقار کے منافی ہے کہ......" امین خاں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"باباسائیں......! آپ مجھے حکم دے کر منع تو کرسکتے ہیں اور پھر میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی لیکن آپ کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے آپ میرے ارادے کو ختم کرسکیں۔" فرزانہ خاں نے قدرے جوش سے کہا تو امین خاں ایک لمحے کے لئے تو سوچ میں پڑ گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنی بیٹی کے چہرے پر دیکھا اور پھر دھیرے سے پوچھا۔

"تم کرنا کیا چاہتی ہو، بولو......؟"

"میں...... میں نہ صرف خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہوں بلکہ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتی ہوں کہ میں نے بھی اس علاقے کے لوگوں کی فلاح کے لئے کچھ کیا ہے۔ میں آپ کو یقین

دلاتی ہوں کہ میں کبھی سیاست میں نہیں آؤں گی۔'' فرزانہ نے اطمینان سے اپنی بات کہہ دی۔

''مجھ سے کیا مدد چاہ رہی ہو۔'' امین خاں نے دھیرے سے پوچھا۔

''بابا سائیں......! ظاہر ہے اس فلاحی تنظیم کو چلانے کے لئے سرمایے کی ضرورت ہے۔ اللہ سائیں کا ہم پر بہت کرم ہے۔ اس فلاحی کاموں میں خرچ ہونے والا سرمایہ آپ ہی کا ہوگا۔'' فرزانہ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''بیٹی......! پھر تم نے اپنا آپ کیا منوایا۔'' امین خاں نے تیزی سے کہا۔

''میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ بغیر سرمایے سے اپنا کام شروع کردوں، لیکن پھر بات آپ پر آئے گی کہ بیٹی کو کچھ نہیں دیا۔ مجھے خود پر بھروسہ ہے بابا سائیں۔ بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔'' اس نے بہت نرمی سے کہا تو امین خاں سوچنے لگا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے بیٹی جیسا تم کہو۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔''

''آپ کی شرط، میرے سر آنکھوں پر، آپ کہیں بابا۔''

''میں جب بھی تمہاری شادی کے بارے میں فیصلہ کروں تم اس این جی او کا یا اور کوئی دوسرا بہانہ نہیں بناؤں گی۔ تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ میرا ہر فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' فرزانہ خاں نے حتمی لہجے میں کہا تو امین خان کے چہرے پر پھیلا ہوا تردد لمحے میں صاف ہوگیا۔

''بولو......! تمہیں کتنا سرمایہ چاہیے۔'' امین خاں نے کہا تو فرزانہ کے چہرے پر خوشی کے چراغ روشن ہوگئے۔

''نہیں بابا سائیں، اتنا کچھ ابھی میرے پاس ہے، میں بعد میں آپ کو بتادوں گی۔ ابھی تو آپ مجھے ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی خالی کروادیں۔ میں اپنا آفس وہیں بنواؤں گی۔'' اس نے کہا تو امین خاں نے سر ہلا دیا جیسے وہ اس کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوگیا ہو۔ پھر ڈنر کے بعد تک یہی معاملہ زیر بحث رہا۔ فرزانہ نے اپنی بات منوالی تھی۔

☆☆☆

ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن صبح کی روشنی چاروں جانب پھیل چکی تھی۔ صحرائی وسعتوں میں دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا مدہوش کررہی تھی۔ ایسے میں کچی بستی سے باہر، جنڈ کے درخت

سے پرے، جہاں میاں جی ابدی نیند سو رہے تھے۔ وہیں پر علی اور احمد بخش مصروف تھے۔ نماز پڑھتے ہی دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ علی نے پانی لانا شروع کردیا جو قریب ہی ایک ٹوبے میں جمع تھا۔ چولستان میں بارشوں کا پانی ایک بڑے سے زیریں زمین کے ٹکڑے میں جمع ہو جاتا ہے۔ جہاں سے اگلی بارشوں تک جانور اور انسان اکٹھے ہی پانی پیتے ہیں۔ عموماً بارشیں بہت کم ہوتی ہیں اس لئے انہیں ٹوبوں کا ذخیرہ شدہ پانی کام آتا ہے، اگر یہ ٹوبے سوکھ جائیں تو روہی کے لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ٹوبے میں سے علی پانی لا رہا تھا۔ اس دوران احمد بخش نے گارا بنانے کے لئے مٹی اکٹھی کرلی تا کہ اس سے اینٹیں بنائے۔ جب تک سورج نکلا اور اس نے اپنی تپش صحرا پر بکھیرنا شروع کی۔ دونوں نے مل کر اچھا خاصا کام کرلیا تھا۔ علی پانی بھرتے ہوئے نہیں تھک رہا تھا، جبکہ احمد بخش مشینی انداز میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ اماں فیضاں نے آکر انہیں کام سے روکا تا کہ وہ کھانا کھالیں۔ یوں شام ڈھلنے تک انہوں نے اچھا خاصا کام کرلیا تھا۔ مغرب کی نماز جب وہ پڑھ چکے تو بھیرا ان کے لئے کھانا لے کر آگیا۔

''یار بھیرے تو میرے لئے خواہ مخواہ کھانا لے آئے ہو۔ میں نے گھر سے جا کر کھالینا تھا۔'' احمد بخش نے کہا تو بھیرا بولا۔

''اماں نے دے دیا اور میں لے آیا۔ اب بھالا علی بھی تو میرے ساتھ جائے گا۔''

''نہیں بھیرا......! میں نہیں جاؤں گا، اب میں نے یہیں رہنا ہے۔''

''وہ کیوں بھالا......! جب گھر ہے تو پھر یہ کیا بات ہوئی۔'' بھیرے نے قدرے حیرت سے کہا۔

''نہیں اب ہم گھروں میں نہیں رہ سکتے۔ تم اب جاؤ۔'' علی نے بھیرے سے کہا اور اٹھ کر ایک جانب چل دیا۔ وہ چند لمحے تو علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا جیسے اسے علی کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

قدرت اور انسان کے درمیان جو پردہ ہے وہی راز ہے۔ قدرت نے بہت سارے راز کھول کر بیان کردیئے ہیں اور بذات خود انسان کو اپنی نشانیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو اسے غور سے دیکھو، یہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔ کچھ راز مخصوص بندگانِ خدا کے لئے ہیں۔ وہ انہی پر کھلتے ہیں۔ اصل میں یہ بھی اک امتحان ہے۔ جس میں جذب نہیں ہوتا۔ وہ پھٹ پڑتا ہے۔ انا الحق کا نعرہ کبھی منصور لگاتا ہے اور کبھی بلھے شاہ بھی یہی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور جن میں جذب

ہوتا ہے۔ وہ خود ایک راز بن جاتے ہیں، وہ اس تماشا گاہِ ہستی میں سب کچھ دیکھتے ہیں اور اپنے رب کی بندگی میں ھل من مزید کی خواہش کرتے رہتے ہیں۔ اور کچھ راز قدرت نے کھولے ہی نہیں۔ پتہ نہیں وہ قیامت کے بعد کھلیں گے یا نجانے کب؟ بہر حال راز اور کھوج کی اس کشمکش میں انسان صدیوں سے کھویا ہوا ہے اور نجانے کب تک اسی تگ و دو میں لگا رہے گا۔ ممکن ہے اسی معاملے کو کھیل تماشہ کہا گیا ہو۔ جس کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ یا بہت زیادہ رسائی مادھو لعل حسینؒ نے حاصل کر لی ہو۔ اس نے بھی یہیں پر آ کر اپنی کتابیں کنویں میں پھینک دیں تھیں اور پھر اس کھیل تماشے کا حصہ بن گیا۔ بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ آخر اس کارخانہ قدرت کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس پر غور و فکر کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا۔ ان رازوں پر جو پردے ہیں۔ ان کے کھوج کی جو تگ و دو ہے، اصل میں وہی "شے" وہی "توانائی" ہی اس تگ و دو میں زندگی بھرتی ہے۔ وہ شے، وہ توانائی صرف اور فقط عشق ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو اپنے عشق میں جتنا پر خلوص ہوگا۔ اپنے معشوق کے لئے جتنی تڑپ رکھتا ہوگا۔ اتنے ہی راز اس پر آشکار ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔)

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ صحرائے چولستان میں کھلے آسمان کے نیچے علی صف بچھائے تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ نہ تو اسے میٹھی مدہوش کر دینے والی ہوا کی پروا تھی اور نہ ہی تنہائی کا خوف تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس بھی نہیں کر رہا تھا، اس کے ساتھ اللہ کی ذات تھی، جس کی بندگی میں وہ مصروف تھا۔ ایک خاص وقت تک وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہا اور پھر وہیں صف پر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ میاں جی نے جو سبق اسے روزانہ پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ وہ سبق وہ دہرا چکا تھا۔ اس لئے ذکر ختم ہونے پر وہ پرسکون ہو گیا۔

وہ کھلے صحرا میں چلتا چلا رہا تھا۔ اگرچہ اس کی رفتار کم تھی مگر قدموں کے حساب سے وہ زیادہ فاصلہ طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی ہوا کے تخت پر سوار ہے۔ اسے چلنے کی ذرا سی مشقت کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے پاؤں کے نیچے ریت نہیں پھول کی پتیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ اگرچہ سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا مگر اس کی ذرا سی تپش بھی نہیں تھی۔ اس کے لئے سورج تمازت دینے والا نہیں بلکہ روشنی کا منبع ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مدہوش تھا اور اسی عالم میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے سامنے ایک بڑا سا ٹیلہ آ گیا جو اس کے قد سے بھی اونچا تھا۔ وہ اس پر چڑھنے لگا۔ چند منٹ چڑھتے رہنے کے بعد جیسے ہی وہ چوٹی پر پہنچا، دوسری

جانب دور سے اسے اک نخلستان دکھائی دیا۔ کھلے صحرا میں نخلستان دکھائی دے جانے پر طمانیت کا احساس اس کے من میں اتر گیا۔ وہ ٹیلے سے اتر کر اس نخلستان کی جانب بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ سر سبز درختوں میں گھرے ہوئے قطعے تک پہنچا، ٹھنڈی ہوائیں اس کے بدن سے ٹکرانے لگیں۔ اس کی روح تک میں فرحت کا احساس گھل گیا۔ وہ چلتا چلا گیا یہاں تک کہ درختوں کے جھنڈ میں بنے ہوئے تالاب کے کنارے میاں جی کو بیٹھا دیکھ کر چونک گیا۔ وہ سرخ قالین پر سنہری مسند پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا لباس بیش قیمت تھا، جس میں جڑے ہوئے ہیرے موتیوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھی۔ وہ انتہائی ادب سے ان کے پاس گیا تو انہوں نے نہایت شفقت سے کہا۔

"آؤ علی آؤ......! ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔"

علی نے حکم کے تابع مسند کے دوسرے کنارے پر ٹیک لگالی۔ تو میاں جی نے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ علی کے بولنے کے منتظر ہوں۔

"آپ اتنی جلدی کیوں مجھے تنہا چھوڑ کے آ گئے ہیں۔"

"اس لئے کہ میرا وقت ختم ہو چکا تھا اور تمہارا وقت شروع تھا۔ مجھے آنا ہی تھا۔ یہی رضائے الٰہی ہے۔"

"اور میں......!" علی نے کچھ کہنا چاہا لیکن میاں جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میرے بیٹے نہیں، تم تنہا نہیں ہو، تمہارے ساتھ تمہارا یقین ہے۔ اسی کو مضبوط رکھنا تم کبھی تنہا نہیں رہو گے۔ کیا تمہیں پتہ نہیں ہے کہ انسان کے درجات کیوں بلند ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی بندگی مقام قبولیت پر فائز ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ کو فنا کرو تبھی بقا کے مقام رضا تک پہنچ پاؤ گے میرے بیٹے۔"

"یہ فنا اور بقا کا فلسفہ.........." علی نے پوچھنا چاہا مگر فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

"میں نے آج تمہیں بلایا ہی اس لئے ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ پھر شاید ہماری ملاقات کبھی ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ بس یہ بات ذہن میں رہے کہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، بدن کی قید سے آزادی کے بعد روحانی تصرف میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اتنا اضافہ کہ جس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن......! یہ ہوتا میرے رب کی مرضی سے ہے۔ آؤ، اٹھو، میں تمہیں سب کچھ دے دوں۔" یہ کہتے ہوئے میاں جی اٹھ گئے۔ علی اٹھا تو انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔ علی خوشبو

کے احساس سے مدہوش ہوگیا۔ چند لمحے یونہی ساتھ لگے رہنے کے بعد میاں جی نے علی کو خود سے الگ کیا اور کہا۔ ''فنافی الشیخ کے بعد فنافی الرسول کا درجہ ہے، اور پھر فنافی اللہ ہے۔ ابھی تمہیں بہت ساری منزلیں طے کرنا ہے۔ فنافی الشیخ کی راہ پر چل نکلے ہو۔ میری دعا ہے کہ تم ثابت قدم رہو۔'' میاں جی نے کہا اور علی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ علی مدہوش ہوتا چلا گیا۔ میاں جی نے اسے مسند پر لگایا۔ وہ گہری نیند سوگیا۔ میاں جی نخلستان میں کہیں غائب ہوگئے اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ علی نے حیرت سے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہاں نہ مسند تھی اور نہ ہی نخلستان مگر ٹھنڈک اور خوشبو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے پھر دھیرے دھیرے وہ سمجھ گیا کہ یہ معاملہ کیا ہوسکتا ہے۔ اس نے زیر لب درودِ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ وہ کافی دیر تک مسحور سا بیٹھا رہا۔ پھر تہجد کے لئے اٹھ گیا۔ اسے آج پھر دن بھر کام کرنا تھا۔

☆☆☆

اس وقت دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا جس کی روشنی میں پیر سیدن شاہ کی محل نما حویلی چمک رہی تھی۔ اس وقت سیدن شاہ اپنے کمرہ خاص میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے اس کا مرید خاص پیراں دتہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ سیدن شاہ کا چہرہ غیظ و غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو اڑا دے۔ اس نے پیراں دتہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ بڈھا تو مر گیا اور تمہارے خیال میں وہ اپنا چیلہ چھوڑ گیا ہے یہاں پر...... مطلب، اتنا بڑا معاملہ ہوگیا اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔''

''یہ تو ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شہری لڑکا اس طرح یہاں صحرا میں بیٹھ جائے گا۔'' پیراں دتے نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ جس دن دوبارہ یہاں آیا تھا۔ تم نے اسی دن اس کا بندوبست کیوں نہیں کر دیا......'' سیدن شاہ نے انتہائی غضب سے کہا اور پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ''خیر، اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ یہاں پر کیوں بیٹھا ہے۔''

''پیر سائیں......! اس کا انداز تو وہی ہے جیسے کسی مرید کا ہوتا ہے۔'' پیراں دتے نے یوں کہا جیسے وہ سیدن شاہ کو یاد دلا رہا ہو کہ یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکا ہے۔

''پیراں دتہ......! یہ اور بھی غلط بات ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور کی پیری

مریدی کیسے چل سکتی ہے۔ یہ لڑکا لوگوں کی نفسیات سے کھیلے گا اور......'' سیدن شاہ کہتے کہتے رک گیا۔

''سائیں......! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں وہ پیری مریدی کے چکر میں ہی بیٹھا ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں......! میں اس لڑکے کے پیچھے اور بہت کچھ بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ جو بھی ہوگا خود بخود سامنے آجائے گا۔ تم آج ہی جاؤ اور انہیں کام سے روک دو۔ جتنی جلدی ممکن ہوسکے انہیں یہاں سے بھگا دو۔ جو بھی سامنے آئے گا۔ میں دیکھ لوں گا۔'' سیدن شاہ نے حکم صادر کر دیا۔

''جیسے حکم سائیں کا؟'' پیراں دتے نے قدرے جھکتے ہوئے کہا اور پھر ویسے ہی کھڑا رہا۔

''اب کیا بات ہے؟'' سیدن شاہ نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پیراں دتے نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''پیر سائیں......! ایک خبر اور بھی ہے، مجھے امید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا، مگر ہوگیا۔''

''یہ کیا تم پہلیاں ڈال رہے ہو پیراں دتے، سیدھی بات کیوں نہیں کہتے۔'' سیدن شاہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''سائیں اصل میں اسی بات کی وجہ سے ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ علی یہاں پر کیا کر رہا ہے، ورنہ شاید چند دن بعد یہ مجھے پتہ چلتا کہ علی یہاں مسجد اور مدرسہ بنا رہا ہے۔'' پیراں دتے نے تیزی سے کہا جس پر سیدن شاہ اس کی طرف دیکھتا رہا تو وہ تیزی سے بولا۔ ''سائیں......! وہ مہرو ہے نا، جس کے بھائی رب نواز نے سانول کو قتل کر دیا تھا۔''

''ہاں......! کیا ہے، اسے۔'' سیدن شاہ نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''سائیں آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کی شادی سانول کے چھوٹے بھائی۔ بھیرے سے کر دی جائے، مگر اس نے بھیرے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔'' پیراں دتے نے کہا اور کسی سخت قسم کے ردعمل کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار تھا لیکن بات سنتے ہی سیدن شاہ پر تو جیسے حیرت چھا گئی۔ چند لمحے اس سے بات ہی نہ ہوسکی۔ سیدن شاہ نے وحشت زدہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری رعایا ہو کر ہماری حکم عدولی کرے، یہ کیسے ہوگیا پیراں دتہ۔ ایسی انہونی تو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ کیا ہوگیا ہے؟''

''مہرو پہلے میاں جی سے ملتی تھی۔ اس کے لئے کھانا لے کر جاتی رہتی تھی، اب وہ علی سے ملنے بھی گئی تھی۔ اسی نے ہی ورغلایا ہے۔'' پیراں دتے نے تیزی سے کہا۔

''مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے پیراں دتہ کہ علی کو اب تک ہمارے بارے میں پتہ ہی نہیں چلا، اسے خبر نہیں کہ میں اسے لمحوں میں تہہ تیغ کر سکتا ہوں۔ پیراں دتہ پتہ کرو۔ آخر اس کے پیچھے کون ہے۔ کس کی یہ جرأت ہوئی ہے کہ ہمارے علاقے میں اتنی ہمت دکھائے۔''

''جیسے حکم سائیں کا۔'' پیراں دتہ یہ کہتے ہوئے نہایت ادب سے جھکا اور پھر واپس چلا گیا۔ جیسے ہی وہ دروازہ پار کرنے لگا سیدن شاہ نے اسے آواز دی تو پیراں دتے کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ پلٹا اور اسی طرح جھک کر خاموش سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ منتظر تھا کہ سیدن شاہ کیا حکم دیتا ہے۔

''سنو......! مہرو کی شادی چند دنوں میں ہونی چاہیے۔ اگر نہ مانی تو رب نواز کو تم خود پولیس کے حوالے کر دینا۔'' سیدن شاہ کے لہجے میں ایسی غراہٹ تھی جسے سن کر پیراں دتے کو جھرجھری آگئی۔

''جیسے حکم سائیں کا۔'' اس نے کہا اور پلٹ گیا۔ اور سیدن شاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

سیدن شاہ نے اس معاملے کو معمولی سا لیا تھا۔ جیسے آئے دن کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا رہتا تھا۔ اس نے جس قدر اس معاملے کو ڈھیل دی تھی۔ یہ اتنا ہی گھمبیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کو ختم کر دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس کے پیچھے جو بھی ہوگا، وہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت جب سورج نصف النہار پر تھا اور تپش سے پورا صحرا انگارہ بنا ہوا تھا، ایسے میں علی اور احمد بخش دونوں اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے مگر اپنی پوری توانائی سے اینٹیں بناتے چلے جا رہے تھے۔ علی پانی لا کر گارا بنا دیتا اور احمد بخش اینٹیں۔ نجانے ان دونوں میں اتنا جوش اور توانائی کہاں سے آگئی تھی کہ وہ کئی آدمیوں سے زیادہ کام نمٹا رہے تھے۔ ایسے میں علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور احمد بخش سے کہا۔

''اب بس کرو، تھوڑی دیر ستا لیں، پھر نماز پڑھ کر ہی کام شروع کریں گے۔'' علی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے وہیں کام چھوڑ دیا۔ دونوں جنڈ کے نیچے بچھی صف پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت جب وہ نماز پڑھ چکے تھے اور دوبارہ کام کرنے کے لئے اٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ ان کے

قریب ایک فور وہیل جیپ آ کر رکی۔ اس میں سے پیراں دتہ اور چند دوسرے لوگ باہر آگئے۔ تبھی پیراں دتے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''یہ تم دونوں کیا بنا رہے ہو یہاں پر؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ حقارت تھی۔

''مسجد اور مدرسہ۔'' علی نے انتہائی مختصر جواب دیا تو اس نے بپھرتے ہوئے کہا۔

''کس کی اجازت سے بنا رہے ہو۔ تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ اس پورے علاقے کے مالک حضرت پیر سیدن شاہ ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ہمیں سیدن شاہ کی اجازت نہیں چاہیے۔ باقی رہی مالک کی بات تو یہ ساری زمین اللہ کی ہے۔ سیدن شاہ کی نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی حکم ہم پر لاگو ہوتا ہے۔'' علی نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''علی تم جانتے نہیں ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو تمہارا اگر کوئی منصوبہ ہے تو وہ یہاں نہیں چلنے والا، تم لوگوں کو ورغلا تو سکتے ہو لیکن ہمارے خلاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم تمہیں ایک دن کی مہلت دیتے ہیں کہ یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔'' پیراں دتے نے غصے میں کہا تو علی مسکرا دیا اور پھر سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں......! تم مجھے گولی تو مار سکتے ہو لیکن مجھے میرے ارادے سے نہیں ہٹا سکتے۔ یہاں ہر حال میں مسجد بنے گی، مدرسہ بنے گا اور اس کچی بستی کے بچے تعلیم حاصل کریں گے۔ میں نہ سہی کوئی اور کرے گا یہ کام...... اب یہ کام رکنے والا نہیں ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں رُکے گا۔'' پیراں دتے نے کہا اور پھر جیپ کے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ یقیناً وہ پہلے ہی ایسا کرنا طے کر چکے تھے۔ اس لئے ڈرائیور نے جیپ بڑھائی اور جو کچی اینٹیں بن چکیں تھیں۔ جیپ کے نیچے لا کر انہیں توڑنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں گارا اور مٹی پڑا ہوا تھا۔ ان کی ساری محنت برباد ہو چکی تھی۔ تب اس نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لو......! بن گیا جو تم بنانا چاہتے تھے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اتنی ذرا سی محنت برباد ہو جانے پر ہمیں افسوس ہوگا۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم روزانہ آؤ اور روزانہ ہی ہماری محنت برباد کر کے چلے جایا کرو، ہم تمہیں اف تک نہیں کہیں گے۔'' علی نے انتہائی تحمل سے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

''تم محنت کر پاؤ گے تبھی نا، تم دونوں میں سے اگر کوئی بھی ٹوبے کی سمت آیا اور وہاں سے پانی بھرنے کی کوشش کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ آج فقط وارننگ دے کر جا رہے

ہیں۔ کل تمہارے ہاتھ بھی توڑ دیں گے۔'' پیراں دتے نے کہا اور جیپ میں جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس کے دوسرے ساتھی بھی جیپ میں سوار ہوئے، کچھ ہی لمحوں بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔ علی نے گہری سانس لی اور پھر وہیں صف پر بیٹھ گیا تو احمد بخش بولا۔

''علی بھائی......! آپ فکر نہ کریں۔ میں ٹوبے سے پانی لایا کروں گا۔ اگر لڑائی ہوتی ہے تو ہو جائے۔ میں بھی تو کچی بستی کا رہنے والا ہوں۔ میرا بھی اس ٹوبے پر اتنا ہی حق ہے۔'' احمد بخش نے محض اسے تسلی دینے کو کہا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ لوگ انہیں پانی بھرنے نہیں دیں گے۔ تب علی نے کہا۔

''نہیں احمد بھائی......! ہم نے لڑنا نہیں ہے۔ ہم جانور تھوڑی ہیں، ہم تو انسان ہیں۔ اللہ پاک مہربانی فرمائیں گے، وہ بڑا کارساز ہے۔ تم حوصلہ نہ ہارنا، اپنا یقین مضبوط رکھنا۔''

''ٹھیک ہے علی بھائی جیسا تم کہو۔'' احمد بخش نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ دونوں ہی کو معلوم تھا کہ اگر وہ لڑیں گے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ بستی کے لوگ سیدن شاہ کے آگے دم نہیں مار سکتے تھے۔

مغرب تک احمد بخش وہیں رہا اور پھر وہ بھی اپنے گھر چلا گیا۔ اور علی اپنے معمولات میں مشغول ہو گیا۔ بھیرا اسے کھانا کھلا کر واپس چلا گیا تھا۔ علی نے عشاء کی نماز پڑھی اور میاں جی کی قبر کے پائینی آکر بیٹھ گیا۔ اس رات پہلی بار پورے دل سے رو کر اللہ کے حضور دعا کی۔ ''اے اللہ......! تو ہی شرم رکھتا ہے، اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے، مجھے اس منزل سے سرخرو کرنا، تجھ سے بڑا کوئی کارساز نہیں ہے۔ نبی آخر الزماںؐ کے صدقے، میری مشکل حل کر دے اور مجھے استقامت عطا فرما۔'' وہ مسلسل یہی دعا کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے آنکھیں بند کیے خود کو رب کے حضور پیش کیے بیٹھا تھا۔ اسے یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ تاریک آسمان پر تارے بادلوں نے چھپا لئے ہیں۔ بجلی چمکنے لگی ہے۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا جب پہلی بوند اس کے چہرے پر پڑی۔ پھر اس کے بعد لگاتار بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ علی نے سر گھٹنوں میں دبا لیا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ بارش دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی گئی اور پھر بند ہو گئی۔ علی سر نہوڑے بیٹھا رہا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور ٹھنڈ کی وجہ سے اس کا بدن کپکپانے لگا تو وہ اٹھا، اپنے کپڑے نچوڑے اور جنڈ کے درخت تلے پڑی ہوئی صف کو سیدھا کیا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھر گئی تھی۔ اس لئے وہ لیٹا اور سو گیا۔

معمول کے مطابق فجر کے وقت سے ذرا پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھا، اس نے گھڑے کے پانی سے وضو کیا اور تہجد کے لئے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اکیلے ہی فجر کی نماز ادا کی اور وہیں اپنے معمولات میں مشغول ہو گیا۔ دھیرے دھیرے رات کی سیاہی چھٹی، نیلگوں آسمان واضح ہونے لگا اور سورج نے سر نکالا تو ہر طرف روشنی ہو گئی۔ احمد بخش نے آکر جب سلام کیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''علی بھائی یہ سب کیا ہے؟'' احمد بخش نے حیرت سے پوچھا جس کی علی کو سمجھ نہ آئی۔

''مطلب، کیا، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' علی نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''یہاں ہر طرف جل تھل ہے، وہ ایک گڑھے میں پانی بھی اچھا خاصا جمع ہو گیا ہے لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا......؟'' علی نے تیز سے پوچھا۔

''غور سے دیکھو، اس جنڈ سے آگے کچی بستی کی طرف، وہاں ایک قطرہ بھی بارش کا نہیں برسا۔'' احمد بخش نے حیرت سے کہا تو علی نے کھڑے ہو کر غور سے دیکھا۔ ایک ذرا سے قطعہ اراضی پر بارش ہوئی تھی اور خوب ہوئی تھی۔ ایک بڑے سے گڑھے میں پانی جمع ہو گیا تھا اور سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جبکہ جنڈ کے درخت سے آگے کچی بستی کی طرف زمین خشک تھی۔ ایسی خشک کہ لگتا تھا وہاں پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ دھول اڑ رہی تھی۔ علی چند لمحوں تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر وہیں سجدہ شکر میں گر گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہے، جن کی اللہ کے ہاں سنی جاتی ہے۔ دو نفل نماز ادا کرنے کے بعد اس نے احمد بخش کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کوئی بھی پوچھے تو یہی کہنا، یہ اللہ کی مرضی ہے، ساون میں بھی تو بارش ایسے پڑتی ہے کہ ایک کھیت جل تھل ہو جاتا ہے اور دوسرا سوکھا رہتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں علی بھائی کہ مجھے کیا کہنا ہے، آپ بے فکر رہیں اور ایک بات بھی مانیں۔'' احمد بخش نے علی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو علی نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''کیا منوانا چاہتے ہو۔''

''یہی کہ آپ مجھے اپنی بیعت میں لے لیں۔'' احمد بخش نے اتنا ہی کہا تھا کہ علی کو یوں

لگا جیسے اس کے پورے بدن میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔ چند لمحوں تک ساکت سا وہ احمد بخش کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا۔

"احمد بخش......! تم میرے بہت اچھے ساتھی ہو۔ میں اس قابل نہیں ہوں میرے بھائی، اللہ نے اگر ہم پر رحم کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں یہاں پیری مریدی کا ڈھونگ رچا کر بیٹھ جاؤں۔ اس طرح تو ہم پر مزید ذمہ داری آگئی ہے۔ اس وقت سے ڈرنا چاہیے کہ جب ہم اپنی ذمہ داری نہ نبھا سکیں۔"

"لیکن یہ سب کرم یونہی تو نہیں ہو جاتا علی بھائی۔" احمد بخش نے ایک مضبوط دلیل دی۔

"بے شک یونہی نہیں ہو جاتا۔ اللہ کے پیارے بندوں سے محبت کا انعام ہے یہ۔ مگر ہم اس اہل نہیں ہیں میرے بھائی، عشق کا تقاضہ یہی ہے کہ بس عشق کرتے چلے جاؤ۔ کوئی دکھ آئے، کوئی انعام ملے اس سے بے نیاز ہو کر بس عشق کرتے جاؤ۔ ہم فقیروں کو پیری مریدی سے کیا لینا دینا۔" علی نے انتہائی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ کا مرتبہ اور مقام......" احمد بخش نے کہنا چاہا تو علی نے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا۔

"نہ......نہ میرے بھائی (مرتبہ اور مقام صرف اللہ کا ہے اور اس کے بعد حبیب خدا ﷺ کا۔ ہم تو کسی کھاتے میں بھی نہیں۔ بس تم دعا کیا کرو کہ ہمارے جو ٹوٹے پھوٹے اعمال ہیں۔ رب تعالیٰ انہیں قبول فرمائے۔)" علی نے دھیمے انداز میں کہا تو وہ خاموش رہا۔ تب علی نے ہی کہا۔ "چلو آؤ......! کام شروع کریں۔"

احمد بخش خاموش رہا اور اٹھ گیا۔ وہ دونوں پھر سے کام میں مشغول ہو گئے۔ اس بار انہوں نے اینٹیں نہیں بنائیں بلکہ گیلی مٹی سے دیواریں بنانا شروع کر دیں۔ صبح سے دوپہر ہوئی۔ پھر عصر کا وقت بھی قریب آگیا۔ دونوں نے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت وہ دعا مانگ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اٹھ کر پھر سے کام کریں۔ تبھی ان دونوں کی نگاہ ایک جیپ پر پڑی جو تیزی سے ان کی طرف آرہی تھی۔ احمد بخش کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ علی نے اس کی جانب دیکھا اور پھر کہا۔

"احمد بخش، تم نے کوئی بات نہیں کرنی، میں انہیں سنبھال لوں گا۔" لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ جیپ ان سے قدرے فاصلے پر آن رکی۔ پھر اس میں پیراں دتہ کے علاوہ چند

لوگ مزید بھی اتر آئے جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ وہ قدم بقدم آگے بڑھتا چلا آرہا تھا، علی اس طرح خاموش بیٹھا رہا۔ پیراں دتہ عین سر پر آ کے بولا۔

"اُوئے تو کون سی زبان سمجھتا ہے، تجھے کل سمجھایا نہیں تھا کہ یہ سب بند کرو اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔"

"دیکھو، ہم تمہارا کوئی نقصان نہیں کر رہے، پھر تم کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہو۔" علی نے کمال تحمل سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ہمارا کیا نقصان کر سکتے ہو، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ......! ہونہہ......! چلو جاؤ یہاں سے ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔" پیراں دتے نے انتہائی نخوت اور غضب سے کہا۔

"میرے بھائی......! اللہ تم پر رحم کرے، میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں نے یہاں مدرسہ بنانا ہے اور مسجد بھی بنے گی۔ اب تمہاری جو مرضی ہے وہ کرو۔" علی نے کہا تو پیراں دتے نے گن سیدھی کی۔

"دیکھو علی......! لمحوں کا کھیل ہے، میری انگلی کی ایک جنبش سے تمہاری زندگی ختم ہو سکتی ہے؟ لیکن تمہاری موت سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جتنا تمہیں یہاں سے بھگا دینے کا فائدہ ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہاری شعبدہ بازی سے مرعوب ہو جائیں گے۔ عقل کرو اور یہاں سے بھاگ جاؤ۔" پیراں دتے نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو ہونا ہے اس کی مرضی سے ہوگا۔ تم جو چاہو کرو، میں تمہیں نہیں روکنے والا۔" علی نے کہا اور اٹھ گیا۔ احمد بخش بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کام کی طرف بڑھتے، جیپ آگے بڑھی اور تازہ مٹی سے بنی ہوئی دیوار کو توڑنے لگی۔ ڈرائیور نے جیپ کے آگے لگے ہوئے ہیڈرالک سے تھوڑی دیر میں وہ ساری دیوار مسمار کر دی۔ پیراں دتہ ڈرائیور کو اشارے سے سمجھاتا رہا جبکہ علی اور احمد بخش خاموشی کے ساتھ وہ سارا نظارہ کرتے رہے۔ انہیں روکنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ جب وہ ساری دیوار مسمار کر چکے تو پیراں دتے علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آج کی مزدوری تو گئی۔ میں کل پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ چلتا ہوا اس چھوٹے سے تالاب تک گیا جس میں بارش کا پانی جمع ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا تہمند ہٹایا اور وہاں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔ فراغت کے

بعد وہ اٹھا اور انتہائی نخوت کے ساتھ بولا۔ ”لو......! تمہارا یہ پانی بھی گیا۔ اب کہیں اور سے ڈھونڈ کر لانا پانی اور مزدوری کرنا، تاکہ میں کل پھر گرا دوں۔“ اس نے کہا اور قہقہہ لگاتے ہوئے جیپ میں جا بیٹھا۔ پھر چند لمحوں میں وہ وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی احمد بخش نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”علی بھائی......! یہ سب کیا ہے کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔“

”صبر......! میرے بھائی صبر......! یہی ہمارا زادِ راہ ہے۔“

”مگر کب تک ہم یہ ظلم برداشت کرتے رہیں۔“

”جب تک وہ خود اپنے ظلم سے تنگ نہیں آ جائیں گے۔“ علی نے جواباً کہا اور پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو......! ہمارا فرض تو کوشش ہے نا، وہ ہم پورے خلوص سے کر رہے ہیں۔ آگے میرے اللہ سوہنے کو جو منظور ہے، ہونا تو وہی ہے نا۔ بس اس کی رضا میں راضی رہو۔“ علی نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ تو احمد بخش نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔ تو علی نے اسے گلے لگا لیا۔

☆☆☆

سیدن شاہ کے قہقہے سے کمرہ گونج گیا۔ اچھی طرح ہنس لینے کے بعد وہ خوشی سے بولا

”تم نے بہت اچھا کیا، جو بھی کیا بہت اچھا کیا پیراں دتہ، میں خوش ہوا۔ واقعی اسے مار دینا عقل مندی نہیں، بلکہ اسے ذلیل و رسوا کر کے اس علاقے سے نکالنا ہی ہمارے حق میں اچھا ہے۔“

”پیر سائیں......! وہ زیادہ دن نہیں ٹک سکے گا۔ اس نے جو شعبدہ بازی دکھائی تھی، میں وہ بھی غارت کر آیا ہوں۔“ پیراں دتے نے مسکراتے ہوئے کہا تو سیدن شاہ پھر کھلکھلا کے ہنس دیا جیسے یہ بات اسے بہت مزہ دے گئی ہو۔ سو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اب کہاں سے لائے گا وہ پانی، ٹوبے سے تو لوگ نہیں بھرنے دیں گے، وہ پانی میں نے پلید کر دیا۔ اتنے اس کے پاس وسائل نہیں کہ وہ کنواں نکال لے اور اگر وہ وہاں پر کنواں بھی نکال لے تو میٹھا پانی نہیں نکلے گا۔ اب آسمان سے بادل پکڑ کر تو لانے سے رہا۔ بھاگ جائے گا ایک دو دن میں۔“

”چلو اچھا ہے کہ وہ بھاگ جائے، ہمیں اس کی جان نہ لینا پڑے۔“ سیدن شاہ نے قدرِ سنجیدگی سے کہا اور پھر یوں چونکتے ہوئے بولا...... جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

”ارے ہاں......! وہ مہرو والے معاملے کا کیا بنا۔ مانی ہے کہ نہیں وہ۔“

”نہیں سائیں......! وہ ابھی نہیں مانی اور پھر لڑکے والے بھی کون سا دلچسپی لے رہے ہیں پیر سائیں۔“ پیراں دتے نے انتہائی ادب سے کہا۔

”ہاں......! وہ تو چاہیں گے کہ ایسا نہ ہو، معاہدہ ختم ہو جائے۔“

”پیر سائیں......! تو پھر کیا حکم ہے ان لوگوں کے لئے۔“ پیراں دتے نے پوچھا۔

”پھر کیا ہے، رب نواز کو پولیس کے حوالے کرو اور وہ مہرو اگر اچھی ہے تو اسے حویلی میں لے آؤ، وہ یہیں رہے اور ہماری خدمت کرے۔“

”جیسے حکم سائیں کا۔“ پیراں دتے نے لرزتے لہجے میں کہا اور واپس پلٹ جانا چاہا جیسے اسے سیدن شاہ کا یہ فیصلہ اچھا نہ لگا ہو۔

پیراں دتہ، سیدن شاہ کی حویلی سے نکل آیا تھا۔ اب اس کا رخ کچی بستی کی طرف تھا۔ اس کے ذہن پر مہرو چھائی ہوئی تھی۔ وہ آج اسے آخری بار سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ جیپ دوڑائے چلا جا رہا تھا اور اس کے دماغ میں خیالات بھی اسی تیزی سے چل رہے تھے۔ اس نے مہرو کے بارے میں جو سوچا تھا، اب تک ویسا ہی ہوتا چلا آیا تھا۔ اب اس کی پوری کوشش تھی کہ آئندہ آنے والے دنوں میں وہی کچھ ہو جو وہ چاہتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ کچی بستی میں مہرو کے گھر کے سامنے جا رکا۔ پھر جیپ سے اترا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

صحن کے درمیان میں درخت کے نیچے گامن اور جنداں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا ان کے پاس چلا گیا اور علیک سلیک کرتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے سیدھے سبھاؤ بنا کسی تمہید کے پوچھا۔

”ہاں تو چاچا گامن، بتا پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے، کب آ رہی ہے بارات؟“

”پتر......! ہم تو عاجز آ گئے ہیں اس لڑکی سے، ہماری سنتی ہی نہیں ہے۔ مسلسل انکار کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں؟“ گامن نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر تم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکو گے، رب نواز جیل چلا جائے گا اور مہرو......!“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر پُرتجسس انداز میں بولا۔ ”اور مہرو کو پیر سائیں کی حویلی میں جانا پڑے گا۔“ پیراں دتے نے تیزی سے کہا تو گامن اور جنداں کا تو جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جنداں کے منہ سے تو کراہ بھی نکل گئی۔ یہ ایک کھلا راز تھا۔ جو لڑکی پیر سیدن شاہ کی حویلی میں

چلی جاتی تھی۔اس کی حیثیت لونڈی جیسی ہو جاتی تھی۔اس پر سیدن شاہ کا پورا تصرف ہوتا۔اگر چہ وہ وہاں پر اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی لیکن پوری زندگی اس حویلی کے لئے وقف ہو جاتی۔یہ الگ بات ہے کہ جب کبھی سیدن شاہ کا دل بھر جائے تو وہ اسے اپنے کسی مرید کو بخش دے۔جو اس کے ساتھ نکاح بھی تبرک کے طور پر کر لیتا۔سیدن شاہ نے اپنی بیوی اور بچوں کو کبھی پاکستان نہیں رہنے دیا تھا۔وہ کبھی کبھار آتے اور پھر واپس لندن چلے جاتے۔پورے سال میں چند ماہ سیدن شاہ بھی وہاں گزار کے آتا۔یہ محل نما حویلی تو اس کا ڈیرہ تھی جہاں مریدین کے ساتھ روحانی معاملات بھی چلتے اور آسودگی کے لئے تمام ہتھکنڈے اپنائے جاتے۔کوئی بھی نہیں بول سکتا تھا، کیونکہ جو آواز بھی خلاف سمجھی جاتی، اسے ہمیشہ کے لئے دبا دیا جاتا تھا۔

اگر چہ بھیرے کے ساتھ شادی زندگی خراب کرنے والی بات تھی لیکن سیدن شاہ کی حویلی میں رہنا بھی زندگی کو بدترین حالات کے حوالے کر دینے والا فیصلہ ہوتا۔

''تم لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا؟''پیراں دتے نے انہیں ہوش کی دنیا میں لانے کی کوشش کی۔وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔اس لئے پیراں دتے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں جا رہا ہوں، کل تک اپنا فیصلہ سنا دینا، ورنہ پرسوں آ کر مہرو کو لے جائیں گے۔''

''پیراں دتہ......!ہماری بات تو سنو، ہم پر اتنا بڑا ظلم نہ کرو، ہم تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔''گامن نے کھڑے ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میری منت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں چاچا گامن......!یہ تو پیر سائیں کا حکم ہے جو میں نے تم لوگوں کو سنا دیا ہے۔اب تم جانو اور پیر سائیں جانے۔''اس نے کہا اور تیزی سے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔وہ جیپ میں بیٹھا تو اس کا رخ ٹوبے کی طرف تھا، جہاں لڑکیاں پانی بھرنے کے لئے گئی ہوئیں تھیں۔پیراں دتے نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مہرو ضرور اس وقت پانی بھرنے گئی ہو گی۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔مہرو سر پر گھڑا رکھے اکیلی چلتی چلی آ رہی تھی۔اس نے جیپ اس کے قریب روک دی اور اتر کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔مہرو سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔کسی قدر خوف بھی مہرو کی نگاہوں میں اتر آیا تھا کہ نجانے یہ شخص اس کا راستہ روک کر کیوں کھڑا ہو گیا ہے۔چند لمحوں تک ان میں کوئی بات نہیں ہوئی۔تب مہرو بولی۔

''کیا بات ہے، کیوں میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہو؟''اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا جیسے پیراں دتہ کی یہ حرکت اسے قطعاً پسند نہ آئی ہو۔

''یوں تیرا راستہ نہ روکوں تو پھر تم سے بات کیسے کروں، میں جب بھی تیرے گھر گیا ہوں تم سے بات ہی نہ ہو سکی۔میں نے سوچا آج اکیلے میں تم سے ضرور بات کر کے رہوں گا۔''

''کیا بات کرنی ہے تم نے۔''مہرو کے لہجے میں حیرت گھلی ہوئی تھی۔

''مہرو......!تم جانتی ہو کہ اگر تم نے بھیرے کے ساتھ شادی نہ کی تو پھر تمہیں پیر سائیں کی حویلی میں جانا پڑے گا اور رب نواز کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا؟''

پیراں دتے نے اپنے لہجے کو گھمبیر بناتے ہوئے کہا۔تو مہرو نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''میں جو کہنا چاہتا ہوں، اسے تم خوب سمجھتی ہو۔''اس نے مسکراتے ہوئے مہرو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔بلاشبہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی کہ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔

''صاف بات کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''وہ بولی اور پھر ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔''یہ تو جانتی ہوں، کہ تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو۔دھمکانے آئے ہو؟''

''نہیں میں تمہیں حالات سے باخبر کرنے آیا ہوں۔ایسا ہو جائے گا، لیکن اگر تم چاہو تو بہت کچھ بدل بھی سکتا ہے بلکہ سب کچھ ہی بدل سکتا ہے۔''

''میں نے کہا نا صاف بات کرو۔''مہرو نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''تو سنو......!اگر تم میری بات مان لو، تو نہ تمہاری شادی بھیرے سے ہو گی، تمہیں پیر سائیں کی حویلی میں بھی جانا نہیں پڑے گا اور رب نواز بھی بچ جائے گا۔''

''یہ اتنے سارے احسان مجھ پر کیوں ہو رہے ہیں۔یہ میں پوچھ سکتی ہوں۔''مہرو نے اس سے پوچھا۔

''دیکھو مہرو......!تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔پتہ نہیں کب سے تو میرے دل میں بس چکی ہے۔میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، تو میری ہو جا۔میں سب دیکھ لوں گا۔''

''تم ہوش میں تو ہو پیراں دتہ......!''مہرو نے حیرت سے کہا۔

''میں تو تمہارے لئے کب کا ہوش کھو چکا ہوں۔مجھے معلوم تھا کہ سانول تم سے بہت پیار کرتا ہے، عشق کرتا تھا تم سے، اس لئے جب تک وہ رہا میں تم سے کوئی بات نہیں کہہ سکا۔اس نے تمہیں بھگانے کی بے وقوفی کی اور بے موت مارا گیا۔رب نواز اسے نہ مارتا تو کوئی اور مار دیتا۔

اسے تو مرنا ہی تھا۔"

"مطلب......تم نے......" مہرو نے کہنا چاہا لیکن شدت حیرت سے لفظ ہی اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔

"ہاں میں نے...... میں نے چاہا تھا کہ وہ قتل ہو جائے، وہ ہو گیا۔ اب پیر سائیں نے جو فیصلہ کیا وہ بھی میرے کہنے پر کیا۔"

"تم نے ایسا کیوں پیراں دتہ......؟" مہرو روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

"بھیرا تو بچہ ہے۔ تمہاری شادی اس سے رہتی اور تم میرے لئے......" پیراں دتے نے خباثت سے ہنستے ہوئے کہا تو مہرو پوری جان سے لرز گئی۔ اس نے جو سر پر گھڑا اٹھایا ہوا تھا، وہ ڈولا اور دھڑام سے نیچے آ گرا۔ مہرو کے بدن میں جان ہی نہ رہی تھی۔

"تم بہت بے غیرت ہو پیرداں دتہ......" مہرو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بے غیرت ہوں تو کتوں کی طرح پیر سائیں کی چوکھٹ پر پڑا ہوں نا۔ رب نواز نے غیرت دکھائی ہے تو کیا ہوا، وہ بھی تو کتوں کی طرح پیر سائیں کی چوکھٹ پر پڑا ہے نا، ان کے رحم و کرم پر۔ کیا غیرت اور کیا بے غیرتی......اسے چھوڑ اور چپ چاپ بھیرے سے شادی کر لے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شہزادیوں کی طرح رکھوں گا تمہیں۔"

"مجھے مرجانا قبول ہے پیراں دتہ لیکن میں اپنے آپ کو کتوں کے آگے نہیں ڈالوں گی۔"

"تو پھر مر جاؤ" پیراں دتے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن سنو......! تم اکیلی نہیں مرو گی، تیرا بھائی، تیرے ماں باپ سب دفن ہو جائیں گے۔ تیرے خاندان کا نام ونشان تک نہیں رہے گا۔ میں تمہارے خاندان کو لوگوں کے لئے عبرت بنا دوں گا۔"

"میرے سامنے سے ہٹ جاؤ پیراں دتہ......!" مہرو نے غراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تیری یہی ادائیں تو پسند ہیں مہرو، خیر......! تم خوب سوچ سمجھ لو، میری بات مان لے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عیش کرے گی عیش، ورنہ میں تمہیں ذلیل کر کے رکھ دوں گا۔"

"جو خود ذلیل ہو وہ کسی کو کیا ذلیل کر سکتا ہے، آج تو تم نے مجھ سے بات کر لی ہے، آئندہ اگر میرے ساتھ ایسی بے غیرتی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" مہرو نے کہا اور اپنا آپ بچاتے ہوئے ایک پہلو سے نکل گئی۔ تب پیراں دتے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

مہرو جا چکی تھی پیراں دتہ مسکراتے ہوئے جیپ میں بیٹھا اور خوش کن خیالوں میں گنگناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

گرمیوں کی راتیں بڑی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا جب نگہت بیگم اپنی چارپائی سے اٹھی۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو دیکھا جو صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر غلام نبی کی چارپائی تھی۔ وہ اٹھی اور صحن کے کونے میں دھرے کولر تک گئی جس میں ٹھنڈا پانی بھرا ہوا تھا۔ تھوڑا سا کھٹکا ہوا تو غلام نبی نے گردن گھما کے دیکھا اور دھیمی سی آواز میں کہا۔

"بیگم......! مجھے بھی پانی دینا۔"

"جی اچھا۔" نگہت بیگم نے بھی اسی طرح دھیمی آواز میں جواب دیا اور پھر خود پانی پی کر اپنے شوہر کے لئے پانی لے آئی۔ غلام نبی نے پانی پیا اور گلاس واپس کرتے ہوئے بولا۔

"ارے نیک بخت ذرا بیٹھو، میں نے تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔" اس نے کہا تو نگہت بیگم بیٹھ گئی اور بولی۔

"ایسی کیا بات ہے۔"

"بات یہ ہے نگہت کہ ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا اور امیر آدمی رہتا ہے۔ بہت لمبا چوڑا کاروبار، جائیداد وغیرہ ہے ان کی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر بولا۔ "شاید تم نے بھی اس کا نام سنا ہو گا، سردار امین خاں ہے اس کا نام۔"

"وہی ہے نا جو الیکشن لڑتا ہے۔ پچھلی بار ہم نے انہیں ووٹ دیئے تھے۔" نگہت بیگم نے بتایا۔

"ہاں......! بالکل وہی۔" غلام نبی نے کہا تو نگہت بیگم اس کی بات سننے کی منتظر رہی۔

"اس کی بیٹی ہے فرزانہ خاں اس نے آج مجھے بلوایا تھا۔ اور میں اس سے ملنے چلا گیا۔"

"اللہ خیر کرے، بات کیا تھی۔"

"بات ہمارے فائدے کی ہے۔" غلام نبی نے دھیرے سے کہا۔

"اچھا اب بتا بھی دیں۔" نگہت بیگم نے تجسس میں بے تابی سے کہا۔

''بیگم......! میں پریشان تھا کہ اس سال جب میں ریٹائر ہوگیا تو پھر میں کیا کروں گا۔ پنشن سے تو میں بیٹی بیاہ دوں گا، اور اگلے دو سالوں میں احسن کی تعلیم بھی مکمل ہوجائے گی۔ وہ لڑکی تو میرے لئے فرشتہ بن گئی ہے۔''

''اچھا وہ تو بتائیں کہ اس نے بلایا کیوں تھا۔''

''اس نے مجھے نوکری کی آفر کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب تک میں ریٹائر نہیں ہو جاتا، شام کے وقت اس کے اکاؤنٹ وغیرہ دیکھ لیا کروں۔ پھر بعد میں دن کے وقت، حیرت والی بات یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی خاصی تنخواہ دے رہی ہے، جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' غلام نبی کے لہجے میں واقعتاً حیرت چھلک رہی تھی۔

''وہ کیا کرتی ہے، جس کا اکاؤنٹ......'' نگہت بیگم نے پوچھا۔

''اس نے کوئی فلاحی تنظیم بنائی ہے ظاہر ہے کوئی بہت بڑا سیٹ اپ ہوگا۔ مجھے حیرت اس لئے ہے کہ اس نے مجھے ہی کیوں چنا، وہ تھوڑی تنخواہ پر کسی اور نوجوان کو بھی رکھ سکتی تھی۔'' غلام نبی نے کہا تو نگہت بیگم بولی۔ اس کے لہجے میں دکھ اور اعتماد ملا جلا تھا۔

''میں ایک بات کہوں غلام نبی......! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے آگے دیکھنا کتنی چیزیں ہماری منتظر ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' غلام نبی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرے بچے علی کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ اس وقت تو مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اب مجھے بڑی سمجھ آرہی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں غلام نبی۔ ہم اپنی بیٹی کے رشتے کے لئے کتنے پریشان تھے۔ لیکن ہوا کیا، بیٹھے بٹھائے ایک اچھا خاندان اور اچھا لڑکا مل گیا۔ ہم نے کیا کوشش کی تھی اس کے لئے اور دیکھنا جب وہ بیاہی جائے گی تو بھی روپے پیسے کی فکر نہیں ہوگی۔''

''تیرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری آسانیاں علی کی وجہ سے ہیں جو گھر چھوڑ کر نجانے کہاں چلا گیا ہے؟'' غلام نبی نے پوچھا۔

''ہاں......! اغواء ہونے سے پہلے وہ کچھ اور چیز تھا لیکن اس کے بعد وہ علی رہا ہی نہیں۔ میں اس آزاد پنچھی کو گھر میں قید کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ چاہے تو ابھی آجائے اور چاہے تو کبھی نہ آئے۔'' نگہت بیگم نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' غلام نبی بھی اداس ہوگیا۔

''میں ماں ہوں، اس کی جدائی کو برداشت کررہی ہوں۔ دکھ تو ہے لیکن میری ماتا کو تسلی بھی ہے۔ وہ کچھ بھی غلط نہیں کررہا ہوگا۔ بلکہ اس کی اپنی کوئی مرضی رہی نہیں ہوگی۔'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور پھر اپنے شوہر کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''میرا بیٹا، مجھے ملے یا نہ ملے مگر تم سے اب دولت سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔ میرا یقین رکھو۔'' نگہت بیگم نے کہا اور اٹھ گئی۔ غلام نبی نے اس کی پلکوں پر اشکوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ فرزانہ کی آفر قبول کرلے گا۔ لیکن دولت کہاں سے آئے گی، اس کی اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

سورج طلوع ہوئے کافی وقت ہوگیا تھا۔ علی جنڈ کے درخت کے تلے بیٹھا ہوا تھا۔ احمد بخش ابھی تک نہیں آیا تھا جبکہ بھیرا روٹی کھلا کر چلا گیا تھا۔ پچھلے تین دن سے وہ کوئی کام نہیں کرسکے تھے۔ ٹوبے سے پانی بھرنے کی اجازت نہیں تھی اور بارش کا پانی جو گڑھے میں جمع ہوگیا تھا اسے وہ استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کوئی اور ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ جس سے وہ پانی حاصل کرسکیں۔ ان کے پاس صرف ایک ذریعہ اور تھا جس سے پانی حاصل کرسکتے تھے اور وہ تھا کنواں......! مگر اس ویرانے میں جہاں زیر زمین پانی سینکڑوں فٹ گہرائی پر تھا، ان دونوں کے لئے کنواں کھودنا ناممکن سی بات تھی۔ اگر کنواں کھودنے کے لئے انہیں افراد میسر آ بھی جائیں تو وہاں ہر طرف کھارا پانی تھا۔ اس قدر کھارا پانی کہ زبان پر نہ رکھا جاسکے۔ اگر آسانی سے کنواں کھودا جاسکتا ہو اور وہاں میٹھا پانی ہوتو روہی آباد نہ ہوجاتی۔ یہ ساری معلومات احمد بخش نے دی تھی۔ علی نے سب کچھ تحمل سے سن لیا تھا۔ اگرچہ صورت حال خاصی مخدوش ہوچکی تھی لیکن علی کا حوصلہ پھر بھی بلند تھا۔ کل شام تک وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو عشاء کے بعد اس نے تمام تر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کہ تو ہی کارساز ہے، تو ہی کوئی ذریعہ بنائے گا۔ علی منتظر تھا کہ پردہ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔

اس وقت احمد بخش کو آئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کچی بستی کی مخالف سمت سے ایک غبار سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ جو دھیرے دھیرے واضح ہوتا چلا گیا اور پھر انہیں صاف دکھائی دینے لگا کہ ایک جیپ ہے اور اس کے پیچھے ٹریکٹر ٹرالی۔ ٹرالی میں کافی سارے لوگ تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے لوگ ان کے پاس آگئے۔ جیپ میں سے خان محمد برآمد ہوا، جس کے ساتھ چار گن مین تھے۔ ٹرالی میں سے اترنے والے چند لوگوں کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ خان محمد

سیدھا علی کے پاس آیا۔ قدرے جھک کر اور بڑے تپاک سے ملا۔ یہاں تک کہ باری باری لوگوں نے مصافحہ کیا اور وہیں جنڈ کے درخت تلے ریت پر بیٹھ گئے۔

''علی بھائی مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ دوبارہ یہاں آگئے ہیں۔'' خان محمد نے اپنی بات کا آغاز کیا تو علی نے دھیرے سے پوچھا۔

''کیا آپ کو میاں جی کی رحلت کے بارے میں بھی علم نہیں ہوا؟''

''ہوا تھا، لیکن میں آنہیں سکا۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ یہ میرا علاقہ نہیں، سیدن شاہ کے بندے کسی وقت بھی سامنے آسکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جنازے پر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔'' اس نے تفصیل سے اپنی مجبوری کہہ دی۔

''تو پھر آج......'' علی نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مجھے پرسوں پتہ چلا ہے کہ آپ یہاں پر کوئی مسجد اور مدرسہ بنانا چاہ رہے ہیں، لیکن سیدن شاہ کے لوگ آپ کو بنانے نہیں دے رہے ہیں۔ آج پھر میں اس لئے آیا ہوں کہ میں خود آپ کے ساتھ کھڑا ہو کر یہ بناؤں۔''

''میری ہمدردی میں یا سیدن شاہ کی مخالفت میں۔'' علی نے دھیرے سے کہا۔

''علی بھائی......! میں منافقت نہیں کروں گا، سچ کہتا ہوں، میرے سامنے دونوں ہی باتیں ہیں۔'' خان محمد نے صاف گوئی سے کہا۔

''لوگ تو ڈرتے ہیں سیدن شاہ سے۔'' علی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں، لیکن مجھے اس کا خوف نہیں ہے۔ لوگ تو اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ کمزور ہیں۔ خیر......! آپ بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' خان محمد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کیا کر سکتے ہیں آپ؟'' علی نے دھیرے سے پوچھا تو اس نے بنا سوچے تیزی سے کہا۔

''جو بھی آپ چاہیں۔''

''جو بھی میں چاہوں......!'' علی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔ پھر اس نے خان محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔

''آپ لوگ یہاں کنواں کھود سکتے ہو؟'' علی نے کہا تو خان محمد چونک گیا اور پھر

سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''علی......! یہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ پانی جلد نکل آئے۔ اور اگر پانی نکل بھی آئے تو وہ کھارا ہوگا، اس لئے ساری محنت بے کار......''

''نہیں جائے گی، جہاں میں کہوں، وہاں سے کنواں کھودیں۔'' علی نے انتہائی اعتماد سے کہا تو ایک لمحہ کے لئے خان محمد نے سوچا اور پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ جگہ بتائیں، میں کنواں کھدوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' علی نے اتنا کہا اور کسی معمول کی طرح وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ پہلے میاں جی کی قبر پر گیا اور پھر تھوڑی دیر وہاں رک رہنے کے بعد ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک جگہ وہ رک گیا۔ وہاں کافی دیر تک رکا رہا۔ وہیں کھڑے ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں چند لمحے اس حالت میں رہا۔ پھر اس نے تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لئے۔ دو نفل نماز ادا کی اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا لئے۔ اسی طرح کافی وقت گزر گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پھر یوں ہوا کہ جیسے اسے قرار آگیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور مسکراتے ہوئے خان محمد کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب بڑھ گیا۔ وہ قریب پہنچا تو علی نے کہا۔

''اس جگہ، جہاں میں کھڑا ہوں، اس جگہ کنواں کھودیں۔ اللہ کے حکم اور نبی ﷺ کے صدقے یہاں سے شیریں پانی ملے گا۔''

خان محمد نے سنا اور اپنے ساتھ آئے سارے لوگوں کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ تب اس نے کہا۔

''سنو......! یہاں کنواں کھودنا ہے۔ آج اور ابھی سے، جس کے پاس کوئی اوزار ہے تو ٹھیک ہے ورنہ لے آئیں۔ جتنے دن بھی لگیں۔ یہ کنواں ہر حال میں کھودنا ہے۔''

یہ سنتے ہی چند لوگ ٹریکٹر ٹرالی پر بیٹھے اور واپس چل دیئے۔ وہ اوزار لانے گئے تھے۔ احمد بخش نے کسّی علی کے ہاتھ میں دے دی۔ علی نے پہلے زمین پر کسّی ماری۔ یوں ابتداء ہو گئی۔ اور ایک ہفتے تک سینکڑوں آدمی آتے جاتے رہے، اور پانی نکل آیا۔ خان محمد روزانہ وہاں آتا رہا۔ اور جس دن صاف پانی نکل آیا۔ سب سے پہلے اس نے چکھا، شیریں پانی دستیاب ہو چکا تھا۔ جس کا اس صحرا میں تصور بھی نہیں تھا۔ علی سجدہ شکر میں گر گیا۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

شیریں پانی کیا ملا، وہاں تو جشن کا ساسماں بن گیا۔ جس چیز کا وہ تصور ہی نہیں کر رہے تھے، وہ مل جائے تو خوشی کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کا اندازہ ان لوگوں کے چہروں سے لگایا جاسکتا تھا جنہوں نے محنت کی تھی۔ آناً فاناً یہ خبر کچی بستی تک پہنچ گئی۔ جس نے بھی سنا، وہ ہی دوڑتا چلا آیا۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ممکن ہو جائے گا۔ ایک جہان حیرت ان پر وا ہو چکا تھا۔ وہ سب حیران تھے۔ ذرا سی بات ایک افسانے کی صورت اختیار کر گئی۔ عصر کا وقت ہوا تو علی نے خان محمد سے کہا۔

"نماز کا وقت ہو رہا ہے، نماز پڑھ لی جائے۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے صفیں سیدھی ہوئیں۔ تب علی نے احمد بخش کا ہاتھ پکڑ کر امامت کے لئے آگے کر دیا۔ اور کہا۔ "آج سے یہ ذمہ داری آپ کی ہے۔" احمد بخش نے امامت کروائی۔ نماز پڑھی جا چکی تو علی اٹھ کر لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"میرے محترم ساتھیو......! تمام تر تعریفیں اللہ رب العزت کے لئے ہیں۔ کروڑوں درود و سلام نبی آخر الزماں ﷺ پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی ظہور ہوتا ہے وہ تمام تر اللہ کی مرضی و منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ یہاں پر اگر مسجد تعمیر کی جا رہی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ ہم خود کو الگ تصور کرتے ہیں بلکہ یہاں اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ یہاں پر ایک مدرسہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ یہاں بچے تعلیم حاصل کریں گے۔ میرے دوستو......! یہ علاقہ پس ماندہ صرف اور صرف اس لئے ہے کہ یہاں تعلیم کی روشنی نہیں پہنچی۔ انسانوں نے ہی انسانوں کو حقوق دینے ہیں اور وہی فرائض کے ذمہ دار ہیں۔ یہ دین اسلام ہی ہے۔ جس میں علم کے حصول پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے علم کو فرض قرار دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں پر یہ کام بہت کٹھن ہوگا، لیکن میں تو اس کام کا آغاز کر چکا ہوں، آپ بھی میری مدد کیجئے، یہاں بچوں کو پڑھنے کے لئے بھیجئے گا، ہم سب نے مل کر دین کے اہم ترین فرض کو نبھانا ہے۔ کیا میں آپ سے امید رکھوں؟" علی نے کہا اور پھر خاموش ہو کر تمام مجمع پر نگاہ ڈالی۔ اسے زیادہ تر لوگوں کی آنکھوں میں حیرت دکھائی دی کہ یہ بندہ کیا انہونا کام کرنے لگا ہے ایسا کام جس کی وجہ سے وہ یہاں کے طاقتور لوگوں سے ٹکر لینے کی بات کر رہا ہے۔ کئی سارے لوگوں نے تو ہاں کر دی۔ کئی خاموش رہے۔ یوں مجمع چھٹ گیا۔

شام ڈھل گئی تھی۔ خان محمد جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ دوسرے لوگ جا چکے تھے۔ تب وہ

علی کے پاس آیا اور بولا۔

"علی بھائی......! آپ فکر نہیں کرنا، کل سے یہاں مزدور آنا شروع ہو جائیں گے۔ مدرسے اور مسجد کی تعمیر کی تمام تر ذمہ داری میری۔ میں دیکھ لوں گا، آپ بے فکر ہو جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے مصافحہ کیا اور چلا گیا۔ علی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

سوئی ہوئی مہرو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ چند لمحوں تک اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ وہ اچانک یوں کیسے بیدار ہو گئی ہے۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے اپنے چاروں جانب دیکھا، چاند کی ہلکی سی روشنی میں اس کا باپ گامن اور ماں جنداں اس کے پاس اپنی چارپائی پر گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کا بھائی رب نواز تو گھر آیا ہی نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ وہ کسی خواب میں نہیں تھی بلکہ گہری نیند میں تھی کہ اسے لگا جیسے اس کا بازو کسی نے پکڑا ہے اور اسے اٹھا کر بیٹھا دیا ہے۔ ایسا پہلی بار اس کے ساتھ ہوا تھا، حالانکہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنی ہی سوچوں کی وجہ سے بڑی بے چین تھی۔ یہاں تک کہ اسے اپنا وجود بھی برا لگنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سانول کی موت محض حادثاتی نہیں بلکہ سازش کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ محض اس لئے قتل ہو گیا کہ پیراں دتہ کو وہ اچھی لگتی تھی۔

جس وقت پیراں دتہ نے اس پر یہ انکشاف کیا تھا، اس لمحے سے اس کی سانول کے بارے میں سوچ بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اک نئے انداز سے اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ سانول اس سے کس قدر محبت کرتا تھا لیکن یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ اتنی محبت کرنے والا اور کون تھا؟ پیراں دتہ......! جو محض اپنی ہوس کے لئے نجانے کب سے سازش کر رہا تھا۔ وہ اسے کس قدر بھیانک ترغیب دے رہا تھا کہ وہ بھیرے کی بیوی بن جائے اور اس کی بات مانتی رہے۔ کس قدر گھناؤنا شخص تھا وہ۔ اور سانول......! اس کی معصوم محبت، کیا وہ اس کی محبت کو محسوس ہی نہیں کر سکتی تھی، کیا وہ اس قابل ہی نہیں تھی، اس میں اتنی اہلیت ہی نہیں تھی سانول کے عشق کو محسوس کر سکے۔ وہ جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔

کیا محبت انسان کو اتنا بے خود کر دیتی ہے؟ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ پہلے تو وہ سانول کے جرم کو ہی سوچتی تھی۔ سانول کا قتل اس کے جرم کی سزا مانتی تھی لیکن اب اس کا زاویہ نگاہ

ہی تبدیل ہو چکا تھا، وہ اس کیفیت، اس لہر اور اس جذبے کو سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی جس نے سانول کو مجبور کیا کہ وہ مہرو کو اُٹھا کر لے جائے اور زندگی ساتھ نبھانے کی التجاء کرے۔ اگر اس پر انگلیاں اٹھیں تھیں تو کیا سانول نے ساری دنیا کو اس کے لئے نہیں تج دیا تھا۔ وہ سانول جو اپنے دل میں اس کی محبت سمیٹے قبر کی گہرائی میں اتر گیا تھا، کیا اس میں سچائی نہیں تھی، اس میں خلوص نہیں تھا؟ کیا محبت یہ ہوتی ہے، جیسے پیراں دتہ نے کہا؟ نہیں سانول اس کے لئے پرخلوص تھا، اس نے اس کی عزت پر داغ نہیں لگنے دیا تھا اور یہ......! اس نے تو سیدھے سبھاؤ اسے غلاظت میں اترنے کو کہہ دیا تھا۔ وہ مرجائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں کرے گی۔

''اگر وہ مر بھی گئی تو کیا ہوگا...... کچھ بھی نہیں۔ لیکن سانول کی موت رنگ لائی ہے، علی کی صورت میں نہ صرف سانول نے ایک نیا روپ لیا تھا بلکہ اس میں میاں جی کی پوری صورت دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ مرجائے گی تو کیا ہوگا، کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔'' مہرو کے دماغ میں یہ خیال آیا تو وہ چونک گئی۔ یہ صحیح تھا کہ اس کی موت کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی تھی۔ تو کیا اسے زندہ رہنا چاہیے۔ کیوں زندہ رہنا چاہیے؟ اس سوال نے اسے بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا، اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ مایوس ہوگئی، اسے اپنی زندگی بھی اندھیروں میں دکھائی دی۔ یہاں اُمید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ اس کا جینا بھی عذاب اور مرنا بھی بے معنی۔ ایسے ہی بے وقعت لمحوں میں اسے علی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''کیوں، ڈرتی ہو مر جاؤ گی، مرنا تو ہے، آج نہیں تو کل۔ تم ڈنگر رہنے پر راضی ہو، اس لئے تمہیں ڈنگر رکھا جاتا ہے۔ اور پھر محبت وہی کرسکتا ہے جو محبت کی لاج رکھتا ہے، سانول تیرے لئے مرگیا، کبھی سوچا وہ تم سے کس قدر محبت کرتا تھا۔''

''یوں سانول کو بدنام نہ کرو۔ اس کی محبت کو گھٹیا ثابت مت کرو۔ جاؤ جا کر پوچھو کہ سانول کی تم سے کتنی محبت تھی۔ وفا کا تقاضا یہی ہے کہ تم اس کے نام پر اپنی زندگی گزار دو۔ اور سنو......! مجھے سمجھانے مت آنا۔ میں اپنی زندگی کسی اور کے لئے وقف کر چکا ہوں۔''

علی کا لہجہ اور آواز اس کے ذہن میں گونجتا رہا۔ وہ ایک ایک لفظ پر غور کرنے لگی۔ وہ ان لفظوں پر جس قدر سوچتی چلی جارہی تھی، لمحہ بہ لمحہ وہ نئی دنیا میں پہنچ رہی تھی۔ اس نے واضح طور پر اپنی اندر کی دنیا کو بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے من میں سانول کی محبت سمندر کی طرح موجزن ہے، جس کی لہریں اس کے وجود کے ساحل سے سر پٹخ رہی ہیں۔ تبھی ایک

عجیب سی خواہش اس کے من میں ابھری، وہ چونک گئی کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں بلکہ علی کے پاس تھا۔ وہ ہی اس کا جواب دے سکتا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح اٹھی اور چارپائی سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھی۔

ہلکی ہلکی پھیکی سی زرد چاندنی میں اس کا وجود کسی ہیولے کی طرح لگ رہا تھا، ایسے میں علی کے پاس جانا کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے، اس بات کا اسے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کسی معمول کی مانند چلتی چلی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ جنڈ کے درخت کے پاس پہنچ گئی۔

علی اس وقت تہجد پڑھ رہا تھا۔ سو مہرو اس سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ ابھی اسے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے اپنے قریب ذرا سے فاصلے پر دو لوگ دکھائی دیئے جو دبکے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ جس کا رخ علی کی جانب تھا۔ مہرو لمحے میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ شاید وہ اس بات کا انتظار کررہے تھے کہ علی سکون سے تشہد میں بیٹھے تو وہ اس کا نشانہ لگائیں وہ علی پر برسٹ بھی مار سکتے تھے لیکن برسٹ کی آواز اس پرسکون سناٹے میں کہاں تک جاتی۔ علی تشہد میں بیٹھ چکا تھا اور گن والے نے اس کا نشانہ لے لیا تھا کہ مہرو کی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے تصور میں علی کو خون میں لت پت دیکھ چکی تھی۔ چیخ کی بازگشت میں فائر ہوا، مہرو کو ہوش نہیں رہا کہ وہ کیا کرے، اس نے پوری قوت سے علی کو پکارا، مگر وہ بے حس وحرکت وہیں بیٹھا رہا۔ جبکہ وہ دونوں وہیں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے اسی طرف گم ہوگئے۔ یکدم سناٹا چھا گیا تب مہرو نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں، وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ اس نے علی کی طرف دیکھا جو سلام پھیر رہا تھا۔ پہلے تو اسے خود پر یقین نہیں آیا۔

''کون ہے......؟'' جیسے ہی علی نے کہا تو مہرو پر طاری طلسم ٹوٹ گیا۔

''میں......میں......ہوں......مہرو۔'' اس نے اٹکتے ہوئے خوشی بھرے لہجے میں کہا اور اس کے قریب چلی گئی۔

''تم......اس وقت یہاں کیسے، اور یہ فائر کی آواز......کیا معاملہ ہے؟'' علی نے حیرت سے کہا۔

''کوئی تمہیں مارنے آیا تھا، فائر اس نے کیا تھا، میں اگر نہ چیختی تو اس کا نشانہ تم تھے۔ لگتا ہے اس کا نشانہ چوک گیا۔''

''مجھے کوئی مارنا چاہتا تھا۔'' علی نے حیرت سے کہا اور پھر مہرو کے خوف زدہ چہرے پر

دیکھا تو وہ بولی۔

''ہاں......! میں ادھر آئی تو وہ وہاں جھاڑی کی آڑ میں تھے، ان کا نشانہ تمہاری طرف تھا اور میں......ڈر گئی اور......'' مہرو نے لرزتے لہجے میں کہا۔ تب تک علی خود پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے ساری صورت حال کو سمجھا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔

''مگر تم یہاں کیوں آئی ہو اس وقت؟''

علی کے لہجے میں حیرت چھلک رہی تھی۔

''میں......! میں کیوں آئی ہوں یہاں۔'' مہرو نے یوں کہا جیسے وہ سب کچھ بھول گئی ہو۔ وہ ہونقوں کی طرح علی کے چہرے پر دیکھ رہی تھی جیسے اس کے چہرے پر ہی سب کچھ لکھا ہو۔ وہ کتنے ہی لمحے یونہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اسے خیال آ گیا کہ علی نے کیا پوچھا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ تب وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں......میں......تم سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔''

''کون سی بات؟'' علی نے پوچھا۔

''میں یہ تو جان گئی ہوں کہ سانول مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا، میں اس کے خلوص کو بھی سمجھ گئی ہوں۔ وہ لمحے جو تم نے ساتھ گزارے، اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میرے بدن سے نہیں، مجھ سے، میری ذات سے عشق کرتا تھا۔ میں سانول کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں اس سے معافی کی طلب گار ہوں۔ خدا کے لئے مجھے سانول سے ملا دو......! ورنہ میں سسک سسک کر مر جاؤں گی۔ مجھے یہ احساس جینے ہی نہیں دے گا کہ سانول مجرم نہیں تھا، میں ہی بیوقوف تھی۔'' مہرو نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ علی کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ مہرو کے اندر سے جو سیلاب امنڈ آیا تھا، اس کی طغیانی ذرا کم ہوئی تو علی نے کہا۔

''تمہاری اس وقت آمد کو میں کیا سمجھوں۔ اگر یہ فقط تمہاری بے چینی اور ندامت تمہیں یہاں تک لے آئی ہے تو یہ ایک الگ بات ہو گی، اور اگر میری زندگی بچانے کے لئے تمہیں وسیلہ بنایا گیا ہے تو یہ دوسری طرح کی بات ہو گی۔''

''میں کچھ نہیں جانتی، کون سی بات کیا ہے، بس میں سانول کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں، اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔'' مہرو نے یوں کہا جیسے وہ اپنے آپ میں ہی نہ رہی ہو۔ اس کا انداز نہ صرف پاگلوں جیسا تھا، بلکہ اس کے منہ سے لفظ ہذیانی انداز میں ادا ہو رہے تھے۔ علی اس کی

حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گھبرا گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے، رات کا وقت، اندھیرا ایسا کہ جس میں مدقوق چاندنی تھی، تھوڑی دیر قبل اس کے قتل کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسے حالات میں وہ اسے کیا ڈھارس دے۔ اور پھر اس کی ضد ایسی انہونی تھی کہ جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر تحمل سے بولا۔

''دیکھو مہرو......! جو بھی اس جہان سے چلا جاتا ہے نا، دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ قانون فطرت ہے۔ سانول تمہارے سامنے قتل ہوا تھا اور میں نے اسے قبر میں اتارا تھا۔ ہم اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں۔''

''تو کیا میں ساری زندگی اس دکھ کا بوجھ اٹھائے پھرتی رہوں گی۔'' مہرو نے تیزی سے کہا۔

''ہم قانون فطرت کے خلاف نہیں جا سکتے جو ممکن نہ ہو اسے اگر ہم ممکن بنائیں گے تو بہت ساری ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' مہرو نے گہرے دکھ میں کہا۔

''تم، ہاں تم اس کی مغفرت کے لئے دعا کر سکتی ہو۔ اس کے درجات بلند کرنے کے لئے نیک اعمال کا ثواب اسے پہنچا سکتی ہو۔ تم اس سے ہی اپنی محبت کا اظہار کر سکتی ہو۔ اور اگر قیامت کے دن اسے پانا چاہتی ہو تو بس اسی کا دھیان رکھو، اپنے رب سے جنت میں اس کا ساتھ چاہو، مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا رب تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ وہ راضی ہو جائے گا۔'' علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو مہرو چند لمحے سوچتی رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

''مجھے تو کوئی ایسا طریقہ نہیں آتا جس سے میرا رب راضی ہو جائے۔ تم بتاؤ گے مجھے۔''

''ہاں بتاؤں گا......! بلکہ مجھے بتانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ جو نبی ﷺ نے کیا تم بھی کرو، سنت نبوی ﷺ ہی وہ واحد راستہ ہے جس سے میرا اور تمہارا رب راضی ہو جاتا ہے، بس تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ میرا نبی ﷺ کیا پسند کرتا تھا اور کیا نہیں۔ تمہاری پسند و ناپسند بھی انہی کے مطابق ہو جائے تو سارے معاملے ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔''

''تم تو پڑھے لکھے ہو نا، تم مجھے بتاؤ گے، پڑھاؤ گے مجھے؟'' مہرو نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......کیوں نہیں، میں تمہیں پڑھاؤں گا، پھر تم یہاں کی ساری لڑکیوں کو پڑھانا، انہیں بتانا کہ دین اسلام کیا ہے، اس میں عورتوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ رب کیسے راضی ہوتا

ہے، نبی ﷺ کا طریقہ کیا ہے؟ یہ سب انہیں بتانا۔‘‘ علی یہ کہتے ہوئے خود بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ مہرو کے دل کو ذرا ڈھارس ملی۔ وہ قدرے پرسکون ہو گئی۔ تب علی نے کہا۔ ’’اب تم جاؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں جاتی ہوں۔‘‘ مہرو نے اٹھتے ہوئے کہا اور جس طرف سے آئی تھی ادھر کو چل دی۔ علی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، اگرچہ صبح کا اجالا نہیں ہوا تھا مگر پو پھٹ چکی تھی، اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا، مہرو نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو علی سوچنے لگا۔ یہ سب کیا تھا، خواب تھا یا حقیقت؟ لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود پر مسکرا دیا۔ اس نے جس کے نام اپنی زندگی کر دی تھی، اب تو وہی اس کی حفاظت کرنے والا تھا۔ وہ چند لمحے اس خیال سے خوشگواریت محسوس کرتا رہا۔ پھر فجر کی نماز کے لئے اٹھ گیا۔

اور مہرو......! کسی معمول کی طرح چلتی جا رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کون اسے راستے میں ملا ہے اور کون نہیں، وہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی چلتی چلی جا رہی تھی۔ یوں جیسے اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ علی سے ہونے والی باتیں سوچتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ اس کا گھر آ گیا۔ وہ اسی حالت میں اپنے گھر داخل ہو گئی۔

’’کہاں چلی گئی تھی تو، کہاں رہی ہے رات بھر......؟‘‘ جنداں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی، وہ اپنی ماں کی جانب یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔ اس پر اس کی ماں چڑ گئی۔ ’’ایسے کیا دیکھ رہی ہے میری طرف، بولتی کیوں نہیں۔‘‘

’’میں اگر بتا دوں کہ میں کہاں گئی تھی، پھر کیا ہو جائے گا۔‘‘

’’یہ تم باتیں کیسی کر رہی ہو؟‘‘ جنداں نے حیرت سے کہا۔

’’ابھی میں نے پھر جانا ہے۔ ذرا دن چڑھ جائے، تا کہ لوگ بھی دیکھیں، میں سانول کی قبر پر جاؤں گی، اب وہی میرا سانول ہے اماں۔‘‘ مہرو نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کی ماں ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہ گئی۔ جبکہ مہرو جس چارپائی سے اٹھی تھی وہیں جا کر لیٹ گئی۔ اس دن مہرو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ علی کی بات مان لے گی۔ اسے بڑا سکون مل رہا تھا۔

☆☆☆

سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ سیدن شاہ کی حویلی میں زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ جبکہ خود سیدن شاہ کی رات اس کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ اسے نیند ہی نہیں آئی تھی۔ نیند کا تعلق تو سکون اور اطمینان سے ہوتا ہے۔ جب انسان بے سکون اور بے اطمینان ہو تو پھر نیند بھی عنقا ہو جاتی ہے۔

وہ حد درجہ بے چین تھا۔ اس کی بے چینی میں خوف زیادہ شامل تھا۔ وہ آج تک خود کو طاقتور سمجھتا چلا آ رہا تھا، کسی میں مزاحمت کرنے کی جرأت نہیں تھی، اس صبح وہ خود کو قدرے کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی دوررس نگاہیں بہت ساری ہلچل دیکھ رہی تھیں۔ پہلی بار اسے لگا جیسے اس نے غلط فیصلہ کر لیا ہو۔ ورنہ حکم دیتے ہوئے اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ جو کہتا تھا، ہو جاتا تھا۔

گزشتہ شام وہ بہت خوش تھا۔ مریدین کی اچھی خاصی تعداد آئی ہوئی تھی اور معمول سے زیادہ نذر نیاز پیش کی گئی تھی۔ اس دوران پیراں دتہ بھی ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا رہا تھا۔ جب مریدین چلے گئے اور سیدن شاہ اٹھ کر اپنے کمرہ خاص میں آ گیا تو اس نے پیراں دتہ سے کہا۔

’’پیراں دتہ......! تمہیں معلوم ہے کہ سالانہ عرس قریب آ رہا ہے۔ اس کی تیاریوں کے بارے میں کچھ کیا ہے کہ نہیں؟‘‘

’’وہ تو پیر سائیں جیسا آپ کہیں گے، ویسا ہی ہو جائے گا لیکن......‘‘ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

’’کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہو گئے ہو؟‘‘ سیدن شاہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

’’پیر سائیں......! بات یہ ہے کہ آج جتنے مرید آ رہے ہیں، کیا سالانہ عرس تک یہ رہیں گے؟‘‘ اس نے جھجکتے ہوئے ادب سے کہا۔

’’کیا بکواس کر رہا ہے تو...... کیا ہو گیا ہے؟‘‘ سیدن شاہ نے غصے میں پوچھا۔

’’پیر سائیں......! حالات خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آپ اس پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔‘‘ اس نے کھل کر پھر بھی نہیں کہا تو سیدن شاہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

’’کیسے......! کیسے حالات خراب ہو گئے ہیں اور میں کیا توجہ نہیں دے رہا ہوں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’پیر سائیں......! مجھے نہیں معلوم کہ آپ اب تک علی کے معاملے میں خاموش کیوں ہیں۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ لوگ اس کی جانب رجوع کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہے پیر سائیں کہ اس ویرانے میں علی نے کنواں کھدوا لیا ہے۔ جہاں سے پانی میٹھا نکلا ہے۔ یہاں کے جاہل لوگ یہ اس کی کرامت سمجھ رہے ہیں۔ کچی بستی کے لوگ اب ٹوبے سے نہیں، وہاں اس کنویں سے پانی بھرنے جاتے ہیں۔ دن بدن وہاں میلہ لگتا چلا جا رہا ہے۔‘‘ پیراں دتے نے بڑے گھمبیر انداز میں کہا تو سیدن شاہ مسکرا دیا اور بولا۔

''بس اتنی سی بات۔''

''بات یہیں تک محدود نہیں ہے پیر سائیں......! خان محمد اب پوری طرح کھل کر اس کی مدد کرنے لگا ہے۔ آپ جو کہہ رہے تھے کہ پتہ کریں اس کے پیچھے کون ہے تو وہ خان محمد تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کو معلوم ہو......'' پیراں دتے نے کہنا چاہا لیکن سیدن شاہ نے اسے ٹوک دیا اور بڑے تحمل سے کہا۔

''مجھے اندازہ تو پہلے ہی تھا کہ اس کے پیچھے خان محمد ہی ہو سکتا ہے۔ وہی اس علاقے میں سر اٹھا رہا ہے۔ اب کھل کر وہ سامنے آ گیا ہے تو کیا ہوا۔ اچھا ہے لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ میں اسی وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''پیر سائیں......! آپ اب بھی انتظار کر رہے ہیں جبکہ......''

''ہاں پیراں دتہ......! ہاں، جب میں علی کو یہاں سے ذلیل و رسوا کر کے نکالوں گا نا تو اس وقت جتنے لوگ بھی اسے جانتے ہوں گے وہ ہی عبرت پکڑیں گے۔ لازمی بات ہے کہ جب علی پر ہمارا عذاب نازل ہوگا تو خان محمد درمیان میں آئے گا۔ تب اس کا پتہ بھی صاف کر دیں گے۔ پورے علاقے کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو بھی ہمارے سامنے سر اٹھاتا ہے، اس کا انجام برا ہوتا ہے۔'' سیدن شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر پیر سائیں، لیکن اس کی وجہ سے وہ لوگ بھی، جو کیڑے مکوڑوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں، سر اٹھانے لگے ہیں۔''

''کس کی یہ جرأت ہوئی ہے۔'' سیدن شاہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''وہی اماں فیضاں، اور......مہرو......آپ نے حکم دیا تھا کہ ایک ہفتے میں ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن نہیں ہوئی۔''

''کیوں......'' سیدن شاہ نے حیرت سے کہا جیسے یہ انہونی ہو گئی ہو۔

''اماں فیضاں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جبکہ اس معمولی سی لڑکی مہرو نے صاف انکار کر دیا۔ اور ہم نے انہیں پوچھا تک نہیں۔ اور یہ سب علی کی وجہ سے ہوا، وہی انہیں ورغلا رہا ہے۔'' پیراں دتہ نے اپنی بات بڑے سلیقے سے کہہ دی۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ بغاوت کچی بستی سے شروع ہو گئی ہے......'' سیدن شاہ سوچ بھرے لہجے میں کہا اور پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''علی اس سارے فساد کی جڑ ہے۔''

''جی پیر سائیں......!'' پیراں دتے نے انتہائی ادب سے کہا۔

''تو پھر اسے ختم کر دو۔ اور اس سے اگلے دن بھیرے اور مہرو کی شادی ہونی چاہیے، کوئی نہیں مانتا تو اسے بھی راستے سے ہٹا دو۔'' سیدن شاہ نے حتمی انداز میں کہا تو پیراں دتہ فوراً بولا۔

''جیسے حکم سائیں کا۔''

''جاؤ......! مجھے آرام کرنا دو، صبح مجھے بتانا کیا ہوا۔'' سیدن شاہ نے کہا تو پیراں دتہ فوراً چلا گیا۔ اس نے اپنی مرضی کا فیصلہ سیدن شاہ سے کروا لیا تھا۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ اسے مہرو تک رسائی بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تو چلا گیا لیکن اس کے دل کی بات سیدن شاہ کو معلوم نہیں ہو سکی۔ وہ رات کا کھانا کھا کر جب اپنے بستر پر لیٹا تو اسے پیراں دتہ کی باتیں یاد آئیں۔ تب اس نے غور کیا۔ اسے واقعتاً حالات بدلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ چاروں طرف سے برے برے خیالات نے اسے گھیر لیا تھا، اس سارے مسئلے کا حل علی کا منظر سے غائب ہو جانا تھا ورنہ بہت کچھ خراب ہونے والا تھا، اس رات اس نے شدت سے سوچا کہ کاش اس کے پاس بھی کوئی روحانی قوت ہوتی۔ اب تک وہ اپنے بزرگوں کے نام پر ہی کھا رہا تھا۔

یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ بزرگوں نے اپنی محنت، تقوے اور جدوجہد سے، اپنا نفس مار کر جو روحانی بلندیاں حاصل کی تھیں۔ قرب الٰہی کے لئے جتنی محنت کی تھی، ان کے گدی نشین اس روحانی مقام کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے ہیں۔ انہی بزرگوں کے نام کی برکت سے جو خانقاہی نظام چل رہا ہے، اب وہاں تربیت نفس اور قرب الٰہی جیسے اعلیٰ مقاصد کا حصول نہیں بلکہ ہوس اور لالچ نے ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ خاک نشینی اختیار کرنے والے بزرگوں کے گدی نشین تعیش والی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ اعتراض ہو کہ محنت کے عوضانے کے طور پر قدرت نے انہیں نوازا ہے۔ بیشک ایسا ہی ہوگا۔ اللہ کسی کی مزدوری نہیں رکھتا۔ نسلوں تک اس مزدوری کا پھل ملتا رہتا ہے۔ مگر المیہ یہی ہے کہ وہ مقصد جو فقراء کی زندگی کا لازمی جز ہوا کرتا تھا اب ناپید ہو گیا ہے۔

سیدن شاہ یہ سب سوچتا چلا جا رہا تھا اور بے چین ہو رہا تھا۔ ایک خیال اس کے ذہن کے کسی کونے میں تھا کہ میٹھا پانی نکلنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اگر علی میں کوئی روحانی قوت ہوئی تو کیا اس کا یہ بنا بنایا کھیل ختم ہو جائے گا؟ یہ سوچ محض چند لمحوں کے لئے آئی تھی، پھر اس سوچ

نے اسے حوصلہ دیا کہ وہ کل کا ایک عام سا نوجوان اس قدر روحانی بلندیوں پر کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لئے تو اک لمبی زندگی درکار ہوتی ہے، اسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ اللہ کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ وہ جب چاہے، جسے چاہے اور جتنا چاہے نواز دے، اب یہ انسان کی اپنی طلب ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ دور کہیں مسجد سے صبح کی اذان بلند ہوئی اور پھر اس کے ساتھ حویلی کے چوکیدار اس تک آن پہنچے۔ پیراں دتہ اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا بات ہے پیراں دتہ......! اس وقت کیا کرنے آئے ہو۔"

"پیر سائیں......! علی نشانے پر تھا لیکن عین اس وقت مہرو وہاں پر آگئی۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تو کیا ہوا، دونوں کو مار دیا ہے۔" سیدن شاہ نے اطمینان سے کہا۔

"نہیں سائیں......! فائر ہونے کے باوجود علی بچ گیا۔"

"دوسرا فائر کر دینا تھا۔" سیدن شاہ کا اطمینان وہی تھا۔

"جنہیں بھیجا تھا، وہ بھاگ گئے ہیں، انہیں مہرو نے دیکھ لیا تھا۔" پیراں دتہ اپنی ہی جونک میں کہے چلا جا رہا تھا۔ تب سیدن شاہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر بولا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پیراں دتہ......! تم کبھی اتنے گھبرائے ہوئے میرے پاس نہیں آئے ہو۔ تم نے نجانے کتنے لوگوں کی زندگی ختم کی ہے۔ اس معمولی واقعے سے تم خوف زدہ کیوں ہو گئے ہو۔"

"سائیں......! میں خوف زدہ نہیں، آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر مہرو نے ان کے بارے میں بتا دیا تو......"

"تو...... تم اسے بھی ختم کر دو......!" سیدن شاہ نے کہا تو پیراں دتہ کا ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہو پایا تھا اور سیدن شاہ نے اسے ایک نیا حکم دے دیا۔

"جیسے حکم سائیں کا......!" اس نے مردہ سی آواز میں کہا اور واپس پلٹ گیا۔ سیدن شاہ واپس اپنے بستر پر آن لیٹا۔ ساری رات وہ جس بات پر غور کرتا رہا تھا، اس کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے علی اس کی مزاحمت کے لئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ پوری

سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

اس وقت دن کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کا زور لحہ بہ لحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں فرزانہ خاں اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی مسلسل سوچ رہی تھی۔ اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ ڈرائیور کس راستے سے جا رہا ہے۔ اس کا پورا دھیان اپنی اس سوچ کی طرف تھا کہ آج اس نے کام کا آغاز کرنا ہے۔ محض ایک ہفتے میں اس نے تمام تر انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ بلاشبہ ان سارے انتظامات میں اس کے باپ سردار امین خاں نے بہت مدد کی تھی۔ جہاں اسے یہ سوچنا تھا کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے کیا باتیں کرے گی جنہیں باقاعدہ تنخواہ پر رکھا گیا تھا۔ وہاں اسے کچھ دیر پہلے ناشتے کی میز پر اپنے باپ سے ہونے والی گفتگو بھی یاد آ رہی تھی۔ وہ اسے جتنا ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ اسے اتنا ہی یاد آ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تھی تو سردار امین خاں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"ہوں......! تو آج تم اپنے کام کا باقاعدہ آغاز کر رہی ہو؟"

"جی بابا سائیں۔" اس نے انتہائی اختصار سے کہا تو امین خاں سنجیدگی سے بولا۔

"بیٹی......! مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا چاہتی ہو، تمہارا مقصد کیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ تم دولت برباد کرو گی، تمہیں کوئی تجربہ نہیں ہے، لیکن......!" یہ کہہ کر اس نے ایک لحہ توقف کیا جیسے جو بات وہ کہنے جا رہا ہے، اس کی نظر میں بہت اہم ہے۔ فرزانہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ بولا میں تمہیں پھر سے یاد دلا دوں کہ تم پہلی لڑکی ہو جس نے خاندانی روایات کو توڑا ہے۔ میں تم سے یہ امید کرتا ہوں کہ تم کوئی ایسا کام نہیں کرو گی، جس سے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔"

"بابا سائیں......! آپ کا فکر مند ہونا بجا ہے۔ آپ خاندان کے سربراہ ہیں اور ایک بیٹی کے باپ آپ مجھ پر یقین رکھیں۔ آپ کا اعتماد ہی میری قوت ہو گی۔" فرزانہ نے انتہائی نپے تلے لفظوں میں امین خاں کو تسلی دی۔

"مجھے تم سے یہی امید ہے بیٹا......! علاقے میں کوئی شخص میری طرف انگلی نہ اٹھائے، یہی تمہاری کامیابی ہو گی۔"

"بابا سائیں......! مجھے معلوم ہے کہ آپ سیاسی دنیا سے وابستہ ہے۔ اور سیاست کی دنیا میں مکر فریب، جھوٹ اور دھوکا بنیادی باتیں ہیں۔ جبکہ میں مخلوق خدا کی خدمت کرنے کے لئے

نکلی ہوں۔ جہاں سوائے عاجزی اور سچائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے بابا سائیں کہ اس دنیا میں سچ کے لئے کتنی مشکلات ہوتی ہیں۔ میں ذہنی طور پر ایسی مشکلات کے لئے تیار ہوں اور آپ سے محض ایک درخواست کرنا چاہوں گی۔''

''بولو......!'' امین خاں نے کہا۔

''میں خود کو بھی تو آزمانا چاہتی ہوں۔ آپ کے خاندان کی میں بھی تو ایک فرد ہوں۔ میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میری درخواست یہ ہے مجھے انگلی پکڑ کر چلنے پر مجبور نہ کیا جائے کچھ وقت مجھے میری مرضی کے مطابق چلنے دیا جائے۔'' فرزانہ خان نے پھر نپے تلے لفظوں میں اپنا مدعا کہنا چاہا تو امین خاں نے کہا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے معاملات میں قطعاً کوئی مداخلت نہ کروں۔''

''جی۔'' اس نے ادب سے کہا۔

''وہ تو بیٹا میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ تم اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی تو مجھے خوشی ہوگی۔ نہ ہوئی تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ دنیا اور اس کے معاملات کس قدر مشکل ہیں۔ خیر......! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' امین خاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اشارے سے اسے ناشتہ کرنے کو کہا۔

فرزانہ خاں یہی سوچتی جا رہی تھی کہ ڈرائیور نے ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی کے سامنے گاڑی لا کر کھڑی کر دی جس میں اس نے اپنا دفتر بنایا تھا۔ گاڑی رکتے ہی ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو کوٹھی کے اندر چلی گئی جہاں اس کا سٹاف اس کے انتظار میں تھا۔

وہ کمرہ کانفرنس ہال کی طرح سیٹ کیا ہوا تھا۔ فرزانہ خاں سیدھی اسی ہال میں گئی اور اپنے لئے مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر سب پر ڈالی، تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ اس کے ساتھ ہی غلام نبی ایک نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی فرزانہ کا دل کٹ گیا۔'' کاش......! ان کی جگہ علی ہوتا تو وہ کس قدر فخر محسوس کرتی کہ اس کی محبت اس کے ساتھ ہے۔'' اس نے فوراً اپنی بھٹکتی ہوئی ذہنی کو جھٹکا اور ان کی جانب متوجہ ہوگی۔ سلام دعا اور رسمی جملوں کے بعد اس نے کہا۔

''آپ سب میرے لئے معتبر ہیں، وہ اس لئے بھی کہ آپ سب میرے ساتھی ہیں اور

ہم نے لوگوں کی خدمت کرنی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں سے آپ کو ایک معقول اعزازیہ ملے گا، مگر میں اس اعزازیے کے بدلے میں آپ سے کام نہیں چاہتی بلکہ میں چاہوں گی کہ آپ بھی خدمت خلق کے اعلیٰ جذبے سے معمور ہو کر کام کریں۔ میں آج پہلے دن سے ہی آپ پر واضح کر دوں کہ ہماری آرگنائزیشن کا کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے اور نہ ہی ہم نے کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بننا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ قدرت نے ہمیں بہت اچھا موقعہ فراہم کیا ہے کہ ہم اپنی دنیا اور آخرت دونوں بہتر بنا سکیں۔''

''لیکن میڈم......! کوئی بھی فلاحی تنظیم یا آرگنائزیشن، بغیر پیسے سے نہیں چلتی، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنے فنڈز مہیا کرنے والے کے مقاصد کا خیال نہیں رکھیں گے۔'' ایک لڑکے نے سوال اٹھایا تو فرزانہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کا سوال بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس کے جواب میں کہہ سکتی ہوں کہ میرے خاندان کی دولت ہی بہت ہے مگر نہیں......! یوں تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ ہم نے سیاسی قوتوں اور ان کے مقاصد سے ہٹ کر ڈونر کے ساتھ رابطہ کریں گے۔ اور اپنی اس آرگنائزیشن کو کمرشل بنیاد فراہم کریں گے۔ میں قطعاً اس حق میں نہیں ہوں کہ آپ لوگوں کو تھوڑا تھوڑا دیں اور انہیں ہاتھ پھیلائے رکھنے پر مجبور کر دیں۔ بالکل نہیں، بلکہ آپ خود انہیں مالی طور پر سہارا دے کر پاؤں پر کھڑا کر دیں۔ اس کے لئے میرے پاس پلان ہیں۔ میں آپ سے بھی مشورہ کروں گی۔''

''میڈم......! ہمارا فوکس کیا ہوگا۔'' ایک لڑکی نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''گڈ......'' فرزانہ خاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' ہمارا فوکس انسانی صلاحیتیں ہوں گی۔ کوئی بھی این جی اور کیا کرتی ہے، ہمیں نہ اس کی تقلید کرنی ہے اور نہ ہی ان سے متاثر ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ ہمارا فوکس انسانی صلاحیتیں ہوں گی۔ وہ انسانی صلاحیتیں جو دوسرے لوگوں کے کام آسکیں۔ بس ہمیں انہیں پروموٹ کرنا ہے۔ یہاں کا زبردست آرٹ ہے کلچر ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ کسی کی جانب سے کوئی سوال نہیں آیا تو وہ بولی۔'' میں نے اب تک جو کچھ پڑھا ہے، سیکھا ہے یا مشاہدہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہوں گی۔ پلیز......! آپ انہیں ذہن نشین کر لیجئے گا۔ اس سے آپ

کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ میں کس طرح سوچتی ہوں۔"

"سب سے پہلی بات یہ کہ ہمیں ہمیشہ تعمیری سوچنا ہے۔ ہمارے معاملات کتنے کٹھن کیوں نہ ہوں یا مسائل کس قدر الجھے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ آپ غور کریں ان میں کامیابی پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ آپ کی صلاحیت ہے کہ آپ اس کامیابی کو کیسے اور کس وقت پہنچانتے ہیں۔ گھمبیر ترین مسائل میں چھپی ہوئی کامیابی کو وہی لوگ پہچان سکتے ہیں جو تعمیری سوچ رکھتے ہیں۔ تخریبی سوچ بندے کو مزید منتشر کر دیتی ہے۔"

"دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہوں گی وہ یہ ہے کہ انسان کے عقائد ہی اسے خوشحال اور کامیاب بناتے ہیں۔ درست عقائد بے چینی اور انتشار سے بچاتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے عقائد کو سادہ اور مضبوط رکھیں۔ اب ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارا مذہبی حوالہ دین اسلام ہے جو نہایت سادہ اور مضبوط عقائد پر ہے۔ اور پھر ساری زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ ہم تمام تر قوتوں کا منبع اللہ پاک کی ذات کو مانتے ہیں تو اسی طرح اس کے اختیار کو بھی مانیں کہ وہ قادر ہے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ ہمارا گمان ہمیشہ درست اور سچی باتوں پر رہے گا۔"

"تیسری اور آخری بات جو آپ سے کہنا چاہوں گی وہ یہ ہے کہ آپ نہ صرف اپنی ذاتی صلاحیتوں کو پہچانیں بلکہ دوسروں کی صلاحیتوں کو بھی اہمیت دیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایٹم ایک ایسا معمولی ذرہ ہوتا ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا مگر جب وہ جلتا ہے، ٹوٹتا ہے، اپنا آپ منواتا ہے تو ہمیں اس کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ میری اس بات پر سوچیں اور اپنی زندگی سے مطابقت پیدا کریں۔ ذرے کی اہمیت یونہی نہیں بن جاتی، پہلے یہ ماننا ہوگا کہ ایسی قوت دینے والی کوئی ذات ہے اور پھر اس ذرے میں اپنا آپ منوانے کی صلاحیت یونہی پیدا نہیں ہو جاتی، اس پر محنت ہوتی ہے۔ اپنے آپ پر محنت کریں۔ سب سے پہلے خود کو پرسکون رکھیں۔ اور اپنی زندگی کی تعمیر روحانی اصولوں پر کریں۔ کیونکہ روحانی طور پر مضبوط شخص دوسرے لوگوں سے زیادہ اور جلدی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔"

فرزانہ خاں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ ساری باتیں کہیں اور پھر خاموش ہو گئی۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ کتنی ہی دیر تک کوئی بھی کچھ نہیں بولا تو اس نے کہا۔

"میں نے جو ابتدائی طور پر کہنا تھا کہہ دیا۔ اگر اب آپ کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔"

"میڈم......! یہ کیا بات ہے کہ آپ ایک طرف کمرشل انداز میں کام کرنے کے لئے

کہہ رہی ہیں اور دوسری جانب روحانی طور پر مضبوط ہونے کی بات کر رہی ہیں۔ کیا یہ تضاد نہیں ہے۔"

"نہیں......!" فرزانہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ "دنیا داری بغیر پیسے کے نہیں چلتی، ہمیں پیسہ کمانا ہے لیکن روحانی طور پر مضبوط شخص دولت کو اہمیت نہیں دیتا اور نہ ہی اس کو جزو ایمان بناتا ہے صرف دنیاداری چلانے کے لئے دولت اور اپنی آخرت سنوارنے کے لئے روحانی طور پر مضبوطی۔ یہ تضاد نہیں توازن ہے۔"

"ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

"بہت سادہ......! میں نے چند اصول وضع کیے ہیں۔ آپ اس کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل ترتیب دیں۔ میرے خیال میں آپ اپنی کارکردگی کو بہتر بنا سکیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے پڑی فائل کھولی، اس میں سے ایک پیپر نکالا اور سب کی طرف دیکھ کر پڑھنے لگی۔

نمبر1: ہمیشہ پرامید رہیں۔ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر صحت مند نظریات کو اپنائیں۔

نمبر2: ہمیشہ حقیقت پسند رہیں۔ جتنے بھی کٹھن حالات ہوں۔ ان کا تجزیہ حقیقت پسندی سے کریں اور اس کا حل بھی حقیقت پر مبنی ہو۔

نمبر3: ذہنی صحت مندی کے لئے صحت مند خیالات ہی ضروری ہیں۔ ہمیشہ صحت مند سوچیں۔

نمبر4: اپنے شعور کو ہمیشہ اپنے سچے اعتقاد پر نگاہ رکھنے کو کہیں یوں آپ لاشعوری طور پر اپنے سچے اعتقادات کی پیروی کریں گے۔

نمبر5: ہمیشہ ان دوستوں کو فوقیت دیں جو صحت مند اور پرامید نظریات کے حامل ہوں۔ یہ زندگی کی جدوجہد میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

نمبر6: ہمیشہ قابل عمل اور تعمیری سوچ اپنائیں۔

نمبر7: وہ ذات جس نے آپ کو تخلیق کیا ہے اور جس کی نعمتوں سے آپ استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کا شکر ہر حال میں کریں۔ آپ اس کا شکر ادا کریں گے تو وہ آپ کو مزید دے گا۔ آپ رب العزت کے بارے میں ہمیشہ بااعتماد اور خوش گمان رہیں۔"

فرزانہ خان نے وہ پیپر پڑھا اور پھر دوبارہ فائل میں رکھ دیا۔ اور ان سب کی جانب دیکھنے لگی تبھی ایک لمبے سے نوجوان نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"میڈم......! ہم نے نظریات کی باتیں کر لیں۔ ماشاءاللہ آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ آپ نے لائحہ عمل کے بنیادی اصول بھی

ہمیں بتا دیئے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟ کیا خدمت کرنی ہے خلق کی اور ہم یہ کیسے کر پائیں گے۔"

"یہ بھی بہت سادہ ہے۔ آپ نے سروے کرنے ہیں۔ لوگوں کو کیا مشکلات ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں۔ پھر ہم نے اس سروے کے تناظر میں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے وسائل کیا ہیں اور ہم ان کے کس طرح کام آ سکتے ہیں۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ ہمیں کیسے کرنا چاہیے۔"

"ظاہر ہے میڈم......! سروے کے لئے سب سے پہلے کوئی علاقہ منتخب کیا جاتا ہے۔ ہم وہ علاقہ چن لیں۔ پھر اس کے بعد ہم سب مل کر اس کے لئے سروے پلان تیار کر لیں گے۔ اور اس کا جو فیڈ بیک ہوگا، اس کے مطابق ہم فیصلہ کریں گے۔"

"کسی اور کی کوئی رائے......؟" فرزانہ خاں نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا تو سبھی خاموش رہے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب اس نے انتہائی تحمل سے کہا۔ "دیکھیں علاقے کے اعتبار سے ہمارے ہاں روہی سب سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے، شہر کے لوگوں کے لئے دیگر تنظیمیں بہت کام کر رہی ہیں۔ لیکن ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے، جہاں زندگی اس ترقی یافتہ دور میں بھی سسک رہی ہے۔ آپ سب سے پہلے وہاں کا سروے کریں۔ اور ایک ہفتے کے اندر مجھے رپورٹ دیں۔"

فرزانہ نے کہا اور پھر چند لمحے جواب کا انتظار کر کے اپنی فائل سمیٹ کر اٹھ گئی۔ اس کے اندر بہت کچھ سلگ اٹھا تھا۔ اس لئے وہ کوئی مزید بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے آفس میں چلی گئی۔ جبکہ دوسرے سب پہلے حکم پر اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔

وہ اپنے آفس میں آئی اور اپنی پرسنل سیکرٹری سے کہا۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دیں۔ میں جب بلاؤں تو آپ آیئے گا۔" یہ کہہ کر وہ چیئر پر بیٹھ گئی۔ اُسے ان لمحات میں علی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ پچھلی ساری یادیں بھول چکی تھیں۔ اگر کوئی یاد آتی بھی تھی تو ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ اسے یاد تھا تو محض وہ خواب اور خواب کا وہ ماحول، وہ چند خواب ناک لمحوں پر اپنی زندگی کی پچھلی ساری یادوں کو قربان کر سکتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو وہ سارا خواب ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو پلکوں پر موتی اٹکے ہوئے تھے اور دل میں اک ایسی لہر تھی جیسے صدیوں کی گم شدہ شے کے لئے دکھ کا اظہار ہو۔ اس نے طویل سرد آہ کھینچی، اپنی پلکوں کو صاف کیا اور پوری شدت سے، دل کی گہرائیوں کے ساتھ علی کو من ہی من میں پکارا......" کہاں ہو......! دیکھو میں بہت بدل گئی ہوں، میں نے اپنا خاندانی تفاخر، اپنی ضد اور اپنی انا کو تج دیا ہے۔ آؤ......! ایک بار آ کر دیکھو، میں پہلے والی فرزانہ نہیں رہی ہوں۔ آؤ پلیز......!

مجھے بتاؤ کہ محبت کے لئے اہل کس طرح ہوا جاتا ہے۔"

ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں تھیں۔ اس نے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ خود پر قابو پایا اور پھر سیکرٹری کو بلانے کے لئے انٹر کام اٹھا لیا۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ گرمی کی شدت بڑھ چکی تھی۔ علی جنڈ کے درخت تلے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے کچی بستی کے وہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو کبھی میاں جی کے پاس بیٹھتے تھے۔ ان میں چند چہرے نئے بھی تھے۔ جنہیں علی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کے دل میں کیا تھا، علی اسے بخوبی سمجھتا تھا۔ جب سے کنواں کھدا تھا اور اس میں سے میٹھا پانی نکلا تھا، کچی بستی کے لوگوں کا رویہ بہت حد تک بدل گیا تھا۔ ان میں سے چند جو میاں جی کے عقیدت مند تھے، انہوں نے ایک سبز چادر لا کر میاں جی کی قبر پر ڈال دی تھی۔ کوئی نہ کوئی وہاں آتا اور چراغ رکھ کر چلا جاتا۔ ایک رات تو کئی سارے چراغ وہاں جل رہے تھے۔ علی انہیں اور ان کی عقیدتوں کو دیکھتا رہا کسی کو بھی منع نہیں کیا۔ خان محمد کے بھیجے ہوئے مزدور اپنا کام کر رہے تھے۔ مسجد کی بنیادیں مکمل ہو گئی تھیں اور اب وہ مدرسے کی بنیادیں کھود رہے تھے۔ وہ حیرانگی کی حد تک تیزی سے کام کر رہے تھے۔ احمد بخش ان کی نگرانی کرتا تھا اور علی......! ان لوگوں کے پاس بیٹھا تھا، لوگ جو اس سے توقع کر رہے تھے وہ اس توقع پر اترنے کے لئے پوری کوشش کر رہا تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ وہ بھی میاں جی کی طرح ان سے باتیں کرے۔ علی چاہتا بھی یہی تھا کہ لوگ آئیں اور اس کی باتیں سنیں۔ بعض اوقات علی خود پر حیران ہوتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے دنوں میں یا پھر اس سے پہلے کبھی بھی مذہبی نہیں رہا تھا۔ دین کے بارے میں اسے اتنا ہی معلوم تھا جتنا ایک عام مسلمان کو علم ہوتا ہے۔ لیکن اب وہ جب بھی بات کرتا تو نجانے کہاں سے خیالات اس کے دماغ میں آتے اور وہ روانی سے کہتا چلا جاتا۔ وہ صبح فجر کی نماز کے بعد اللہ رب العزت سے یہی دعا مانگتا کہ "اے اللہ......! مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے لیکن میری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلے جس سے تیری اور تیرے محبوب ﷺ کے بارے میں کوئی گمراہی کے راستے پر چل پڑے۔ اے اللہ......! میری زبان سے وہ بات کہلوانا جس سے تیری کبریائی اور رسالت مآب ﷺ کی شان بیان ہو۔ اے اللہ......! مجھے سیدھا راستہ دکھا۔ بے شک تو ہی سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔" وہ پورے خلوص اور شدت سے یہ دعا مانگتا اور پھر خود میں اعتماد محسوس کرتا۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ علم لدنی بھی ہوا کرتا ہے اور میاں جی اسے یہ عطا کر چکے تھے۔ اس پر اللہ کی طرف سے کیا کیا نوازشات ہو چکی تھی،

اسے یہ خبر ہی نہیں تھی۔انسان بلاشبہ بے خبر ہے۔اسے یہ خبر ہی نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر کس قدر رحم کیا ہوا ہے۔اس کی پیدائش سے بہت پہلے سے ہی اللہ کا رحم اور مہربانی کی شروعات ہو جاتی ہیں۔جدید سائنس اور تحقیق سے کئی ایک راز افشاء کر رہی ہے۔جس پر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔انسان کی اپنی ذات اور پھر کائنات......!قدرت الٰہی کے رازوں سے اٹا پڑا ہے۔صدیوں سے انسان اس تگ و دو میں لگا ہوا ہے اور نجانے کب تک لگا رہے گا۔لیکن جو بھی تحقیق سامنے آتی ہے،اس میں حیرت تو ہوتی ہی ہے لیکن اللہ کا کرم،رحم اور مہربانی بھی اس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔انسان بے خبر ہے کہ کائنات انسان کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔یہ ہم ہی ہیں جو کائنات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتے۔جس انسان کو خبر مل جاتی ہے کہ اسے کائنات کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہونا ہے۔اور وہ اس راہ پر چل نکلتا ہے تو سمجھیں وہ فلاح پا گیا۔اب سوال یہ ہے کہ انسان اپنی خبر کہاں سے حاصل کرے۔اسے کس طرح پتہ چلے کہ اللہ اس پر کس قدر رحم فرما رہا ہے تو اس کا بہت آسان اور سیدھا راستہ ہے،اور وہ ہے قرآن۔اور صاحب قرآن ﷺ۔سنت نبوی ﷺ کے راستے جب اللہ کے حضور جایا جاتا ہے تو انسان کی ساری بے خبری دور ہو جاتی ہے۔"

اس وقت علی بھی اللہ کے رحم و کرم اور نبی ﷺ کے رحمت اللعالمین ہونے کے بارے میں بات کر رہا تھا۔لوگ ہمہ تن گوش سن رہے تھے کہ اچانک علی بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔جیسے کسی نے اسے ٹوک دیا ہو یا جیسے کسی نے اسے صدا دی ہو۔وہ چند لمحے خاموش رہا جیسے کسی کی بات سن رہا ہو۔پھر تھوڑی دیر تک اسی خاموشی میں گزرے ہوئے لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔وہ دھیرے سے مسکرا دیا اور پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آج میں آپ سے ایک اور بات کرتا ہوں۔وہ بات محبت کے بارے میں ہے۔"

علی نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔اچانک موضوع کی تبدیلی پر لوگ تھوڑا سا کسمسائے لیکن خاموش رہے۔تب علی نے کہنا شروع کیا۔

"محبت......!ہم نے کبھی سوچا کہ یہ محبت کہاں سے آئی ہے،انسان کے اندر موجود ہے تو اس کی تخلیق کرنے والا کوئی تو ہے۔جس نے انسان کو تخلیق کیا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح نفرت بھی ہے اور دوسرے جذبے بھی۔وہ سب اپنی جگہ،ہم محبت کی بات کرتے ہیں۔جس نے محبت کو تخلیق کیا،وہ خود کس قدر محبت رکھتا ہوگا۔کیا یہ محبت نہیں ہے کہ اس نے تخلیق کیا آدم کو،تو اس کا مطلب ہے پہلے محبت اللہ کے پاس تھی،اسی کی محبت نے آدم کو تخلیق کیا،اس نے آدم میں محبت ودیعت کی۔یوں اللہ کی محبت پہلی محبت ہے۔وہ محبت سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور کیا ہم محبت سے

اسے دیکھ رہے ہیں؟ نوازشات اور عنایات تو وہیں ہوتی ہیں نا جہاں نگاہیں مل جائیں۔اس طرح جب ہم اس نگاہ سے اللہ کو دیکھ ہی نہیں رہے تو محبت جو ہے وہ عشق میں تبدیل کیسے ہوگی۔جان لو......!کہ اللہ تعالیٰ عشق اسے ہی دیتے ہیں،جو اس سے محبت کرتے ہیں۔"

"محبت دو طرح سے کی جاتی ہے،جذبات میں آکر کی جانے والی محبت گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے کیونکہ انسانی جذبات کبھی ایک سطح پر نہیں رہتے۔کبھی ان میں انتہا ہوتی ہے اور کبھی منتہا۔وہ محبت جو پائیدار نہ ہو وہ حقیقی محبت نہیں ہوتی۔اور یہ محبت کبھی بھی مقام عشق تک نہیں لے جا سکتی۔دوسری قسم کی محبت،اعتقاد کے ساتھ ہوتی ہے۔جو اعتقاد جتنا راسخ ہوگا،اسی قدر محبت کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ مقام عشق آ جاتا ہے۔اور جیسا کہ میں نے کہا عشق اسے ملتا ہے جو محبت کا اہل ہوتا ہے۔محض جذبات کے تحت محبت کرنے والے نہ تو محبت کے اہل ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ مقام عشق تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔کیونکہ عشق،محبت کا ہی اگلا درجہ ہے جہاں اپنا آپ دوسرے کو سونپ دیا جاتا ہے۔"

"آج تک ہم محبت اور عشق کی باتیں کرتے ہیں۔کبھی محب اور عاشق کے بارے میں بھی بات کی۔جب کوئی عاشق،عاشق نہیں ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سونپ دیتا ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے۔معشوق کی رضا میں دراصل عاشق کی رضا ہوتی ہے تو یہ طرز عمل کیا ہے؟ اسے بندگی کہتے ہیں۔اور بندگی کی معراج یہ ہے کہ جہاں حکم ملے کہ تم اپنی جان دے دو تو وہاں ایک لمحہ بھی نہ سوچا جائے اور جان سپرد کر دی جائے اور جہاں حکم ملے کہ اپنی جان کو بچا لو۔تو ہزار کوششیں جان بچا دینے میں لگا دی جائیں۔اپنی مرضی اور منشاء معشوق کی رضا کے مطابق ہو۔تو پھر یہ بندگی اسی کی جچتی ہے۔جو بندگی کے لائق ہو۔عشق بھی اسی کو جچتا ہے جو عشق کے لائق ہو۔عشق کرنے سے پہلے خود کو اس کا اہل کیا جائے تو یہی اہل عشق کہلائے جا سکتے ہیں۔تب ہی بندہ قبولیت کا امیدوار ہوتا ہے۔"

"اصل شے قبولیت ہے۔اور قبولیت کیسے ہوتی ہے اس کا تمام تر معیار محبوب خدا ﷺ کی ذات اقدس ہے۔حضرت ابو بکر صدیقؓ سے پوچھا جاتا ہے کہ گھر میں کیا چھوڑا،عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا نام۔ہاتھ میں کیا ہے تھوڑا سا سامان،چند کھجوریں۔وہ سب سے زیادہ مقبول ٹھہرائی جاتی ہیں۔معیار دولت نہیں،وہ خلوص ہے جو دل میں نہاں ہے،اس کا اظہار ہی دراصل عشق کی توثیق ہے۔یہی محبت ہے،یہی عشق ہے۔اور یہی اہلیت محبت ہے۔"

علی نے نہایت تحمل سے دھیرے دھیرے کہا۔اس کا انداز سمجھانے والا تھا،جو بھی جتنا سمجھا اس نے اپنا پیغام کہہ دیا اور پھر سے اسی حالت میں چلا گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔چند لمحے اسی

کیفیت میں گزر گئے۔ شاید وہ مزید ایسی حالت میں ہی رہتا کہ ایک نعرہ مستانہ پر چونک گیا۔

''حق اللہ......! حق حق حق............!''

علی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بیٹھے ہوئے لوگوں کے پیچھے ایک درویش کھڑا تھا۔ سیاہ رنگ کا چوغہ، جس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ سفید براق لمبے بال جو کاندھوں سے بھی نیچے گئے ہوئے تھے اور انہیں بڑی نفاست سے کنگھی کیا ہوا تھا، اسی طرح سفید براق ڈاڑھی، بڑی بڑی مونچھیں سرخ و سفید چہرہ، جیسے سیندور ملا میدہ۔ غلافی آنکھیں، جس میں زندگی کی بھرپور چمک تھی، ستواں ناک، لمبا قد، ننگے پاؤں اور دائیں ہاتھ میں لمبا سا عصا پکڑے علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی علی کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس نے پھر سے وہی نعرہ مستانہ لگا دیا۔

''حق اللہ......! حق حق حق............۔''

''بے شک وہی ذات برحق ہے بزرگو......! آؤ، تشریف لے آؤ۔'' علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ اس نے عصا بائیں ہاتھ میں کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مصافحہ کے لئے آگے بڑھایا اور کہا۔

''اسلام علیکم......!''

علی نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ مصافحہ ہوا تو اس درویش نے علی کا ہاتھ چوم لیا۔ علی نے اپنا ہاتھ دھیرے سے واپس لیا اور کہا۔

''درویش بابا......! تشریف رکھیں۔''

علی نے کہا تو سہی لیکن اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس طرح کھڑا رہا۔ علی اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ تب اس نے کہا۔

''حضور یہاں بیٹھنے کے لئے آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میری ایک بات سن لیں جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''بولیں......!'' علی نے کہا۔

''بہت سفر کر چکا ہوں، اتنا سفر کہ مجھے بھی نہیں یاد کہ کتنا سفر ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہماری کوئی منزل ہے بھی یا نہیں......! مگر اب حکم ہوا ہے کہ سفر ختم ہو گیا ہے۔ آپ نے اگر بیٹھنے کا حکم دیا ہے تو پھر یہاں سے جانے کا مت حکم دیجیے گا۔''

''آپ کی اور میری مرضی کی اہمیت کیا ہے درویش بابا۔ جب حکم آ گیا ہے تو پھر اسی کی رضا میں راضی ہیں۔ اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں کوئی حکم آپ کو دے سکتا ہوں۔''

''بے شک......! درجات اللہ کے ہاں ہیں۔ مجھے اپنی خدمت میں قبول فرمائیں۔'' یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر وہی نعرہ لگایا۔ ''حق اللہ......! حق حق حق............''

اتنے میں علی اٹھا اور قریب پڑے گھڑے تک گیا۔ پیالہ لیا، اس میں پانی بھرا اور لا کر درویش بابا کو دے دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور عین سنت کے مطابق پیا۔ اور پیالہ واپس کر دیا۔ علی پیالہ گھڑے کے قریب رکھ کر واپس آیا تو وہ درویش بولا۔

''حضور آپ کا نام جو بھی ہے، ہمیں آپ کو ایک خاص نام سے مخاطب کرنے کی اجازت ہے؟''

''اجازت ہے۔'' علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج سے ہی ہم آپ کو فقیر سائیں کے نام سے پکاریں گے۔'' درویش بابا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو علی پورے وجود سے کانپ گیا۔ سب سے پہلی بات جو اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہی تھی کہ اس کے لئے اب کوئی نئی ذمہ داری آ گئی ہے۔ دل ہی دل میں اس نے اس نئی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ علی نے جب لوگوں کی طرف دیکھا تو ان میں نئے نام کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔

''نماز کا وقت ہونے کو ہے۔ مزدوروں کو کھانا کھلائیں، تاکہ پھر نماز کا اہتمام کیا جا سکے۔''

اس نے کہا تو سبھی اٹھ گئے۔ تب علی نے درویش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے آپ ہی یہاں پر موجود ہر شخص کو کھانا کھلائیں گے۔''

''جو حکم فقیر سائیں۔'' درویش نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ وہاں ٹھہر گئی جہاں کھانا تیار ہو چکا تھا۔ علی وضو کے لئے بڑھ گیا۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ صحرا میں پھیلے ہوئے مویشی بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر آ گئے تھے۔ ایسے میں کچی بستی کی ایک گلی میں مہرو چلی جا رہی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا حیران رہ جاتا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سر میں کنگھی کر کے چوٹی باندھی ہوئی تھی، آنکھوں میں کاجل، ہاتھوں پر مہندی رچائے وہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا دھیان کسی کی طرف بھی نہیں تھا۔ جبکہ سب کی نگاہوں میں حیرانگی اس لئے زیادہ تھی کہ اس کے مہندی رچے ہاتھوں میں جلتا ہوا چراغ پکڑا ہوا تھا۔ جسے وہ ہوا کے تھپڑوں سے بچائے چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک

کہ کچی بستی بھی ختم ہوگئی اور وہ اسے راستے پر چل پڑی جدھر قبرستان تھا۔

سورج کے غروب ہونے میں اتنا زیادہ وقت نہیں رہا تھا، اور مہرو ہر طرف سے بے نیاز دھیرے دھیرے قبرستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دو چار پر تجسس لوگ اس کے پیچھے ہوئے کہ آخر مہرو جا کدھر رہی ہے اور کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ قبرستان میں پہنچ گئی اور پھر سیدھی سانول کی قبر آ کے رُک گئی۔ اس نے قبر کے سرہانے چراغ رکھا۔ اپنے آنچل کا پلو کھولا تو اس میں صحرائی پھولوں کی پتیاں تھیں جو اس نے قبر پر بکھیر دیں۔ پھر پائنتی کی طرف جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کتنی ہی دیر قبر کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل پھیل گیا۔ سانول کی ڈھیر ساری یادیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ کافی دیر بعد اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سانول......! مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے کتنا عشق کرتے تھے۔ میں ہی تمہارا عشق نہ جان سکی۔ بے وقوف تھی نا حالانکہ عشق تو چھپائے نہیں چھپتا اور جب یہ ظاہر ہوتا ہے تو فنا ہی فنا ہوتی ہے۔ یہ عشق بھی کتنا ظالم ہے نہ ہو تو انسان کو اپنے آپ کا پتہ نہیں چلتا، ہو جائے تو خود نہیں رہتا۔ میں نہیں جانتی کہ تم مجھ سے کتنا عشق کرتے رہے ہو لیکن اب جبکہ تو میرے سامنے نہیں رہا ہے۔ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ میں اب سمجھنے لگی ہوں کہ یہ کیسی آگ ہوتی ہے۔ جو نہ جلاتی ہے اور نہ چین لینے دیتی ہے۔ جب تُو خواجہ سائیں کی کافی کے بول گایا کرتا تھا کہ عشق اولڑی پیڑ وو، لوکاں خبر نہ کائی۔ تو واقعی مجھے خبر نہیں تھی یہ کس قدر اولڑی پیڑ ہے۔ یہ تو ہی جانتا تھا۔ آج میں اعتراف کرنے آگئی ہوں سانول......! مجھے تم سے عشق ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں، تم میرے پاس آؤ گے یا پھر میں تمہارے پاس آجاؤں۔ یہ زندگی ہی اب تیرے اور میرے درمیان میں ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تیرے پاس آجاؤں لیکن......! میں کسی شرمندگی کے ساتھ تیرے پاس نہیں آنا چاہتی۔ میں انتظار کروں گی۔ اپنے رب سے تجھے مانگوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ جب میں تیرے سامنے آؤں تو تم سے نگاہیں نہ ملا سکوں۔ سانول......! میں آج بھی تیری ہوں۔ اور کل حشر کے دن تجھے اپنے رب سے ضرور پاؤں گی۔ میں نہیں جانتی کہ تم مجھ سے کتنا عشق کرتے تھے لیکن میں جانتی ہوں کہ عشق کس قدر بے چین کر دیتا ہے۔ میں اسی بے چینی کے ساتھ انتظار کی آگ میں جلوں گی۔ تجھے اپنے رب سے مانگوں گی۔ اس وقت تک مانگتی رہوں گی، جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ تم میرے ہو۔ تم میرے ہو...... تم میرے ہو......“ آخری لفظ کہتے ہوئے مہرو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے چند لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مہرو پاگل ہو چکی ہے۔

اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب مہرو اپنے گھر واپس آئی۔ آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل اور سُتا ہوا چہرہ اسے اک نئی مہرو کا روپ دے رہا تھا۔ وہ بے نیازی سی صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر آ بیٹھی۔ اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ جنداں اور گامن اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ جنداں غصے میں آگے بڑھی اور اس کی چوٹی سے پکڑ کر بولی۔

”تو اب اتنی بے حیا ہو گئی ہے کہ اپنی ماں کو بتائے بغیر جہاں جی چاہے چلی جاتی ہے۔ تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ تو کیا کرتی پھر رہی ہے۔“

”مجھے صرف اتنی خبر ہے ماں کہ مجھ سے بڑا ظلم ہوا، میں سانول کے عشق کو نہ پہچان سکی۔ لیکن اب پہچان گئی ہوں۔“ وہ پاگلوں کی طرح اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی رہی۔ جس پر جنداں نے بھنا کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔

”بے حیا، بے غیرت......! تمہیں شرم نہیں آتی، اپنے ماں باپ کے سامنے کیا بکے جا رہی ہے۔ تجھے کچھ ہوش ہے کہ نہیں۔“

”جب رب سے ہی پردہ نہیں ہے تو پھر بندوں سے کیا پردہ......“ وہ بے خود ہو رہی تھی اور اسی لہجے میں کہتی چلی گئی۔

”میں تجھے جان سے مار دوں گی۔“ جنداں نے غصے میں ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا تو مہرو نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مار دو......! اچھا ہے، میں جلدی سانول کے پاس چلی جاؤں گی۔“

”چھوڑ دو جنداں اسے، یہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ یہ پاگل ہو گئی ہے۔“ گامن نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس کا دل اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر رو رہا تھا۔ وہ بیٹی جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اس کے سامنے زندہ لاش کی مانند ہو گئی تھی۔

”نہ بابا نہ......! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس میری التجا یہی ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔“ مہرو نے کہا تو جنداں تنک کر بولی۔

”کیسے چھوڑ دیا جائے تجھے تیرے حال پر۔ تو جتنا مرضی ڈھونگ رچا لے، تیری شادی بھیرے کے ساتھ ہو کر رہے گی۔ صرف کل کا دن ہے تیرے پاس، پرسوں تجھے ہر حال میں بیاہ کر اس کے گھر جانا ہے۔ نہیں جائے گی تو تیرا بھائی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔ تب اسے سیدن شاہ بھی نہیں بچا پائے گا۔ سن لیا تم نے۔“

”اور تم بھی سن لو ماں......! بھیرا میرے بھائیوں کی طرح ہے۔ میں اب اس سے

نہیں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں سانول کی ہو چکی ہوں۔ وہ ہی میرا عشق ہے۔ وہی میرا دلہا۔ مارنا چاہو تو ابھی مار دو...... مجھے خوشی ہوگی کہ میں سانول کے نام پر مری ہوں۔"

"جنداں......!" گامن نے سختی سے کہا۔ "تم کیوں اس سے بحث کر رہی ہو۔ جب فیضاں ہی اپنے بیٹے کو بیاہنے کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر کیوں اس کا دماغ خراب کرتی رہتی ہو۔"

"کیوں تیار نہیں ہے۔ آج پیراں دتہ آیا تھا۔ اس نے ہی کہا ہے کہ وہ پرسوں مہرو کو بیاہنے کے لئے آ رہے ہیں۔ کل معاہدے کی تاریخ ختم ہو جائے گی۔ پولیس رب نواز کو پکڑ کر لے جائے گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کرم کرے گا۔ تم جاؤ۔" گامن نے اپنی بیوی سے کہا اور پھر خود اپنی بیٹی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میری بیٹی......! ہم پر یہ جو بیٹھے بٹھائے طوفان آ گیا ہے۔ ہمیں اس کا مقابلہ تو کرنا ہے۔ تمہیں کسی کے ساتھ شادی تو کرنی ہے بھیرے کے ساتھ کر لو گی تو تیرے بھائی کی جان بچ جائے گی۔ عقل سے کام لو میری بیٹی اور......"

"بابا......! میری شادی سانول سے ہو چکی ہے۔" مہرو نے کہا اور اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ دونوں میاں بیوی حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں کے ہی گمان تھا کہ مہرو پاگل ہو چکی ہے۔

☆☆☆

اس وقت سیدن شاہ مریدین کے ہال کمرہ میں اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ مریدین کی اچھی خاصی تعداد اس کمرے میں موجود تھی جو اپنی باری کے انتظار میں تھی۔ ہر کسی کو محض چند لمحے مل رہے تھے۔ وہ اپنا دکھ اور مسئلہ بیان کرتا، سیدن شاہ اسے سنتا اور پھر اگلے شخص کی باری آ جاتی۔ یوں سلسلہ چل رہا تھا۔ تعویذات اور دم پھوک کے لئے اس نے کچھ بندے مامور کئے ہوئے تھے۔ جو پہلے ہی تعویذ تیار کر کے رکھ چھوڑتے تھے۔ ان میں کچھ طبع شدہ چھوٹے چھوٹے کاغذ کے پرزے بھی تھے جن پر ورد وظائف لکھے ہوتے۔ ہر سائل یا مرید کو وہی دے دیئے جاتے۔ سیدن شاہ کے پاس تو محض اپنا مسئلہ کہنے اور اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ ان مریدین میں یہ بات مشہور تھی کہ سیدن شاہ سارے دن میں لوگوں کے دکھ اور مسائل سنتے ہیں اور پھر رات کی تنہائی میں اللہ کے حضور ان کے لئے دعا گو ہوتے ہیں۔

مریدین کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ دوپہر سے پہلے تک ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اگر سیدن شاہ کا دل چاہے تو اس سے پہلے بھی اٹھ جاتا تھا۔ تاہم اس دن چند ہی مرید خواتین وہاں پر موجود تھیں

جب باہر سے ایک ملازم نے آ کر پیراں دتے کے کان میں کہا کہ ڈی ایس پی رفاقت باجوہ آیا ہے۔ لاشعوری طور پر پیراں دتے کو اس کا انتظار تھا۔ اس لئے وہ خود باہر چلا گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ کر سیدن شاہ سے صورت حال کہہ دی۔ مریدین جا چکے تھے۔ اس لئے سیدن شاہ نے رفاقت باجوہ کو وہیں بلوا لیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا تو سیدن شاہ نے بغیر کسی سلام و دعا کے سیدھے ہی اس سے کہا۔

"ڈی ایس پی......! تمہیں بہت جلدی ہے یا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری یادداشت بہت تیز ہے۔" سیدن شاہ کے لہجے میں حقارت اور دبا دبا غصہ تھا۔ رفاقت باجوہ کو اس کی طرف سے اس رویے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ ایک لمحے کو حیران ہوا پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"نہیں شاہ جی......! نہ مجھے جلدی ہے اور نہیں میں کچھ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو ادنیٰ سا ملازم ہوں۔ اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے آیا ہوں۔"

"کیا شہر میں تمہارے فرض ختم ہو گئے ہیں جو تم نے یہاں آنے کے لئے اتنی تیزی دکھائی۔"

"فرض تو فرض ہوتا ہے شاہ جی......! اس میں شہر یا گاؤں گوٹھ کی تخصیص کیا۔"

"ڈی ایس پی......! کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں اس علاقے سے رکن اسمبلی ہوں۔ تمہیں یہ خبر بھی نہیں ہے کہ ہم ہر حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں چاہے وہ کسی پارٹی کی بھی ہو۔ اور کیا تمہیں یہ معلوم بھی نہیں ہے کہ تیرے جیسے آفسر کو میں اپنے گھر کے باہر چوکیداری پر مامور کر سکتا ہوں۔" سیدن شاہ کے لہجے میں وہی حقارت تھی۔ اس پر رفاقت باجوہ نے کچھ کہنا چاہا تو سیدن شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ "سنو......! پہلے دن میں نے یہی سمجھا تھا کہ تم ایک فرض شناس پولیس آفیسر ہو۔ اس لئے میں نے تمہیں اس حویلی میں آنے کی اجازت دی۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ تم تنخواہ تو حکومت سے لیتے ہو مگر کام کسی اور کے لئے کرتے ہو۔ جس نے بھی تمہیں میرے معاملات پر نگاہ رکھنے کے لئے کہا ہے۔ اسے جا کر بتا دو کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی تک میں نے اس کے نقصان کا نہیں سوچا، اگر سوچ لیا تو وہ اس علاقے میں بھی نہیں رہے گا۔ تم اپنے کام سے کام رکھو، اپنی اوقات سے بڑھ کر مت سوچو......!"

"شاہ جی......! میں آپ کی رائے سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں رکھتا، میں تو یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ معاہدے کے مطابق......"

"میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، تم سے اگر رب نواز کو پکڑا جا سکتا ہے تو پکڑ لو۔

اور اگر تم نے ایسی غلطی کر لی تو بہت پچھتاؤ گے۔ میں اسے تمہاری ذاتی دلچسپی سمجھوں گا۔ جاؤ، اب یہاں سے چلے جاؤ“ سیدن شاہ نے حقارت سے کہا، مسند سے اٹھا اور ڈی ایس پی کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔

رفاقت باجوہ نے وہیں کمرے میں موجود پیراں دتہ کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس سے بات کرنا فضول ہوگا۔ اس کے ساتھ وعدہ خلافی ہی نہیں ہوئی بلکہ دھوکہ دیا گیا تھا۔ سیدن شاہ کا حقارت بھرا لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ جس سے اس کے پورے بدن میں غصہ پھیل گیا تھا۔ جس پر جلتی پہ تیل کا کام پیراں دتہ کی مسکراہٹ نے کیا۔ رفاقت باجوہ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور باہر کی سمت چل دیا۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

سیدن شاہ اپنے کمرہ خاص میں جا کر اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رفاقت باجوہ کس کیفیت میں یہاں سے جائے گا۔ اس کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اسے بہت کوششوں کے بعد امین خاں نے تعینات کروایا تھا تاکہ تھانے کی سیاست کی جا سکے۔ سیدن شاہ کو اگرچہ ایسی کسی سیاست کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن یہ معاملہ چونکہ سامنے آگیا تھا اس لئے سیدن شاہ نے پوری طرح اس پر سوچ بچار کی تھی۔ مدعی پارٹی رب نواز کو گرفتار کروانے میں قطعاً دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ پیراں دتہ نے اس بارے پورا یقین کر لیا تھا۔ اماں فیضاں نے یہی کہا تھا کہ اس کے دروازے پر دو جہان کا بادشاہ لے کر آگئے ہیں تو اس نے دل سے معاف کر دیا ہے۔ اب چاہے وہ رشتہ دیں یا نہ دیں۔ وہ اسے معاف کر چکی ہے۔ اس پر پیراں دتہ نے ایک اور صاف کاغذ پر اماں فیضاں کا انگوٹھا لگوا لیا تھا۔ قانونی طور پر سیدن شاہ نے معاملہ اپنے حق میں کر لیا تھا۔ اگر کسی طرح رب نواز پکڑا بھی جاتا ہے تو وہ عدالت کے ذریعے اسے باعزت بری کروا سکتا تھا۔ وکلا کی ایک جماعت اس کے لئے ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ وہ ان سے قانونی مشورہ کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے رفاقت باجوہ کو رگید کر رکھ دیا تھا تاکہ دوبارہ اس کی ہمت نہ پڑے۔ جبکہ اماں فیضاں کی تو ویسے ہی ہمت نہیں تھی کہ تھانے تک جا سکے۔ کیونکہ تھانے جانے کی صورت میں بھیرے کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا اسے پورا یقین تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ رسائی خان محمد تک تھی، جس کے لئے اس نے پیراں دتہ کو حکم دے دیا تھا کہ ”بس بہت ہو چکی خان محمد کی سیاست، یہ سارا کھیل اس کا رچایا ہوا ہے۔ وہ نہیں رہے گا تو اس کے اشارے پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں بھی نہیں رہیں گی۔ اس لئے اسے ختم کر دیا جائے۔“ اور اسے ختم کرنے کے لئے رب نواز کو

مامور کر دیا گیا تھا۔

سیدن شاہ سارے کھیل کو سمجھ گیا تھا اور جب کھیل کی سمجھ آجائے تو کامیابی کے امکانات سو فیصد ہو جاتے ہیں۔ وہ عرس آنے سے پہلے پہلے یہ سارا کھیل ختم کر دینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر سیدن شاہ کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن خان محمد کا ڈیرہ آباد تھا۔ وہاں پر علاقے کے چند معزز لوگ جمع تھے۔ انہیں خان محمد نے دعوت دی تھی، رات کا کھانا کھا کر وہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان یہی بحث چل رہی تھی کہ آئندہ آنے والے الیکشن میں وہ کس کا ساتھ دیں گے۔ خان محمد ان پر اپنی خواہش ظاہر کر چکا تھا کہ وہ سیدن شاہ کی ہر حالت میں مخالفت کرے گا۔ جس پر لوگوں کی ملی جلی رائے تھی کہ اس کے ساتھ مخالفت ہمارے لئے فائدے میں نہیں ہے۔

”دیکھیں......! اس کی مخالفت کیوں نہ کی جائے۔ اس نے علاقے کے لئے کیا ہی کیا ہے۔ عوام اسی طرح جاہل ہے، ان تک کوئی سہولت نہیں پہنچی۔ اس جدید دور میں بھی یہاں کے لوگ پرانے وقت کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔“ خان محمد نے کہا۔

”مگر پھر بھی لوگ اسے چاہتے ہیں۔ وہ یونہی الیکشن نہیں جیت جاتا، اسے ووٹ ملتے ہیں۔ لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے دکھ درد کا مداوا کرنے والا وہی ہے۔ ووٹ تو عوام نے دینے ہیں نا۔“ ایک معزز شخص نے خان محمد کی بات کا جواب دیا تو خان محمد نے الجھتے ہوئے کہا۔

”آخر کب تک، آپ نہیں سمجھتے کہ عوام کو شعور ملے۔“

”کیا ہوگا پھر، عوامی شعور ہم جیسے لوگوں کو بھی بہا کر لے جائے گا۔ یہ جو لوگ ہمارے ہاں کام کرتے ہیں نا، یہ ہماری بات بھی نہیں سنیں گے۔“ ایک دوسرے شخص نے خان محمد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اصل میں خان محمد جو مقام اس کے پاس ہے، ہم ساری زندگی بھی لگے رہیں تو اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ لوگ اسے اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ یہ تو ایک پوری نسل کی بات ہے وہ پڑھے لکھے گی، باشعور ہوگی تو ہی انہیں ایسے پیشواؤں کی سمجھ آسکے گی۔ اسی لئے اس نے پورے علاقے میں کوئی سکول نہیں بننے دیا۔ حکومت کو دکھاوے کے لئے اگر کوئی سکول بنا بھی ہے تو اس کو تالا لگا ہوا ہے۔ کسی کی جرأت نہیں کہ وہاں پڑھ سکے۔ عوام کی سوچ کیسے بدلی جا سکے گی؟“

"اس کا کوئی حل تو ہوگا؟" خان محمد نے کہا۔

"کوئی حل نہیں ہے۔ جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، اسی طرح کوئی ایسا شخص جو اس کے پیری مریدی والے مقام والا جادو توڑے، تبھی کوئی حل سامنے آسکتا ہے۔ لہٰذا خاموش رہو......"

"ٹھیک ہے، آپ سب کی رائے کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں بہر حال اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔" خان محمد نے حتمی انداز میں کہا۔

"یہ تمہاری مرضی ہے۔ اللہ کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔" ان میں سے ایک شخص نے کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب چلیں۔ بہت وقت ہوگیا۔" اس کے اٹھتے ہی دوسرے لوگ بھی اٹھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب لوگ چلے گئے۔ خان محمد کو افسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی تھی۔ وہ سب کو رخصت کر کے ڈیرے سے جانے لگا تو اس کے ملازم بھی اس انتظار میں تھے کہ وہ جائے تو وہ لوگ بھی آرام کریں۔ ان میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ کچی بستی کے دو لوگ رب نواز اور سیدو بھی اس انتظار میں تھے کہ خان محمد ڈیرے سے گھر کی طرف جائے۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر اندھیرے میں ایک درخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں سے وہ ڈیرے کا سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ خان محمد ڈیرے سے نکلا تو وہ بھی فوراً اتر آئے۔ اور جس وقت وہ اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا، اس پر فائر کھول دیا گیا۔ لمحوں میں خان محمد خون سے لت پت ہوگیا۔ وہ چکرا کر گرا، دونوں کو اس کے مرنے کا یقین ہوگیا تھا۔ اگرچہ فائر کی آواز رات کے سناٹے میں بہت دور تک گئی تھی مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ جس وقت خان محمد زمین پر گرا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ ایک جانب بھاگ نکلے۔ انہیں یقین تھا کہ جب تک لوگوں کو صورت حال کا علم ہوگا وہ بہت دور نکل چکے ہوں گے۔

وہ دونوں پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ دونوں کا دھیان اس طرف تھا کہ جہاں انہوں نے جیپ کھڑی کی تھی اور ڈرائیور انتظار کر رہا ہے وہ وہاں تک پہنچ جائیں۔ پھر فرار ہونے میں آسانی تھی۔ کافی دور تک آ جانے کے بعد انہوں نے اپنی سانس بحال کی اور صورت حال کا اندازہ لگایا کہ وہ کہاں پر ہیں۔ اس وقت ان کے اوسان خطا ہوگئے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ خان محمد کے ڈیرے کے قریب ہی ہیں۔ وہ بجائے سیدھا جانے کے ایک طرف کو نکل گئے تھے اور گھوم کر پھر وہیں آگئے تھے۔ اگلے ہی لمحے بھونکتے ہوئے کتوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑیوں کی بند لائٹیں روشن ہوگئیں۔ جس وقت وہ سمت کا اندازہ کر کے اپنی جیپ تک پہنچے، اس

وقت تک لوگ ان تک پہنچ گئے۔ اور انہوں نے فرار کے سارے راستے بند کر دیئے۔ کچھ دیر تک ان میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور پھر ان کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ رب نواز اور سیدو پکڑے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور اپنی جیپ سمیت ان کے قبضے میں تھا۔

یہ لوگ جس وقت انہیں پکڑ کر ڈیرے پر پہنچے، اس وقت انہیں پتہ چلا کہ خان محمد کی سانسیں بحال تھیں، اس لئے اسے لے کر ہسپتال چلے گئے ہیں۔ تب انہی میں سے ایک شخص نے مشورہ دیا کہ حملہ آوروں کو بھی فوری طور پر تھانے پہنچا دیا جائے۔ یہاں رکھ کے ان کا کرنا کیا ہے۔

اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا جب تھانے میں خان محمد کی لاش سمیت وہ تینوں مجرم بھی موجود تھے۔ خان محمد راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ تھانے کا عملہ غائب تھا، ایک سنتری اور منشی ہی انہیں ملے تھے۔ منشی کو جس وقت معلوم ہوا کہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ اس نے فوراً اوپر کے افسران کو فون کر دیا۔ جس وقت انسپکٹر پہنچا اس کے ساتھ ہی ڈی ایس پی رفاقت باجوہ بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے صورت حال کا اندازہ کیا اور انسپکٹر سے پوچھا۔

"ملزمان سے پوچھ تاچھ کی وہ کون ہیں، انہوں نے قتل کیوں کیا۔"

"جی سر.....! ایک ملزم سیدو ہے اور دوسرا رب نواز......!"

"رب نواز......!" یہ نام بڑبڑاتے ہوئے رفاقت باجوہ چونکا، پھر جلدی سے پوچھا۔

"اقرار جرم کیا؟"

"ہاں سر......! ان کا کہنا ہے کہ ان کی خان محمد سے ذاتی دشمنی تھی۔"

"ملزمان کو بلاؤ......!" یہ کہہ کر اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر بولا۔ "ٹھہرو......! میں خود دیکھتا ہوں۔"

رفاقت باجوہ وہاں تک گیا جہاں رب نواز، سیدو اور ڈرائیور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر وہ لوگ موجود تھے جو انہیں لے کر آئے تھے۔ رفاقت باجوہ نے ایک نظر انہیں دیکھا اسے فدا حسین دکھائی دیا جو خان محمد کا خاص آدمی تھا۔ دونوں کئی بار مل چکے تھے۔ اس نے فدا کو بلایا اور کہا۔

"ایف آئی آر درج کراؤ اور خان محمد کی نعش کو لے کر چلے جاؤ۔ اور یہ بھول جاؤ کہ ملزمان پکڑے گئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" فدا حسین نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"کیا تم اصل مجرم تک نہیں پہنچنا چاہتے ہو۔" رفاقت نے غراتے ہوئے کہا۔ تو فدا کی

سمجھ میں بات آ گئی۔ ”میں کل جنازے میں شرکت کے لئے آؤں گا۔ وہاں پر لوگ مجھ سے یہی مطالبہ کریں کہ قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔“

”جی میں سمجھ گیا۔ جب قاتل گرفتار ہی نہیں ہیں تو ان کی ضمانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“

”ہاں......! مگر میں اس سے بھی آگے کی سوچ رہا ہوں۔ خیر......! جیسے کہا ہے ویسے کرو۔ اور تمہارے ساتھ ان لوگوں کو سمجھا دو......“

”ٹھیک ہے۔ جی۔“ فدا حسین نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گیا۔ جب تک وہ لوگ وہاں سے چلے نہیں گئے۔ رفاقت وہیں کھڑا رہا۔ پھر ملزمان کے پاس جا کر ان تینوں کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

”تم میں رب نواز کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ اس نے بغیر کسی خوف کے کہا تو رفاقت باجوہ نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماردی۔ جس سے وہ الٹ کر گرا۔ تھانے کا دیگر عملہ اس کے ارد گرد کھڑا تھا۔ جبکہ رفاقت باجوہ کے ساتھ آئے لوگ بھی وہیں موجود تھے۔ رفاقت نے انہیں حکم دیا۔

”انہیں گاڑی میں ڈالو۔ اور آؤ میرے ساتھ۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ تھانے کے عملے کی جرأت نہ ہو سکی کہ پوچھ لیں کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ رفاقت باجوہ ان تینوں کو نامعلوم مقام کی طرف لے گیا تھا۔

☆☆☆

جنڈ کے درخت تلے علی تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ جس کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ احمد بخش ابھی تک گھر سے نہیں آیا تھا، جبکہ درویش بابا فجر پڑھنے کے بعد نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ ساتواں دن تھا، علی یوں ہی تنہا بیٹھا رہتا۔ کوئی مزدور یا کاریگر وہاں پر نہیں آیا تھا۔ ایک طرح سے سارا کام ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ خان محمد کی ناگہانی موت کے بعد پورے علاقے میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ علی نے اس کا جنازہ پڑھا تھا، پورے علاقے سے لوگ جمع تھے۔ سب کا یہی مطالبہ تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے۔ وہاں پر اس نے رفاقت باجوہ سمت بہت سارے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا تھا، جن کا تعلق شہر سے تھا اور وہ انہیں جانتا بھی تھا۔ لیکن اس کا مقصد فقط جنازہ پڑھنا تھا، اس لئے وہ فرض کفایہ ادا کر کے واپس آ گیا تھا۔ اس دن کوئی بھی نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اس سے باتیں کرنے آتے تھے۔ پہلے دن وہ تینوں بیٹھے

رہے۔ پھر یہ معمول بن گیا۔ احمد بخش آتا ہی دیر سے، درویش بابا صبح ہی صبح کہیں نکل جاتا اور دن چڑھے واپس آتا۔ تب اس کے پاس تھوڑا بہت کھانا ہوتا، جسے وہ خود بھی کھاتے اور علی کو بھی کھلاتا۔ ایک دن علی نے پوچھ ہی لیا۔

”بابا جی......! یہ جو آپ کھانا لاتے ہیں۔ یہ کہاں سے آتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ فکر نہ کریں فقیر سائیں، میں یہ کھانا بھیک میں لے کر نہیں آتا، بس اللہ دیتا ہے اور میں لے آتا ہوں۔“

”کب تک چلے گا یہ۔ ہمیں خود اپنا بندوبست کرنا ہوگا۔“ علی نے فکرمندی سے کہا۔

”فقیر سائیں، توکل بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس نے یہاں رکھا ہے، وہ بندوبست بھی کر دے گا۔“

”درویش بابا......! توکل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ہاتھ پیر جوڑ کر یہاں بیٹھ جائیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔“

”کیا آپ نہیں سمجھتے کہ میرا یہاں ہونا ہی ایسا کوئی بندوبست ہے۔ آپ فکر نہ کریں فقیر سائیں۔ آپ نے جب میرے ذمے یہ فرض لگا دیا ہے تو یہ میری ذمے داری ہے۔“

درویش بابا نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

اسی طرح اس دن ساتواں دن تھا۔ دور دور تک مزدوروں کا پتہ نہیں تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ مسجد کی دیواریں ہو چکی تھیں اور مدرسے کی بنیادیں بھری جا چکی تھیں۔ خود ساختہ نقشے کے مطابق زمین کو ہموار کر لیا گیا تھا۔ پھر اس جگہ کا تعین بھی کر لیا گیا تھا جہاں حجرے تعمیر ہونے تھے۔ اب تک وہ سب کھلے آسمان کے تلے ہی رہ رہے تھے۔ علی نے آسمان کی طرف منہ کیا اور پھر دل ہی دل میں کہا۔

”اے اللہ......! تو ہی سب جانتا ہے۔ تیرے لئے کوئی شے غیب نہیں ہے، تجھے علم و خبر ہے یہاں پر میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے، میں نہیں جانتا، مگر تمہیں سب علم ہے، اے اللہ......! تو بہتر معاملہ فرما دے، تو قادر ہے۔“

اس نے پورے خلوص سے دعا مانگی تو دل کو سکون ملا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر یونہی گزر گئی۔ تب اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے مہرو کھڑی تھی۔ اپنی طرف متوجہ پا کر مہرو بولی۔

”میں تو سمجھی تھی کہ تم سو رہے ہو۔“

"آؤ مہرو بیٹھو......!" علی نے صف کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مہرو اس پر بیٹھ گئی اور ساتھ میں لائی ہوئی پوٹلی کھولتے ہوئے بولی۔

"آج میرا دل کیا کہ میں تجھے کھانا دے کر آؤں۔"

"آج تمہارا دل کیوں کیا۔" علی نے قدرے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ رات سانول میرے خواب میں آیا تھا۔ اس سے بہت ساری باتیں ہوئی تھیں۔ انہی باتوں کے دوران اس نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھا کروں۔ کیونکہ تم اس کے مہمان ہو۔ سانول کے مہمان کا میں خیال نہ رکھوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے اس لئے میرا دل کیا کہ میں تجھے کھانا دے آؤں۔" مہرو اپنی ہی دھن میں کہتی چلی گئی۔ علی نے بغور اس کو دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ مہرو وہ پہلے والی مہرو نہیں رہی تھی۔ وہ کئی دنوں سے یہ اڑتی ہوئی باتیں سن رہا تھا کہ مہرو پاگل ہوگئی ہے مگر اس کا دل نہیں مانا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ اس لئے کبھی اس نے توجہ نہیں دی تھی۔

"میری بھی سن رہے ہو یا پھر سوگئے ہو۔" مہرو نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو علی اپنے حواسوں میں آگیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور لمحوں میں فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس لئے مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ بس میرے بارے میں اتنی سی بات کی تھی اس نے؟"

"تو اور کیا؟ ہماری باتیں ہی ختم نہیں ہوتی ہیں۔ ویسے جب مجھے وہ اغواء کرکے لے گیا تھا، اس وقت مجھے بہت ڈر لگا تھا۔ لیکن اب اس سے ڈر نہیں لگتا۔ اب تو وہ مجھے اچھا ہی بہت لگتا ہے۔ میں تو اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اچھا، اتنا پیار ہوگیا ہے اس کے ساتھ۔"

"پیار نہیں، عشق ہوگیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے تم سے عشق ہے۔ وہ خواجہ سائیں کی کافی بھی گاتا تھا نا کہ عشق اولڑی پیڑ وو۔ لوکاں خبر نہ کائی۔ اب مجھے خبر ہوگئی ہے کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ اب مجھے اس سے زیادہ عشق ہے۔"

"اچھا......! اب مجھے بتا دو اور کیا کیا باتیں کرتا ہے۔"

"چند دن ہوئے تھے، اس نے مجھے چراغ جلانے سے روک دیا تھا کہ شام کے وقت قبرستان نہ جایا کرو۔ اب میں نہیں جاتی۔" اس نے بھولپن سے کہا۔

"مہرو......! مجھے ایک بات تو بتا، تمہیں پتہ ہے کہ سانول اس وقت کہاں ہے۔"

"پتہ ہے مجھے۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا، پھر علی کے چہرے کی طرف دیکھ کر

بولی۔ "وہ اللہ سائیں کے پاس ہے۔"

"اللہ سائیں اسے ٹھیک تو رکھتا ہوگا؟" علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں......! وہ بتا رہا تھا کہ وہ اللہ سائیں کے پاس بہت خوش ہے۔ بس مجھے ملنے آتا ہے۔"

"تو پھر تم اللہ سائیں کا شکر ادا کرتی ہو۔" علی نے وہ بات کہہ دی جس کے لئے اس نے تمہید باندھی تھی۔ اس پر مہرو نے غور سے اسے دیکھا اور کہا۔

"کیسے، میں اللہ سائیں کا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

"دیکھو اگر کوئی تم پر احسان کرے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم نماز پڑھا کرو۔"

"وہ تو میں پڑھتی ہوں۔ میں صبح صبح قرآن بھی پڑھتی ہوں۔ تمہیں پتہ ہے میں نے میاں جی سے بچپن میں ہی قرآن پاک پڑھ لیا تھا۔ ہاں......! میں میاں جی سے نہیں بولتی، وہ مجھے کبھی ملنے نہیں آئے وہ تمہیں کبھی ملیں نا تو میرا بتانا، میں انہیں ملنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ گے نا۔" مہرو نے پرشوق انداز میں کہا تو علی نے سر ہلا دیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی اچھی لڑکی کس طرح اپنا آپ کھو چکی ہے۔ سانول کے بعد وہ اس کی محسن تھی۔ ایک رات اس کی چیخ نے ہی دشمنوں کا نشانہ خطا کردیا تھا۔ اگرچہ یہ اللہ کی طرف سے ہی تھا لیکن وسیلہ وہی بنی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو بولی۔

"لو......! اب کھا بھی لو...... تمہارے لئے پراٹھا بنایا ہے شکر ڈال کے۔" یہ کہہ کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر گھڑے پر نگاہ پڑی تو اس جانب بڑھ گئی۔ پانی کا پیالہ بھرا اور اس کے قریب لاکر رکھ دیا۔ علی پراٹھا کھانے لگا۔ وہ جب کھا چکا اور پانی بھی پی چکا، تب مہرو خوش ہوگئی۔

"اب خوش میں نے کھا لیا۔" علی نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، میں خوش...... سانول بھی خوش ہوگا کہ میں تمہارا خیال رکھتی ہوں۔ خوش ہوگا نا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں خوش ہوگا۔" علی نے دکھتے ہوئے دل سے کہا تو اچانک مہرو نے ایک انجانا سوال کردیا۔

"تم نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟"

"ہاں، اللہ سے کیا ہے۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"نہیں......! جیسا سانول مجھ سے کرتا تھا۔"

ایک لمحے کے لئے علی چونک گیا۔ یہ کیا بات کہہ دی ہے اس نے کیونکہ اس کے کہنے

کے ساتھ ہی فرزانہ خاں کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ نہیں (مجھے عشق نہیں ہوا) تب وہ بولی۔

(''نہیں ہوا تو جسے ہوا ہے، اس کی قدر کرو۔ مجھے دیکھو، میں نے قدر نہیں کی نا، تو اب پچھتا رہی ہوں۔'')

پتہ نہیں اس نے یہ بات پاگل پن میں کہی تھی یا ذی ہوش لوگوں کی طرح دانائی کی بات کہہ دی تھی۔ جو بھی تھا، ایک دفعہ علی کی کیفیت بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ وہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ ایسی کوئی بات اس کی زندگی میں آئے گی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، اس لئے مہرو کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ تب مہرو بولی۔ ''تم تو پھر سو گئے ہو۔ اچھا تم سو جاؤ، میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے کہا، وہ کپڑا اٹھایا جس میں پراٹھا بندھا ہوا تھا اور واپس چل دی۔ علی اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

مہرو انجانے میں اسے وہ بات کہہ گئی تھی جس پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا وجدان اسے بہت کچھ کہہ رہا تھا، وہ جب بھی کبھی فرزانہ کے چہرے کو دھیان میں لاتا، ہر بار اس میں تبدیلی دکھائی دیتی تھی۔ ہوا کے دوش پر جو باتیں اس تک پہنچ رہی تھیں ان میں وہ ساری خوشخبریاں تھیں، جیسی وہ فرزانہ کے لئے دعائیں کیا کرتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں مہرو کے ذریعے اسے آگاہ تو نہیں کر دیا گیا۔ چونکہ بات واضح نہیں تھی، اس لئے علی نے سر کو جھٹک دیا۔ ممکن ہے، اسے راہ سے بھٹکایا جا رہا ہو۔ وہ اٹھا اور ایک طویل چکر لگایا۔ وہ پہلے کنویں تک گیا، پھر مدرسے کے اطراف گھوما اور دوبارہ جنڈ کے تلے آ کر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ احمد بخش آ گیا۔ سلام و دعا کے بعد وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اس کی نگاہ کچی بستی کے باہر والے راستے پر پڑی، وہاں سے کوئی جیپ آ رہی تھی۔ وہ جیپ بستی میں نہیں مڑی بلکہ آگے تک آ گئی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ ان کے نزدیک آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ان کے قریب آ کر رک گئی۔ ان میں سے تین نوجوان لڑکے اور دو لڑکیاں باہر آئیں۔ آخر میں درویش بابا بھی باہر آ گئے۔ علی اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ سب اس کے قریب آ گئے۔ تب درویش بابا نے تعارف کراتے ہوئے علی کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ ہیں ہمارے فقیر سائیں۔ یہ آپ کو یہاں کے ماحول بارے بہتر بتا سکیں گے۔ آپ تشریف رکھیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے صف سیدھی کی اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو سلام دعا کے بعد رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ تب علی نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں۔''

''ہم شہر سے آئے ہیں، ہمارا تعلق ایک فلاحی تنظیم سے ہے اور ہم یہاں سروے کے لئے آئے ہیں۔''

''سروے......؟'' علی نے وضاحت چاہی تو گفتگو طویل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دوپہر سر پر آ گئی۔ علی نے بہت اچھے انداز میں ان کی راہنمائی کی تھی۔ وہ بہت شکر گزار تھے۔ پھر بہت جلد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ چلے گئے۔ علی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ایک در بند ہو جانے کے بعد دوسرا در کھل گیا ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

شام ہونے کو آ گئی تھی۔ سورج مغرب کی جانب جھک کر اپنی آب و تاب کھو چکا تھا۔ ایسے وقت میں سیدن شاہ حویلی کے کاریڈور میں دھیرے دھیرے ٹہل رہا تھا، اس کے انداز میں بے چینی تھی، بلاشبہ اس کے ذہن میں کوئی الجھن تھی۔ ذرا سا وقت گزرا ہو گا کہ پیراں دتہ آ گیا۔ اس نے ایک ہی نگاہ میں سیدن شاہ کی بے چینی بھانپ لی تھی۔

''جی پیر سائیں، حکم، میں حاضر ہوں۔'' پیراں دتے نے انتہائی ادب سے کہا تو سیدن شاہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''کچھ پتہ چلا، وہ رب نواز اور سیدو کہاں ہیں؟''

''نہیں، پیر سائیں۔''

''تمہیں پتہ ہے نا کہ ان کے ساتھ ڈرائیور بھی ہے اور جو گاڑی تھی وہ میرے نام ہے۔'' سیدن شاہ نے دھیرے سے کہا۔

''جی سائیں......!'' پیراں دتے نے دبی آواز میں کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سیدن شاہ کی یہ پریشانی کیوں ہے۔ خان محمد کی موت اگرچہ ان کے لئے خوشی کی بات تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تینوں غائب تھے۔ پہلے پہل انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ کہیں فرار ہو گئے ہیں۔ وہ واپس آ جائیں گے یا ان سے رابطہ کریں گے۔ مگر ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔

''ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود تمہیں کوئی پتہ نہیں ہے کہ وہ کدھر ہیں۔ انہیں زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے؟'' سیدن شاہ نے کہا تو وہ خاموش رہا اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو کہتا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''پیر سائیں......! ممکن ہے وہ شہر میں کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ میں وہاں ان کا پتہ

کرواتا ہوں۔'' پیراں دتے نے دھیمی آواز میں کہا۔

''پیراں دتہ، مجھے نہیں لگتا کہ وہ خود کہیں غائب ہیں۔ضرور انہیں غائب کر دیا گیا ہوا ہے۔'' سیدن شاہ نے کہا۔پھر ذرا توقف کے بعد بولا''خیر......!اس کے بارے میں تم نہیں اب میں خود معلوم کروں گا، تم مجھے یہ بتاؤ......! وہ رب نواز کی بہن مہرو کیسی ہے؟'' جس انداز میں سیدن شاہ نے پوچھا تھا پیراں دتہ اندر سے کانپ گیا۔اس کے من کا چور اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ مگر جواب تو دینا تھا۔

''سائیں بہت خوبصورت ہے۔لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا؟'' سیدن شاہ نے دھیرے سے پوچھا۔

''سنا ہے کہ وہ آج کل پاگل ہو گئی ہے۔وہ اپنے آپے میں ہی نہیں۔'' پیراں دتہ جلدی سے بولا۔

''دیکھو......! سیدو کا تو کوئی نہیں۔لیکن رب نواز کی بہن ہے۔ہم نے کہا تھا کہ اگر اس نے وہ بھیرے سے شادی نہ کی تو اسے حویلی میں رکھا جائے، جاؤ، اسے حویلی میں لے آؤ۔''

''سائیں وہ پاگل......!''

''جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔اس کا حویلی میں ہونا ضروری ہے۔اسے لانا بھی اس طرح کہ پوری کچی بستی کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مہرو حویلی میں ہے۔'' سیدن شاہ نے ذرا سختی سے کہا۔

''جیسے حکم سائیں کا۔'' پیراں دتے نے کہا اور واپس مڑ گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مہرو جیسی پاگل لڑکی کو حویلی میں لا کر رکھنے کا مقصد کیا ہے۔اسے معلوم تھا کہ نجانے کتنی لڑکیوں کی عزت اس حویلی میں پامال ہو چکی تھی۔اور اب بھی حویلی میں اتنی لڑکیاں تھیں کہ سیدن شاہ کا دل ان سے بھرا نہیں ہوگا۔مگر ایسے میں ایک پاگل لڑکی......اسے سمجھ میں نہیں آیا۔

مگر سیدن شاہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ان لوگوں کے بارے میں اتنی خاموشی بلاشبہ پراسرار ہے۔اس نے دو دن انتظار کیا تھا پھر اس کے بعد اس نے اپنے ذرائع آزمانا شروع کر دیئے تھے۔مگر اتنی کوشش کے باوجود اسے کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔پھر آج دوپہر کے وقت اسے ایک فون کال موصول ہوئی تھی، جس نے خطرے کی شدت کا اعلان کر دیا تھا۔سیدن شاہ کے اپنے ذرائع نے اسے بتایا تھا کہ اس کے خلاف ہوم سیکرٹری کے پاس ایک درخواست آگئی ہے۔جس میں اس کے بارے میں تفتیش کے خصوصی احکامات درکار تھے۔مزید

تفصیلات کیا تھیں یہ اسے نہیں معلوم تھا۔اتنی ذرا سی خبر کے ساتھ ہی اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے ارد گرد کہیں خطرہ منڈلا رہا ہے۔ان لوگوں کا غائب ہونا اور خصوصی احکامات ان میں کہیں نہ کہیں تعلق ضرور ہے۔اس نے اس خطرے سے نپٹنے کے لئے پیش بندی شروع کر دی تھی۔

''سائیں......!علاقے کا تھانیدار حاضر ہوا ہے۔'' ایک ملازم نے تقریباً جھکتے ہوئے کہا تو سیدن شاہ اپنے خیالات سے چونکا۔اور پھر دھیرے سے کہا۔

''اسے بٹھاؤ۔''

یہ سنتے ہی ملازم واپس چلا گیا۔تھوڑی دیر بعد سیدن شاہ اس کمرے میں چلا گیا جہاں تھانیدار بیٹھا ہوا تھا۔وہ سیدن شاہ کو دیکھ کر احترام سے کھڑا ہو گیا تو سیدن شاہ نے پوچھا۔

''وہ......!تمہیں جو کہا گیا تھا، اس کا پتہ چلا۔''

''جی سائیں......!جس رات خان محمد قتل ہوا ہے، اس رات میرے تھانے میں تو کوئی نہیں آیا مگر میں نے پتہ کروایا ہے، صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اس رات آپ کی گاڑی شہر والے تھانے میں دیکھی گئی ہے۔وہیں خان محمد کی نعش لائی گئی تھی۔پھر اس کے بعد کسی کو کچھ پتہ نہیں۔'' تھانیدار نے اپنی طرف سے تفصیل بتا دی۔

''تم نے میری طرف سے گاڑی چوری ہونے کی ایف آئی آر درج کر لی ہے۔'' سیدن شاہ نے پوچھا۔

''جی......!میں سارا معاملہ سمجھ گیا ہوں سائیں......!آپ فکر نہ کریں۔میں نے ایک دن پہلے کی ایف آئی آر درج کر دی ہے۔''

''ٹھیک ہے، شہر والے اس تھانے کے کسی بندے کو بھی، کسی بھی قیمت پر خرید و، اور اس سے پوری تفصیل معلوم کرو۔ان بندوں کا پتہ چلنا چاہیے۔جتنی جلدی یہ سب ہوگا، اتنا زیادہ تمہیں مالا مال کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے سائیں......!میں کل شام دوبارہ آؤں گا۔''

''نہیں......!تم نہیں آؤ گے، فون کرو گے مجھے۔'' سیدن شاہ نے کہا تو تھانیدار نے سر ہلا دیا۔وہ سمجھ چکا تھا کہ تمام تر معاملات میں رازداری چاہیے تھی۔تھانیدار چلا گیا۔اور سیدن شاہ سوچ میں پڑ گیا۔اس نے جو خطرہ محسوس کیا تھا وہ درست تھا۔اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ بندے خود غائب نہیں، انہیں غائب کر دیا گیا ہوا ہے۔ایسا کون کر سکتا ہے؟ اور اتنی تیزی سے یہ سب کیسے ہو گیا۔یہ سوچنے کا ابھی وقت نہیں تھا۔اس لئے وہ فوراً اپنے کمرہ خاص میں گیا۔اسے کچھ ایسے

لوگوں کو فون کرنا تھے، جس سے وہ پوری تفصیلات سے آگاہ ہو سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہی وہ اپنے بچاؤ کے انتظامات کر سکتا تھا۔

☆☆☆

روہی کے وسیع صحرا میں رات اتر چکی تھی۔ جنوب سے چلنے والی ہوا تھم چکی تھی۔ دن بھر کی تلخی ختم ہو چکی تھی اور موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ جنڈ کے درخت سے ذرا دور کھلے میں جہاں سے مدرسے کی بنیاد شروع ہوتی تھی، وہاں صف بچھائے علی، احمد بخش اور درویش بابا بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی تھی۔ کچھ دیر معمولات کے ذکر واذکار کے بعد احمد بخش نے یونہی بات چھیڑ دی۔

"علی بھائی......! کیا مہرو سچ مچ پاگل ہو گئی ہے؟" احمد بخش کے لہجے میں دکھ تھا جیسے مہرو کے پاگل ہو جانے کا اسے بہت افسوس ہو رہا ہو۔ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ درویش بابا نے لاشعوری طور پر کہا۔

"نہیں بابا......! وہ پاگل نہیں ہوئی، ہاں تھوڑی دیر کے لئے مدہوش ضرور ہو گئی ہے۔"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اسے جیسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ فوراً ہی کھڑا ہوا اور علی کے سامنے ہاتھ باندھ دیئے۔ "گستاخی ہو گئی فقیر سائیں، معاف کر دیں۔"

"درویش بابا کیا ہو گیا ہے آپ کو، کون سی گستاخی کر لی ہے آپ نے، آپ بیٹھیں، کیوں گنہگار کرتے ہیں مجھے۔" علی نے تیزی سے اس کے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہی غلطیاں ہو جاتی ہیں ورنہ ہم بھی کہیں سکون سے نہ بیٹھے ہوتے۔" درویش بابا نے روہانسے ہوتے ہوئے کہا۔

"بابا افسوس نہ کریں آپ، کوئی غلطی نہیں ہوئی، بلکہ آپ نے تو بیٹھے بٹھائے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔" علی نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔ اللہ کے لئے آپ بتائیں یہ سارا معاملہ کیا ہو رہا ہے اس کے ساتھ۔" علی نے دھیرے سے کہا۔ تو درویش بابا چونک گیا۔

"فقیر سائیں......! پہلے آپ مجھے بتائیں، آپ نے معاف کر دیا ہے۔" اس کی یہی رٹ تھی۔

"ہاں......ہاں معاف کیا؟ اب آپ بولو۔"

"فقیر سائیں......! آپ بہتر جانتے ہیں۔ پر آپ کا حکم ہے تو جو اس ناچیز کو پتہ ہے

عرض کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے توقف کیا۔ علی خاموش رہا تو وہ بولا۔ "سائیں......! جیسے بارش سے پہلے حبس چھا جاتا ہے نا، سکون کی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب بے سکونی چھا جائے۔ یہ معاملہ تو ایک طرف لیکن آپ جانتے ہیں کہ عشق کوئی معمولی شے تو ہے نہیں۔ جس پر اترتا ہے، پتہ تو اسے لگتا ہے۔ پوری جان سے زیادہ وزن سر پر آ جائے اور پھر کچھ بھی نہ ہو ایسا کیسے ممکن ہے فقیر سائیں۔ کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے درویش بابا کہ شیر خوار بچہ، مرغن غذا؟" علی نے تصدیق چاہی۔

"سائیں......! بالکل ایسا ہی ہے۔ اس میں نہ ابھی جذب کی صلاحیت ہے اور نہ برداشت کی قوت......" یہ کہتے ہوئے اس نے خلا میں گھورا اور پھر کہا۔ "میں نے سنا ہے فقیر سائیں کہ اس مہرو کا عاشق سانول حضرت خواجہ سائیںؒ کی ایک کافی کے بول پڑھتا تھا۔"

"ہاں......! وہ تھے عشق اولڑی پیڑ وو۔ لوکاں خبر نہ کائی۔" احمد بخش نے تیزی سے کہا۔

"بالکل......! اللہ تمہارا بھلا کرے۔ یہی بول تھے۔ لوگوں سے سنا ہے، اسے یہ بول بڑے پسند تھے۔ اس میں عشق کو پیڑ کہا گیا ہے اور وہ بھی اولڑی......پیڑ......، درد، انوکھا درد......ساری بات اسی درد میں ہے، خواجہ سائیںؒ نے عشق کو درد کہا ہے تو کیوں کہا ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے درویش بابا کہ جب بھی بدن میں کوئی اچھی یا بری تبدیلی آتی ہے تو درد محسوس ہوتا ہے، اس سے انسان اپنی طرف متوجہ ہوتا ہے۔" علی نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ نے میری مشکل حل کر دی۔ تو عشق جب کسی من میں بسیرا کرتا ہے تو کیا اسے اپنی جگہ بنانے کے لئے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کرتا۔ ایک نگاہ ناز پورے جسم کو بلا کر رکھ دیتی ہے، یہ تو عشق ہے، جسے خواجہ سائیں نے انوکھا ہے۔ اس کا انوکھا پن یہی ہے کہ جس پر بھی یہ وارد ہوتا ہے اسے خود سے بے حال کر دیتا ہے۔"

"درویش بابا، کیسے؟" علی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو درویش بابا نے فوراً علی کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہ فقیر سائیں......! میرا امتحان مت لو، پرانے زخم کھل جائیں گے۔ اس بار اگر میں مدہوش ہو گیا تو پھر موت بھی ہوش میں نہیں لا سکے گی۔"

"تو پھر کمائی کیا کی ہے آپ نے؟" اس بار علی نے سنجیدگی سے کہا تو درویش بابا دھیرے دھیرے اپنی جگہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ کافی دیر تک یونہی مراقبے میں بیٹھا رہا اور پھر سر اٹھا کر علی کی طرف دیکھا اور پھر کہتا چلا گیا۔ "دور کے ایک شہر میں شہزادہ رہتا تھا۔ بڑا ہی

بانکا اور سجیلا تھا۔ وہ جب بھی کسی محفل میں جاتا، ساری محفل کی جان بن جاتا۔ حسن اس کے سامنے خود کو قربان کر دینے کے لئے بے تاب رہتا جبکہ اس کی بے نیازیاں کسی کو التفات کے قابل ہی نہ سمجھتی تھیں۔ وہ شہزادہ مغرور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حسن مایوس ہوتا گیا۔ اس کے مغرور ہونے میں زیادہ قصور حسن کا بھی تھا، جو خواہ مخواہ اس کی وجاہت پر مٹنے کو تیار رہتا تھا۔ اور پھر ایک دن حضرت عشق آن وارد ہوئے۔ تھی تو وہ بھی بڑی حسین، مگر گدڑی میں پڑا ہوا لعل تھی۔ وہ شہزادہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ نہ اپنا ہوش نہ دوسرے کی خبر......! یہی آرزو اس کی زندگی کا مقصد بن گئی کہ اسے حاصل کر لوں۔ اور اس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اس شہزادے کو دھتکار دیا۔ وہ جس سے عشق کرتی تھی وہ اندھا تھا، وہ اس کی بیساکھی بن چکی تھی۔ اس کے آخری لفظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ ''جاؤ......! جا کر دو آنکھیں لے آؤ۔ جو اس کی بیساکھی بن جائیں۔ میں تیرا عشق قبول کر لوں گی۔''

''میں اپنی آنکھیں دے دیتا ہوں۔''

''یہ تیرا عشق نہیں، ہوس ہوگی، اور اس سے بھی بڑھ کر لالچ، میں تو پھر بیساکھی ہی رہی کیا فرق پڑا۔''

''اور میں آنکھوں کی تلاش میں نکل پڑا، پھر لوٹ کر گھر نہیں گیا۔''

''تو پھر آنکھیں ملیں......!'' علی نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ملیں......! جو آنکھیں مجھے ملیں، وہ آنکھیں کسی کو دینے والی ہی نہیں تھیں۔ وہ تو امانت ہیں۔'' درویش بابا نے چھلکتی آنکھوں سے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا۔

''اور حضرت عشق......؟''

''سلامت ہے، اسی کے صدقے تو امانت کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہوا ہوں، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔''

''بابا......! اپنی بساط سے بڑھ کر بوجھ اٹھا لینا، کیا یہی انوکھا پن نہیں، جسے خواجہ سائیں نے اولڑا کہا ہے۔'' علی نے درویش بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل......! میں شاید اس طرح اولڑے کی تشریح نہ کر سکتا، انسان وہ کچھ کر جاتا ہے جو عام حالات میں نہیں کر پاتا، پیڑ تو تبدیلی کی ہوتی ہے۔ ہزاروں خواہشیں پل رہی ہوتی ہیں۔ نفس کو مارنا اور ایک اس خالق کے تابع کرنا معمولی بات تو ہے نہیں، پتہ نہیں کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔'' بابا نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے بابا، وہ جو پاکیزہ دل و دماغ رکھتے ہیں، انہیں تو پیڑ کم ہوتی ہوگی، کیوں کیا خیال ہے؟'' علی نے ایک نئی بحث چھیڑ دی۔

''ظاہر ہے فقیر سائیں......! جہاں گندگی کا ڈھیر ہوگا۔ وہاں صفائی میں وقت تو لگتا ہے۔ اور جہاں پاکیزگی ہوتی ہے پیڑ وہاں بھی ہوتی ہے لیکن یہ پیڑ اس دردِ زہ کی مانند ہوتی ہے جہاں تخلیق ہوتی ہے۔ ماں درد سہتی ہے اور جنت اس کے قدموں میں آ جاتی ہے۔ اور جب بچہ پہلا سانس لیتا ہے تو وہ قہقہہ نہیں لگاتا، وہ روتا ہے۔ اس کی جو وجہ بھی آپ بیان کریں وہ سر آنکھوں پر، لیکن پیڑ وہ بھی محسوس کرتا ہے۔ پیدائش سے موت تک زندگی پیڑ سے خالی نہیں اور پیڑ، درد، اذیت زندگی میں تبدیلی کا باعث ہے۔ اور عشق تو سب کچھ بدل کے رکھ دیتا ہے۔'' درویش بابا نے شدت سے کہا۔

''بابا جی......! کچھ عشق کے بارے میں کلام ہو جائے۔'' علی نے دھیرے سے کہا تو درویش بابا جھوم گیا اور پھر دوزانو ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''فقیر سائیں......! یہ آپ کا حکم ہے؟'' بابا نے کہا تو علی تڑپ گیا اور پھر تیزی سے بولا۔

''نہ......نہ...... بابا...... میں کون ہوتا ہوں حکم دینے والا۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہمیں عنایت کر دیں تو۔''

''فقیر سائیں......! آپ کی خواہش ہے تو عرض کرتا ہوں لیکن پوری بات نہیں کہوں گا۔ عشق کی ایک بات میں پھر کبھی کہوں گا، لیکن وعدہ رہا کہ کہوں گا ضرور لیکن اس وقت آپ کی خواہش کا احترام تو مجھ پر واجب ہے نا۔'' درویش بابا نے تحمل اور ادب سے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی درویش بابا۔'' علی نے بھی ادب سے کہا۔ تو بابا گویا ہوئے۔

''عشق تو بابا اسرارِ الٰہی میں سے ایک مخصوص راز ہے۔ حضرات اہل طریقت تو فرماتے ہیں کہ العشق ھو اللہ، یہ تو رب العزت کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ یوں کوئی کہے کہ وہ عشق کی تشریح و توضیح کر سکتا ہے تو یہ ناممکنات میں سے ہے۔ ہاں......! مگر وہ لوگ جو صاحب اسرار ہیں۔......! جن پر عنایت باری تعالیٰ ہے۔ جو محرم راز ہیں۔ جو مقام رضا سے بھی آگے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کوئی اس کی تشریح کر دیں تو بعید نہیں۔''

''پھر بھی......! کچھ تو سمجھ میں آنے والی بات ہو۔'' علی نے اصرار کیا تو درویش بابا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''فقیر سائیں......! بندہ کسی امتحان کے لائق نہیں ہے۔ اللہ کے لئے اپنے اندر

جھانکیئے اور سب جان جائیے حضور......!"

"درویش بابا، آپ تو بار بار شرمندہ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے میں نے دیکھ لیا ہوں، لیکن کیا آپ تصدیق بھی نہیں کریں گے۔"

"فقیر سائیں......! یہ تو میرے لئے اعزاز ہوگا۔" درویش بابا نے چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ کہیں کہ میں اپنا سبق دہرادوں آپ کے سامنے۔"

"بابا......! دیکھو احمد بخش کیا سوچے گا، شاید وہ سمجھے گا کہ ہم اسے بتانا ہی نہیں چاہتے۔"

علی نے اشارے میں کہا تو درویش بابا سمجھ گیا اور پھر جذب سے بولا۔

"عشق کیا ہے یہ تو اسرار الٰہی کا ایک راز ہے۔ لیکن......! جو صاحب عشق ہوتے ہیں۔ وہ تو نگاہ میں ہوتے ہیں۔ جملہ صفات عاشقی یہی ہے کہ عاشق کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کی پوری توجہ ہدف پر رہتی ہے۔ سارا بدن، رکی ہوئی سانس، ٹھہری ہوئی سوچ، آواز سے نا آشنا کان، قوت گویائی نہ ہونا سب اس ہدف کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ گویا کہ وہ خود نشانے پر پڑا ہوا ہے۔" درویش بابا نے کہا تو احمد بخش بولا۔

"یہ عشق حقیقی و عشق مجازی......؟"

"دونوں ایک ہی ہیں۔ سردیوں میں دھوپ بڑی اچھی لگتی ہے نا، سورج نہیں ہوگا تو دھوپ کہاں سے آئے گی۔ خوشبو پیاری لگتی ہے، تو پھول کی وجہ سے، یہ پھول اور سورج کس کی تخلیق ہے اصل میں سارے راستے خالق حقیقی کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ہماری سمجھ کا فرق ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو ساری عقل سمجھ پیدا کرتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ عشق عقل کو ماؤف کر دیتا ہے، اصل میں وہ عقل کو بھی اپنے تابع کر لیتا ہے اور اس سے ہی سارے راستے کھلواتا ہے۔ عشق بس عشق ہے، یہ مجازی یا حقیقی نہیں ہوتا۔ یہ تو ان لوگوں کی تقسیم ہے جنہیں عشق نہیں ہوتا۔ کیونکہ عشق جمع تفریق سے ماورا ہے۔"

"درویش بابا......! وعدہ رہا کہ عشق کے بارے میں ایک بات میں بھی آپ کو بتاؤں گا۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا تو بابا بھی مسکرا دیئے اور بولے۔

"ٹھیک ہے، آپ دونوں جب چاہے ایک دوسرے کو بات بتائیں لیکن یہ بات مہرو سے چلی تھی، وہ کبھی ٹھیک بھی ہوگی؟" احمد بخش نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے احمد بخش......! کندن بننے کے لئے بھٹی میں آنا پڑتا ہے۔" علی نے گہری سنجیدگی سے کہا، ایک لمحہ ٹھہر کر بولا۔ "کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پردہ غیب میں ہی اچھی لگتی

ہیں۔ وہ سامنے آجائیں تو یہ کائنات بالکل پھیکی ہو جائے۔ اس میں سے سارے رنگ، رعنائیاں اور خوبصورتیاں ختم ہو کر رہ جائیں۔ اس کی رضا میں رہنا ہی بندگی ہے۔"

"علی بھائی......! اگر گستاخی نہ ہو تو ایک بات پوچھوں۔" احمد بخش نے جھجکتے ہوئے کہا، علی خاموش رہا تو وہ بولا "کیا یہ کام یونہی رکا رہے گا؟"

"نہیں......! بالکل نہیں......! مجھے اس کے مکمل ہونے کا اتنا ہی یقین ہے، جتنا کہ میں اور تم اس وقت سامنے بیٹھے ہیں اور درویش بابا ہماری باتیں سن رہے ہیں۔ کیوں درویش بابا۔"

"جی فقیر سائیں......! ایسا ہی ہے۔ تم حوصلہ مت ہارو احمد بخش......! دیکھو کیا ہونے والا ہے۔ اس کا انتظار کرو۔" درویش بابا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلانے لگا جیسے ساری سمجھ آگئی ہو۔ احمد بخش بے چارہ بھی کیا سمجھتا کہ قدرت کے فیصلے کیا ہوتے ہیں۔ رات کے اس پہر روہی کے وسیع صحرا میں موجود ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر چلا گیا تو یہ دونوں اپنے اپنے معمولات میں کھو گئے۔ جیسے یہی ان کی مزدوری ہو۔

☆☆☆

مقصدیت نہ صرف انسان کو توانا کر دیتی ہے بلکہ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی بیدار کر دیتی ہے۔ منزل چاہے ان دیکھی ہو لیکن جب منزل کا تعین کر کے اس کی راہ پر گامزن ہوا جاتا ہے تو پھر زادِ راہ کی سمجھ بھی آجاتی ہے اور راستوں کی رکاوٹ بھی خود بخود دور کرتا آجاتا ہے۔ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو شے چاہیے ہوتی ہے وہ خلوص ہوتا ہے یہ عنقا ہو تو پھر ہر کوشش بے مقصد ہو جاتی ہے۔ جب تک فرزانہ خاں کے پاس کوئی مقصد نہیں تھا، اس کی زندگی کا محور ایسی کاوشیں تھیں جن کا حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن جونہی اس نے اپنے لئے مقصدیت کو چنا، اسے اپنی تمام تر کاوشوں اور کوششوں میں اک زندگی دکھائی دینے لگی۔ فرزانہ خاں کی اک سب سے اچھی عادت یہی تھی کہ اسے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ مگر مقصد کے بغیر مطالعہ کی اہمیت کا بھی اسے اندازہ نہیں تھا۔ جب سے اس نے اپنی پرخلوص کوششوں کا آغاز کیا ہوتا۔ تب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ مطالعہ میں صرف کیا گیا وقت، کتنا بارآور ہو گیا ہے۔ اس کا ذہن بنجر نہیں تھا، علمیت نے اسے بہت زرخیز بنا دیا ہوا تھا۔ مسائل کے حل میں اسے مشکل نہیں ہوتی تھی اور نئی راہوں کی تلاش اس کے لئے بہت آسان ہو رہی تھی۔

اس صبح جب وہ اپنے آفس میں آئی تو اس کا مزاج خاصا خوشگوار تھا۔ پچھلی شام اسے معلوم ہو گیا تھا کہ روہی جانے والی ٹیم واپس آگئی ہے اور صبح وہ اپنی رپورٹ دے گی۔ اس دن

اسے کچھ اہم فیصلے کرنا تھے۔ وہ اپنے طور پر بہت کچھ سوچ چکی تھی۔ لیکن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لئے اسے بہر حال ان لوگوں کی بات تو سننا تھی جو سروے پر نکلے ہوئے تھے۔

اس وقت وہ اسی ہال میں بیٹھے ہوئے تھے جو اس طرح کی میٹنگ کے لئے مخصوص تھا رسمی سی گفتگو جاری تھی۔ وہ لوگ سروے کے دوران ہونے والے چھوٹے موٹے واقعات بیان کر رہے تھے۔ تب فرزانہ خاں نے کہا۔

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ وہ ٹیم جو روہی گئی تھی۔ انہیں آپ موقع دیں کہ وہ ہمیں اپنے تاثرات اور مشاہدات بتا سکیں۔“

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ سب خاموش ہو گئے اور ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگے جو روہی گئے تھے۔ اس ٹیم کا ہیڈ حامد بہت سمجھدار نوجوان تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے نوٹس سیدھے کیے اور بولا۔

”ہم شہر میں رہنے والے بہت ساری آسائشیں اور سہولیات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ لیکن ہمیں احساس نہیں ہے کہ ہمیں کس قدر نعمتیں میسر ہیں۔ شہر سے تھوڑی دور صحرائی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں بھی زندگی ہے، لیکن بہت کٹھن ہے۔ یوں کہیں کہ زندگی وہاں پر سسک رہی ہے۔ میں یہ بات ان معنوں میں نہیں کہہ رہا کہ انہیں شہری سہولتیں میسر نہیں، بلکہ وہ بنیادی انسانی حقوق، جو انہیں حاصل ہونا چاہیے تھے وہ نہیں ہیں۔“

”آپ کے خیال میں وہاں پر سب سے اہم ترین مسئلہ کیا ہے۔“ فرزانہ نے پوچھا

”وہاں سب سے بڑا مسئلہ جہالت کا ہے۔ بحث اس سے نہیں کہ ایسا کیوں ہے، مدعا یہ ہے کہ ایسا حقیقت ہے اور جہالت کتنی بڑی انسانی تذلیل ہے یہ آپ بخوبی جانتی ہیں۔“

”کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ جہالت کیوں ہے؟“ فرزانہ نے پوچھا تو ایک لڑکی نے کہا۔

”مسٹر حامد نے اگر یہ کہا ہے کہ بحث اس سے نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک لمبی بحث ہوگی میڈم۔ اس کے کئی سارے آپشن ہیں۔ وجوہات ہیں ان کے بارے میں گفتگو کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہالت سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں وہ سب وہاں موجود ہیں۔ سب سے بڑی تذلیل وہاں عورت کی ہے۔ اسے حقوق تو کیا ملنے ہیں، وہاں اس کی حیثیت کا ہی ادارک نہیں کیا جاتا۔ ایک جانور اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ فرق کیسے واضح ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے علم کی بدولت۔ ان لوگوں کو علم ہوگا تو ہی اس کی اہمیت کا احساس کریں گے۔“

”تو آپ کے خیال میں کیا ہم وہاں کوئی اپنی سروسز دے سکتے ہیں؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”وہاں ہمارے لئے بہت زیادہ سپیس ہے۔ لیکن وہاں پر ہماری خدمات بزنس کی بنیاد پر نہیں ہوں گی۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کو شعور دینا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سمجھیں، ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی۔ پھر اس کے بعد سوچا جا سکتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”مسٹر حامد......! وہ لوگ آخر شہر کا رخ کیوں نہیں کر لیتے۔“ ایک لڑکی نے سوال کیا تو حامد مسکرا دیا اور پھر دھیرے سے بولا۔

”یہ سوال تو ایسا ہی ہے نا کہ روٹی نہیں ملتی ہے تو کیک کھالیں۔ وہ وہاں پرکھوں سے رہ رہے ہیں ان کا لائف سٹائل ہی یہی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنا لائف سٹائل بدل دیں اگر انہیں شعور آ جائے۔ شاید میں اپنا مدعا آپ پر واضح نہیں کر سکا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے انہیں احساس دلایا جائے کہ انسان کیا ہے، انسانیت کیا ہے اور سب سے بڑھ کر احترام انسانیت کیا ہوتا ہے۔ خدانخواستہ وہ وحشی نہیں ہیں۔ مگر وہ ابھی تک صدیوں پرانے دور میں رہ رہے ہیں۔“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسٹر حامد کہ پہلے ان کے لئے سکول کھولے جائیں۔ انہیں تعلیم یافتہ بنایا جائے اور پھر اس کے بعد بزنس کی بنیاد پر سروسز کا آغاز کیا جائے۔“

”بالکل میڈم......! اگر چہ یہ کام حکومت کا ہے، وہاں پر کچھ حکومتی سکول بھی ہیں لیکن ان پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔“ حامد نے کہا تو ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔

”اس کے لئے تو بہت بڑے بجٹ کی ضرورت ہوگی۔ انوسٹمنٹ کا دورانیہ بہت طویل ہوگا۔ ایسے وقت میں کہ جب ہم اپنے کام کا آغاز کر رہے ہیں یہ ممکن نہیں ہوگا۔ جہاں حکومت کچھ نہیں کر پا رہی وہاں ایک نوزائیدہ فلاحی تنظیم کیا کر پائے گی۔“

”آپ نے ٹھیک کہا لیکن وہاں پر ایک ایسی مثال بھی ہے کہ ایک فرد واحد کسی صلے کے بغیر ایک مدرسہ تعمیر کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس کی راہ میں رکاوٹ وہی لوگ ہیں جن کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے لیکن وہ حوصلہ مند ہے اور کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں خود اس سے مل کر آیا ہوں۔ ہم تو پھر ایک فلاحی تنظیم ہیں۔ اگر وہاں پیسہ نہیں لگا سکتے تو کم از کم حکومت کو تو اس کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی سب سے بڑی مدد ہوگی۔“ حامد نے جذباتی انداز میں کہا تو فرزانہ چونک گئی۔ تب اس نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”جس شخص کا تم ذکر کر رہے ہو وہ یہ کوشش کہاں پر کر رہا ہے؟“

”روہی میں ایک جگہ کچی بستی ہے وہاں پر۔ المیہ یہ ہے کہ چند دن پہلے تک اس کی

مدد جو شخص کر رہا تھا وہ قتل ہو گیا ہے۔ اب وہاں پر کام رکا پڑا ہے۔ میرے خیال میں اگر وہاں کے لوگوں کو شعور ہوتا کہ یہ ان کے مفاد میں ہے تو وہ مدد کرتے لیکن سب سے بڑی رکاوٹ یہی لاعلمی ہے۔''

''سوال یہ ہے مسٹر حامد کہ جو شخص وہاں پر کوشش کر رہا ہے کیا وہ وہاں کا رہائشی ہے، اسے یہ شعور کیسے آیا۔'' فرزانہ نے تجسس سے پوچھا۔

''میڈم......! وہ وہاں کا باشندہ نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ مگر وہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ کسی بزرگ کی وصیت پوری کرنا چاہتا ہے۔ درویش منش انسان ہے وہ اور فقیر سائیں کے نام سے مشہور ہے۔'' حامد نے تفصیل بتائی تو نہ جانے کیوں فرزانہ کو علی یاد آ گیا۔ دل ایک بار زور سے دھڑکا تھا جس کی لرزش کتنی دیر تک اس کے من میں رہی تھی۔ وہ لوگ آپس میں بحث کرتے چلے جا رہے تھے۔ جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ تب اچانک اس نے کہا۔

''مسٹر حامد......! جس طرح کہ آپ نے کہا کہ وہ درویش منش آدمی ہے۔ تو کیا وہ ہماری مدد قبول کرے گا۔''

''میرے خیال میں یقیناً وہ ہماری مدد قبول کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی اپنا ذاتی پراجیکٹ لے کر نہیں بیٹھا۔ ہم اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو ہمیں روہی کے اس علاقے میں ایک مرکز مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے......! آپ جس قدر ممکن ہو وہاں جائیں۔ یہ سب طے کریں اور انہیں جتنی مدد کی ضرورت ہے انہیں دیں۔ وہاں پر وہ مدرسہ بنا چاہیے اور جدید انداز میں بنا چاہیے۔ جدید انداز سے میری مراد عمارت کی چاہے شان و شوکت ویسی نہ ہو لیکن وہاں پر جو پڑھایا جائے وہ انہیں باشعور بنانے میں مدد دے۔''

''کیا اس سے ہم حکومتی حلقوں سے مدد لے سکتے ہیں۔'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ آپ اسے ایک پراجیکٹ کے طور پر لیں۔ اس پراجیکٹ کو بنائیں۔ ان لوگوں کو ہماری زیادہ ضرورت ہے مسٹر حامد آپ اس پراجیکٹ کو دیکھیں گے اور مجھ سے رابطہ رکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے میڈم......! میں ایک دو دن میں آپ کو ساری تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔'' حامد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وہ میٹنگ ختم کرنے کے بعد اپنے آفس میں چلی گئی تھی۔ نجانے کیوں روہی کے

حوالے سے اسے علی یاد آ گیا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ جو پراجیکٹ کرنے جا رہی ہے اس میں اس کی فلاحی تنظیم کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہوگا، یہی باتیں اسے سننے کو بھی ملیں گی کہ وہ غلط کر رہی ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے ہٹ کر، سارے فائدے نقصان ایک طرف تھے کہ اس نے اس پراجیکٹ کو کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''کہیں علی کے حوالے سے کوئی کمزور لمحہ تو نہیں آ گیا جس نے تمہیں ایسا احمقانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔'' اس کے دماغ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس کے دل نے کمزور سی مزاحمت کی۔

''تو پھر اس کام کے لئے تمہارے پاس آخر مضبوط جواز کیا ہے۔'' دماغ نے پھر پوچھا۔

''وہ انسان جو وہاں پر بس رہے ہیں۔ ان کے لئے بھی تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ کون کرے گا ان کے لئے۔'' اس نے ایک مضبوط دلیل دی۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے علی کو اس روہی کے صحرا میں گنوایا ہے۔ تم نے ہی تو اسے وہاں پھنکوایا تھا، کیا اس کا ازالہ کرنا چاہ رہی ہو۔'' دماغ نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو اس کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا۔ کیا واقعی جو وہ غلطی کر چکی ہے، اس کے ازالے کے لئے ایسا کر رہی ہے۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے جیسے وہ خلا میں ہو۔ ہر طرف سناٹا تھا، پھر دھیرے دھیرے اسے اپنے اردگرد کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تب اس نے صدق دل سے کہا۔

''ہاں میری غلطی تھی کہ میں نے علی کو اس صحرا میں گنوایا تھا لیکن مجھے میرے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ مجھے اسی صحرا میں سے میرا علی مجھے واپس کرے گا۔ میرا کوئی تعلق صحرا سے ہوگا تو ہی بات بنے گی۔'' فرزانہ کے دل نے جیسے بغاوت کر دی۔ اس نے پوری قوت سے اپنی دلیل دی تو دماغ خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے اب کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر پرسکون ہو گئی۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ لیکن سورج نے اپنی آب و تاب نہیں چھوڑی تھی مہرو اس وقت عصر پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ گامن تھوڑی دیر پہلے گھر آیا تھا۔ اس نے جو سارا دن گھاس پھوس اکٹھی کی تھی، وہ جانوروں کو ڈال کر ایک شکستہ چارپائی پر آرام کر رہا تھا۔ جنداں اس وقت شام کے کھانے کے لئے چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کبھی کبھار کوئی جانور بولتا تو زندگی کا احساس ہوتا۔ کئی دنوں سے رب نواز گھر نہیں آیا تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ پہلے بھی وہ کئی کئی دن تک گھر نہیں آتا تھا۔ اور پھر جب سے وہ

سیدن شاہ کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد تو اس کے آنے جانے کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی تھی۔ وہ کب گھر آتا اور کب چلا جاتا تھا اس بارے احساس ہی نہیں تھا۔ گامن کبھی کبھی اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا کہ رب نواز نے تو اس کا سہارا بننا تھا، ان بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنی جان کہاں ہے کہ ان جانوروں کے ساتھ پورا اتر سکے جو ان کا ذریعہ معاش ہے۔ مگر اس نے سہارا کیا بننا تھا۔ ہر وقت کھو جانے کا دکھ اس نے دے دیا تھا۔ نجانے کب پولیس آئے اور اسے لے جائے۔ اس پر مہرو کا ایک نیا روگ ان کی جان کو آ گیا تھا۔ وہ پاگل پن پر اتر آئی تھی۔ ساری بستی اسے پاگل کہتی تھی لیکن جنداں کا دل نہیں مانتا تھا۔ وہ نماز پڑھتی اور قرآن پاک کی تلاوت کرتی اور اس کے لئے وہ اپنی پاکیزگی کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ بعض اوقات وہ بڑی اچھی باتیں کرتی، کئی دفعہ تو اس کی باتوں کی سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی خود چاہتے تھے کہ اس کی شادی بھیرے سے ہو جاتی تو کم از کم یہ بوجھ تو ہلکا ہو جاتا۔ اب اس پاگل لڑکی کو کس نے بیاہنے آنا تھا۔ اولاد کے دکھ نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر کے رکھ دیا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ یہی سوچتے رہتے لیکن اس مسئلے کا حل کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

مہرو تلاوت کر چکی تو اس نے قرآن پاک کو جزدان میں رکھا اور صحن کے کونے میں پڑا ہوا گھڑا اٹھا لیا۔ یہی اس کا معمول تھا۔ وہ نئے کھدے ہوئے کنویں تک جاتی، وہاں سے پانی بھرتی اور واپس آ جاتی۔ کبھی دل کیا تو علی سے بات کر لی ورنہ وہ خاموشی سے واپس آ جاتی۔ اس دن بھی پانی بھرنے کے لئے جانے والی تھی کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا اور پیراں دتہ اندر آ گیا۔ گامن اسے دیکھتے ہی چارپائی پر سے اٹھ بیٹھا۔

"سلام چاچا گامن......!"

"وعلیکم اسلام......! کیسے آئے ہو پتر......!" گامن نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو پیراں دتہ نے ایک نگاہ مہرو پر ڈالی۔ وہ پانی بھرنے کے لئے جانے کو تیار کھڑی تھی۔

"بتاتا ہوں چاچا گامن......! پہلے مہرو سے کہو کہ گھڑا یہیں رکھ دے اور بیٹھے یہیں پر۔"

"کیوں پتر......؟" گامن نے لرزتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتہ نہیں ہے کہ پیر سائیں کا حکم کیا تھا۔ جب تم اس کی شادی بھیرے سے نہیں کروا سکے تو تم خود کیوں نہیں لے کر گئے اسے حویلی۔"

"پیراں دتہ......! ہم کوشش تو کر رہے ہیں۔"

"تم نے کیا خاک کوشش کرنی تھی۔ تمہاری بیٹی نے خود انکار کر دیا تھا۔ تیرے بیٹے کو

پولیس سے بچایا اور پھر بھی تم پیر سائیں کے حکم کا انکار کرتے ہو۔"

"دیکھو......! یہ سمجھ دار ہوتی تو میں اسے حویلی چھوڑ آتا، یہ پاگل نمانی ہے، وہاں کوئی نقصان کرے گی۔"

"اس کا علاج تو حویلی میں ہو جائے گا۔ پیر سائیں کے حکم کے مطابق، ہم اسے لینے کے لئے آئے ہیں۔" اس نے انتہائی سختی سے کہتے ہوئے مہرو کو دیکھا جو بے حس سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہ پیراں دتہ نہ......! اس پاگل نمانی کو رہنے دے میرے پاس۔ یہ حویلی میں جا کر کیا کرے گی۔" گامن نے منت سماجت کرتے ہوئے مہرو کو روکنے کی کوشش کی۔

"دیکھ چاچا گامن......! میں تجھے سمجھا رہا ہوں۔ مہرو اگر پیر سائیں کی حویلی میں جائے گی تو تجھے وہ چھ ایکڑ زمین مل جائے گی۔ اس پر تیرے بیٹے رب نواز پر بھی پیر سائیں کا ہاتھ رہے گا۔ وہ تو تیرا بھلا سوچ رہے ہیں۔ وہ اپنے مریدین کا بھلا نہیں سوچیں گے تو اور کون سوچے گا۔ اور تم ہو کہ انکار کر رہے ہو۔ بولو کیا جواب ہے تمہارا۔"

"پیراں دتہ......! اس عمر میں چھ ایکڑ زمین لے کر میں نے کیا کرنا ہے۔ مجھ سے تو کوئی کام نہیں ہوتا۔ تو بس ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

"تو انکار کر یا اقرار......! ہمیں تو پیر سائیں کا حکم ماننا ہے۔ میں مہرو کو لے کر جا رہا ہوں۔ تم خود آ کر پیر سائیں سے بات کر لینا۔" پیراں دتے نے لاپرواہی سے کہا اور مہرو کی جانب بڑھا۔ تو وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"خبردار اگر مجھے ہاتھ لگایا تو......؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"تو چلو تم خود اپنے آپ میرے ساتھ دفع ہو جاؤ۔ میں کیوں تمہیں ہاتھ لگاؤں گا۔" پیراں دتے نے کمال ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"جب وہ جانا نہیں چاہتی تو تم کیوں لے کر جا رہے ہو۔" گامن نے سختی سے کہا۔

"چپ کر بڈھے......! ورنہ ہمیشہ کے لئے تیری آواز بند کر دوں گا۔" پیراں دتے نے غصے میں اونچی آواز سے کہا تو باہر موجود اس کے ساتھی جلدی سے اندر آ گئے۔ گامن خوف زدہ ہو گیا۔ جنداں بھی ایک طرف کھڑی کانپنے لگی۔

"خدا کے لئے ہم پر رحم کرو پیراں دتہ......! میری بیٹی کو نہ لے جاؤ۔ ہم تیری منت کرتے ہیں۔ یہ پاگل ہے۔ چھوڑ دو اسے۔ جنداں نے آخری کوشش کی۔ لیکن اس وقت تک

پیراں دتہ مہرو کی کلائی پکڑ چکا تھا۔اور پھر گھسیٹتے ہوئے باہر جانے لگا۔مہرو چیختی رہی، چلاتی رہی مگر اس کا دل ذرا نہ پسیجا۔مہرو کی چیخوں میں، گامن اور جنداں کی آہ و بکا بھی شامل تھی۔جس کا کوئی اثر پیراں دتہ پر نہ ہوا۔وہ مہرو کو گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر لے آیا۔جہاں کچی بستی کے کئی لوگ کھڑے تھے۔کسی میں ہمت نہ ہو سکی کہ وہ یہی پوچھ لے کہ وہ اسے یوں کیوں لے کر جا رہا ہے۔جیپ دروازے کے باہر کھڑی تھی۔اس نے مہرو کو اٹھایا اور جیپ میں پھینک دیا۔اب اس کی مزاحمت بے کار تھی۔مگر پھر بھی وہ تڑپتی اور مچلتی رہی۔جیپ سے باہر نکلنے کی کوشش میں وہ بے دم ہو چکی تھی۔تبھی پیراں دتے نے غراتے ہوئے کہا۔

”خاموش......! تجھے ہر حال میں حویلی جانا ہے۔یہی تیری سزا ہے۔“

”پیراں دتہ......! تجھ پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔بچ جا، چھوڑ دے مجھے۔“ مہرو نے انتہائی بے بسی سے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”میری بات مان جاتی تو سدا عیش کرتی، لیکن اب تجھے روز مرنا ہوگا اور روز جینا ہوگا۔ میری بات نہیں مانی ہے نا، اب تیری زندگی اجیرن کر دوں گا۔“ اس نے خباثت سے کہا۔اس وقت تک دوسرے بھی جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ڈرائیور نے جیپ بڑھا دی۔جو سیدھی حویلی جا رکی۔ اس دوران مہرو مچلتی رہی۔لیکن اس کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں آیا۔

چلو اترو......! پیراں دتہ نے مہرو سے کہا اور پھر خود ہی اس کا بازو پکڑ کر نیچے اتار لیا۔

پھر اس وقت پیراں دتہ خود حیران رہ گیا جب مہرو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور یوں ہو گئی جیسے اسے یہاں گھسیٹ کر نہیں اس کی اپنی مرضی سے لایا گیا ہے۔اس کے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ آ گئی تھی۔جیسے خیالوں ہی خیالوں میں اس نے بہت کچھ دیکھ سوچ لیا ہو۔پیراں دتہ کی حیرت ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے پوچھا۔

”کدھر جانا ہے؟“

”اب آئی ہے نا تمہیں عقل، چلو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔“ اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بڑھ گئی۔پیراں دتہ اس کے آگے آگے تھا۔کئی راہداریاں عبور کر کے وہ حویلی کے ایک الگ سے حصے کی طرف آ گئے۔یہاں کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔وہاں پر کئی لڑکیاں تھیں اور ان کے درمیان میں ایک بوڑھی سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔پیراں دتے نے مہرو کو دھکا دیتے اس کے سامنے کیا اور بولا۔

”داراں مائی......! یہ مہرو ہے، یہ یہاں ایسے ہی نہیں لائی گئی۔یہ وہ لڑکی ہے جس نے

پیر سائیں کے حکم سے انکار کیا ہے۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ یہ پاگل ہو چکی ہے۔تو پھر اس......“

”کوئی پاگل نہیں ہے۔اس نے ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔یار کی قبر پر چراغ جلاتا یا در ہتا ہے اسے۔تیرے پاس اس لئے لایا ہوں کہ اس کا سارا پاگل پن ختم کرو۔“ پیراں دتے نے غصے میں کہا اور پھر رک کر بولا۔”دیکھ نہیں رہی ہو داراں مائی......! اس کا بن ٹھن کر رہنا، اس کا بدن دیکھو، اس کی جوانی دیکھو......! خود کو سجا سنوار کے رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ پاگل ہے۔اسے سمجھاؤ کہ اس نے یہیں رہنا ہے اور اس کی......“ پیراں دتے کی بات کاٹتے ہوئے مہرو نے کہا۔

”اب بھونکتے ہی رہو گے یا یہاں سے دفع بھی ہو جاؤ گے۔بہت بھونک لیا تم نے، جاؤ اب دفع ہو جاؤ......“ اس نے کہا تو وہاں پر موجود ہر لڑکی چونک گئی۔داراں مائی نے بھی غور سے دیکھا۔

”دیکھا......دیکھا داراں مائی......! اس کا دماغ دیکھو، جوانی کا جوش دیکھو۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”میں نے کہا نا، بھونکنا بند کرو۔میں دیکھتی ہوں کہ وہ ہوتا ہے جو تم لوگ چاہتے ہو، یا پھر وہ جو میرا اللہ چاہتا ہے۔“ مہرو نے کچھ اس انداز سے کہا کہ پیراں دتہ کو اس سے پہلی بار خوف محسوس ہوا۔اسے لگا جیسے اس نے مہرو کو یہاں لا کر غلطی کی ہے۔پھر اس سے وہاں کھڑا نہیں رہا گیا۔وہ چلا گیا تو داراں مائی نے اس سے کہا۔

”بیٹھو مہرو......!“

”داراں مائی......! میں وہ نہیں ہوں جو یہ ہیں۔“ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔”تم چاہو تو کوشش کر سکتی ہو۔لیکن ہوگا کچھ نہیں یہ میرا یقین ہے۔“ مہرو نے کھڑے کھڑے کہا تو داراں مائی بولی۔

”جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔میری طرف سے تم ابھی واپس جا سکتی ہو۔مگر یہاں حویلی میں اپنی کوئی مرضی نہیں ہے۔اُن کی اجازت کے بغیر جاؤ گی تو خودکشی ہوگی۔تم وہی کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔“

مہرو چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔پھر اس نے یوں سر جھٹکا جیسے کوئی حتمی فیصلہ کر چکی ہو۔وہ قدرے مسکرائی اور پھر داراں مائی سے بولی۔

”وضو کے لئے پانی اور نماز پڑھنے کے لئے جائے نماز چاہیے۔“

''ابھی لو......!'' داراں مائی کی دوررس نگاہوں نے بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔ اس نے کسی لڑکی سے نہیں کہا بلکہ خود اٹھی اور وضو کے لئے پانی لینے چلی گئی۔ جبکہ مہروان لڑکیوں کے درمیان زمین پر بیٹھ چکی تھی۔ اس کا امتحان شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

مغرب ہو چکی تھی اور جنڈ کے درخت سے آگے بچھی صف پر علی، درویش بابا اور احمد بخش نماز پڑھ چکے تھے۔ ان تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ پیراں دتہ نے دن دھاڑے گامن کے گھر میں گھس کر مہرو کو اغواء کر لیا ہے۔ وہ تینوں افسردہ سے تھے کہ احمد بخش نے سوال کیا۔

''ایسا کب تک چلتا رہے گا علی بھائی۔''

اس پر علی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑے ہی تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سوال میں ہی تمہارا جواب ہے۔ احمد بخش ایسا اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک اس کچی بستی کے لوگ چاہیں گے۔ کسی میں غیرت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روک لیں۔ کیا سب کی عزت سانجھی نہیں ہوتی۔ یہ کچی بستی والے سب مل کر مزاحمت کرتے تو ان کی ہمت تھی کہ وہ یوں مہرو کو لے جاتے۔''

''یہی تو دکھ ہے، یہاں کی روایت ہے کہ پیر کے حکم کو خدا کا حکم مانا جاتا ہے۔ بظاہر یہ مریدوں پر پیر سائیں کی شفقت ہے کہ ان کی بیٹی کو اس نے خدمت کے لئے چن لیا ہے۔ اس کے بدلے وہ ڈھور ڈنگر، زمین کا ٹکڑا یا پھر کوئی اور شے عنایت کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ لوگ اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔'' احمد بخش نے انتہائی افسردگی سے کہا۔

''سنو...... یہ جو دین اسلام ہے نا، یہ بندوں پر بندوں کی حکومت کا قائل ہی نہیں ہے۔ اسلام کا مقصد، منشاء اور پیغام یہی ہے کہ وہ بندوں سے بندوں کی گردن چھڑا کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف راغب کرتا ہے۔ جبکہ یہاں کے انسان اپنی اپنی حکومتوں کو مضبوط کرنے کے لئے، بندوں کو غلام بنانے کے لئے نہ جانے کیسے کیسے ہتھکنڈے آزماتے ہیں۔'' علی نے دکھتے ہوئے لہجے میں کہا تو درویش بابا نے کہا۔

''اصل میں اللہ پاک نے جو انسان کو اختیار دیا ہے نا، اس کے استعمال کے وقت انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اس اختیار کا حساب کتاب بھی دینا ہے۔ اور اللہ اسی اختیار سے انسان کو آزماتا ہے۔''

''وقت آ گیا ہے درویش بابا، جب ہمارے جیسے لوگ ایک حد میں رہ کر تحمل اور

برداشت کو اپنی جان کا حصہ بناتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں......'' علی نے کہنا چاہا لیکن بابا تیزی سے بولا۔

''نہ...... فقیر سائیں نہ...... ابھی نہیں......! اور پھر ہمارا یہ راستہ ہی نہیں ہے۔ ہمارا ہتھیار تیر، تلوار یا گن نہیں ہے۔ مومن کا ہتھیار تو دعا ہوتی ہے۔''

''لیکن ایک حد تک درویش بابا۔ ایک حد تک......! جہاد بھی تو مومن کی معراج ہے۔''

''مگر اس وقت جب آپ اپنی قوت رکھتے ہو۔ تحمل، صبر اور برداشت ایسے ہی مومنوں کے لئے ہوتے ہیں۔ جہاد سے قطعاً انکار نہیں۔ جو منکر ہے وہ کافر ہے۔ لیکن اس کے لئے اللہ کی تائید اتنی ہی ضروری ہے، جس قدر شدت شیطانی قوتوں میں ہوتی ہے۔ ابھی آپ خود ہی کہہ رہے تھے فقیر سائیں کہ کچی بستی والے مزاحمت کیوں نہیں کرتے، کہا ہے نا آپ نے۔''

''کہا ہے۔'' علی نے دھیرے سے کہا۔

''وہ مزاحمت کیوں نہیں کر رہے، ایسا اس لئے ہے کہ انہیں مزاحمت کا شعور نہیں۔ وہ پیر کے حکم کو خدا کا حکم تصور کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں معلوم ہو گا کہ دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق کس حد تک شیخ کا حکم مانا جاتا ہے، کہاں تک والدین کا اور کس وقت اللہ کا حکم سارے احکامات پر بھاری ہوتا ہے۔ انہیں جب نبی رحمت ﷺ کا طریقہ معلوم ہو گا تو انہیں شعور ہو گا۔ جہالت سب سے بڑی محکومی ہے۔ اور وہ بندے جو بندوں پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ جہالت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے بتائیں فقیر سائیں......! انہیں شعور کن لوگوں نے دینا ہے۔ اس طرح کی محکومی سے بندوں کو کن لوگوں نے نکالنا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں درویش بابا۔'' علی نے قدرے تحمل سے پرسوچ لہجے میں کہا پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔ ''ہر انسان کا اس دنیا میں ایک خاص کردار ہے۔ اسے اختیار دے کر آزمایا جاتا ہے کہ وہ اپنا کردار بخوبی نبھاتا ہے یا نہیں۔ اب اصل چیز یہی ہے کہ وہ انسان اس دنیا کے لئے اپنے کردار کو پہچانے کیا اس کا کردار اللہ رب العزت کے سامنے شرمندگی کا باعث تو نہیں بنے گا۔''

''اسی لئے عرض کیا فقیر سائیں کہ ہم دعا کریں۔ اللہ سے مدد مانگیں، اپنی کسی غلطی اور کوتاہی کو تلاش کر کے اللہ سے معافی مانگیں۔ اور محبوب خدا ﷺ کے واسطے اور وسیلے سے توفیق مانگیں کہ اللہ ہم سے کوئی اچھا کام لے لے۔ ہمیں کسی مقصد کے لئے قبول کر لے۔ جس کی وجہ سے ہماری نجات ہو جائے۔''

"درویش بابا......! کیا آپ سمجھتے نہیں ہیں کہ ہمارا یہاں ہونا کس مقصد کے لئے ہے۔ اب ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے، ہمیں ظلم کے خلاف بولنا ہے، عمل چاہیے۔ واعظ اور تبلیغ کا اثر کتنا ہوتا ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ خوف کے سائے میں سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ یہ خوف چاہے معیشت کا ہو، یا تحفظ کا۔"

"آپ ہمیں ثابت قدم پائیں گے فقیر سائیں۔ آپ حکم دیں۔" درویش بابا نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"کھیل تماشا بہت ہو چکا ہے۔ اب عمل کا وقت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے سوچا اور احمد بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ احمد بخش شہر جاؤ......! وہاں ڈی ایس پی رفاقت باجوہ ہوگا۔ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اسے مل کر بتاؤ کہ مہرو کو سیدن شاہ نے اغواء کرلیا ہے۔"

"جیسے حکم فقیر سائیں۔" احمد بخش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ذہن میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اگر وہ اونٹ کے ذریعے شہر تک گیا بھی تو کتنا وقت لگے گا۔

"اور درویش بابا......! آؤ، مہرو کے ماں باپ کے پاس چلیں، انہیں ڈھارس دیں کہ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ شاید کچی بستی کے کسی فرد کے دماغ میں ہماری بات سما جائے کہ مزاحمت بھی کی جاتی ہے۔" علی نے اٹھتے ہوئے کہا تو درویش بابا بھی اٹھ گیا۔ ان دونوں کا رخ کچی بستی کی طرف تھا، جبکہ احمد بخش ان سے پہلے چل دیا تھا۔

☆☆☆

سیدن شاہ اپنے کمرہ خاص میں تھا۔ اس کے ذہن میں لاشعوری طور پر بے چینی تھی۔ وہ بار بار فون کی طرف دیکھ رہا تھا، پچھلی رات سے لیکر آج شام تک اس نے اپنے مخصوص لوگوں سے رابطے کیے تھے۔ لیکن ابھی تک پلٹ کر کسی طرف سے بھی کوئی اشارہ نہیں آیا تھا۔ جس سے صورت حال واضح ہو اور وہ منظر کو سمجھ سکے۔ انسان کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ ان دیکھی چیزوں سے نہ صرف خوف کھاتا ہے بلکہ مغلوب بھی ہو جاتا ہے۔ یہ زعم خود وہ چاہیے خود کو جتنا مرضی طاقتور خیال کر رہا ہو۔ یہی صورت حال اس وقت سیدن شاہ کی تھی۔ اسے اپنے ہی خیالات ستا رہے تھے۔ اس کا دماغ لمحوں میں منطقی انجام تک پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن اس وقت اس کا ذہن ماؤف تھا، اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اندھیرے میں وہ کس سمت جائے۔ یہی نہ ہو کہ وہ کسی کھائی میں گر جائے۔ اسے جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے اپنا دھیان مہرو کی جانب لگا دیا جو اس شام اس کے ذاتی حرم میں داخل کردی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے گرم گرم کھانے کا عادی نہیں تھا۔

اس معاملے میں تو خصوصاً وہ سکون پسند کرتا تھا۔ مہرو اس کے سامنے لائی گئی تو وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے پہلے کبھی مہرو کو نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہیں نگاہ بھی پڑی ہو تو وہ اسے دیکھ پایا ہو لیکن اس وقت جبکہ وہ اس کے سامنے تھی، اسے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے کھلے صحرا کی کوئی ہرنی اس کے سامنے موجود ہو جس نے پہلے کبھی کوئی دیوار نہیں دیکھی ہو۔ وہ کسی اجنبی کی طرح اس کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی جبکہ سیدن شاہ اس کے حسن اور جسم کے سارے رنگ نگاہوں میں تول رہا تھا۔ اسے سانول کا قربان ہو جانا بہت معمولی لگا تھا۔ اس کے لئے تو باقاعدہ جنگ جیتی جاسکتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت حسن دیکھا تھا، لیکن نجانے اس لاپرواحسن میں کیا کشش تھی کہ ایک لمحے کو سیدن شاہ بے تاب ہو گیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سمجھ گیا کہ اگر اس نے بے صبری دکھائی تو پھل کا وہ ذائقہ نہیں چکھ پائے گا جس کی اسے امید ہو چلی تھی۔ اور پھر دسترس میں آئی ہوئی شے کی اتنی اہمیت بھی نہیں رہتی۔

"تو یہ ہے مہرو......!" سیدن شاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے داراں مائی سے کہا۔

"جی پیر سائیں......! آج ہی پیراں دتہ اسے مغرب کے وقت چھوڑ کر گیا ہے۔" وہ بولی۔

"تنگ تو نہیں کیا اس نے۔" سیدن شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں داراں مائی سے پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں پیر سائیں......! بہت جلد یہاں کے ماحول کو سمجھ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، لے جاؤ اسے، بہت جلد میں اسے اپنی خدمت کے لئے بلاؤں گا، یہ تمہاری ذمہ داری ہے اب۔" سیدن شاہ نے کہا تو وہ اسے لے کر واپس چلی گئی تھی۔ لیکن سیدن شاہ بہت دیر تک اس کے حسن میں کھویا رہا تھا۔ اب جبکہ بے چینی بہت بڑھ گئی تھی تو اس کے خیال نے پھر سے اسے خوشگوار کر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ ایک خوش کن تصور انسان کی کیفیت کو کس قدر بدل دیتا ہے۔ تبھی فون کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس نے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

"ہیلو پیر سائیں......!" دوسری طرف سے شہر کے ایک معزز ترین شخص کی آواز سنائی دی تو سیدن شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"آج آپ نے بہت انتظار کروایا ملک صاحب۔" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"سائیں، کوئی بات ہاتھ لگتی تو میں آپ کو فون کرتا، میں اس طرف مصروف تھا۔"

"تو پھر کیا صورت حال ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا، لہجہ میں بے تابی تھی۔ تبھی

دوسری طرف سے ملک صاحب نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

”صورت حال تو اچھی نہیں ہے۔ لیکن ایک طرح سے ہم اسے اچھی بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے تجسس کو دباتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔

”آپ کے بندے وہیں موقع پر ہی پکڑے گئے تھے۔ وہیں خان محمد کے لوگوں نے ہی انہیں پکڑ لیا تھا۔“

”اب کہاں ہیں؟“

”رفاقت باجوہ کے پاس۔“

”ہائیں......! وہ کیسے، اس کے پاس کیسے چلے گئے۔“

”سیدھی سی بات ہے شاہ جی، وہ لوگ اسے وہاں اس لئے لے گئے تھے کہ خان محمد سے رفاقت باجوہ کی دوستی تھی۔ اور وہ دونوں ہی امین خان کے خاص بندے تھے۔ رفاقت باجوہ نے اپنی طرف سے عقل مندی یہ کی ہے کہ انہیں پکڑ کر کسی نہ معلوم مقام پر رکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے وہ اُن سے ہی اگلوانا چاہتا ہے کہ وہ آپ کا نام لے دیں۔“

”پھر......!“ سیدن شاہ نے دھیرے سے کہا۔

”شاہ جی......! یہ ساری صورت حال شاید مجھے معلوم نہ ہوتی لیکن معلوم اس طرح ہوئی ہے کہ رفاقت باجوہ آپ کے خلاف ڈی آئی جی سے براہ راست احکامات لینا چاہتا ہے۔ اور امین خان اس کا پورا ساتھ دے رہا، بلکہ ساتھ کیا دے رہا ہے اصل میں وہی سب کچھ کر رہا ہے۔“

ملک صاحب نے سانس لیا تو سیدن شاہ نے کہا۔

”ہوں......! تو اس کا مطلب ہے یہ سارا کھیل امین خاں کھیل رہا ہے۔“

”جی پیر سائیں، وہی کھیل رہا ہے۔ لیکن اچھی بات اب تک یہ ہوئی ہے کہ آپ کے بندے ٹھیک نکلے ہیں۔ وہ یہ تو اقرار کر رہے ہیں کہ خان محمد کو انہوں نے ہی قتل کیا ہے لیکن وہ یہ ماننے سے انکاری ہیں کہ اس قتل سے آپ کا کوئی تعلق ہے۔“

”ہوں......!“ سیدن شاہ نے ہنکارا ابھرا۔

”اب صورت حال یہ ہے شاہ جی کہ ڈی آئی جی نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ رفاقت باجوہ کی ساری بات اس وقت مان لے گا اگر وہ بندے اس کے سامنے اقرار کر دیں کہ اس قتل کا تعلق

سیدن شاہ سے ہے۔ اگر وہ اقراری ہو جاتے ہیں تو رفاقت باجوہ کو من پسند احکامات مل جائیں گے جو شاید اس نے ٹائپ بھی کروا لئے ہوئے ہیں۔“

”ڈی آئی جی نے کوئی وقت دیا ہے اسے؟“ سیدن شاہ نے پوچھا۔

”صرف ایک دن اور دیا ہے۔ آپ کا نام آئے یا نہ آئے۔ باجوہ ان بندوں کو چھوڑنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ ان کا کیس تیار ہے وہ کل گرفتاری ڈالے گا اور معاملہ ختم۔ ایک آپشن پھر بھی رہ جائے گا جس کی وجہ سے وہ آپ کو عدالت میں گھسیٹ سکتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا وہ میری گاڑی ہوگی۔“

”ہاں......! میرا خیال ہے، وہی آپشن ہے اس کے پاس۔“

”خیر......! اس کا تو میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ چوری کی ایف آئی آر درج کروادی تھی۔“

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ خیر......! اب میرے لئے کیا حکم ہے۔“

”ملک صاحب......! میں ہمیشہ آپ کے کام آیا ہوں۔ کبھی آپ کو کوئی کام نہیں کہا۔“

”جی، میں جانتا ہوں اور ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم تو کریں یہ دیکھیں جو میں نے آپ کو صورت حال بتائی ہے کیا اتنی جلدی اور اتنی اندر کی خبر کوئی اور لا سکتا ہے۔ یہ تو اپنے پرانے تعلقات اور اثر ورسوخ کام آ گئے۔ ورنہ اس معاملے کی خبر تو بہت کم لوگوں کو ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب......! اب آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔“

”یہی کہ آپ خاموش ہو جائیں۔ بندے جیسے ہی عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ انہیں پورا اسپورٹ دیں۔ سامنے آئے بغیر۔ ممکن ہے ان کے بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے۔“

”یہ بڑا لمبا پراسس ہے ملک صاحب......! کوئی ایسا کام کریں کہ معاملہ یہیں پر ختم ہو جائے۔ جو جتنا خوش ہوتا ہے اسے اتنا کر دیں۔“

”اتنا سر درد لینے کی کیا ضرورت ہے شاہ جی آپ کے پاس بندوں کی کمی ہے۔“

”نہیں ملک صاحب......! دراصل سالانہ عرس میں فقط ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ بچے بھی برطانیہ سے آ رہے ہیں۔ وہ دو ہفتے پہلے آ جائیں گے۔ پھر عرس کے بعد مجھے ان کے ساتھ ہی جانا ہے۔“

”میں ہوں نا، سب دیکھ لوں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب......! لیکن اپنے ہی بندے نہ نکل سکیں۔ یہ تو بہت بری

بات ہے۔ خیر.....! میں صبح شہر آتا ہوں۔ وہیں بیٹھ کر تفصیلی بات کرتے ہیں۔ آپ بہر حال کوشش کریں۔"

"ٹھیک ہے آپ صبح آئیں۔ میرے خیال میں اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ ممکن ہے میں صبح کا ناشتہ ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ کروں۔ بہر حال آپ اطمینان سے آجائیے گا۔ میں کوئی اچھی خبر ہی آپ کو سناؤں گا۔" ملک صاحب نے کہا اور پھر چند رسمی جملوں کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

سیدن شاہ نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ اسے گمان نہیں تھا کہ معاملہ اس حد تک جا سکتا ہے۔ اور شاید جاتا بھی نہ اگر اس میں امین خان نہ ہوتا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ امین خان ہی اس کا روایتی حریف ہے اور اسے نیچا دکھانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تاہم وہ اس کی طرف سے ابھی تک غافل ہی تھا۔ سیدن شاہ نے اس کے ساتھ اپنا معاملہ فقط الیکشن تک ہی رکھا تھا، وہ ختم ہوئے تو کبھی امین خان کی راہ میں نہیں آیا تھا۔ اس وقت اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے امین خان پر نگاہ کیوں نہیں رکھی۔ اگر وہ دبا کر رکھا گیا ہوتا تو آج اس طرح کی صورت حال سے اس کا واسطہ ہی نہ پڑتا۔ اسے حیرت یہ ہو رہی تھی کہ امین خاں اس کے خلاف کس قدر محنت کر رہا تھا۔ ڈی ایس پی سطح کے بندے کو پالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر وہ رفاقت باجوہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتا ہے تو بلاشبہ اس نے اور بہت سارے معاملات کو بھی اپنے ہاتھ میں کیا ہوگا۔ اس نے کہاں کہاں گھات لگائی تھی۔ اس کا اندازہ سیدن شاہ کو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہی اس کی رات گزرتی چلی گئی۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ شہر سے باہر ویران ڈیرے پر مدقوق سا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی رات کے اندھیرے میں ہانپتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ جھینگر ہی اس سناٹے کو توڑنے کے لئے ہلکان ہو رہے تھے۔ ایسے میں ایک سفید رنگ کی کار اس ڈیرے پر آرکی تو کونے کھدروں میں چھپے ہوئے چوکیدار اپنی گنیں سیدھی کرتے ہوئے اُٹھ گئے۔ وہ پوری طرح چوکنا تھے اور پوری توجہ سے آنے والے پر نگاہ کیے ہوئے تھے۔ کار آتے ہی اس میں سے رفاقت باجوہ نکلا جو عام لباس میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی احمد بخش باہر آیا۔ اس دیکھتے ہی چوکیداروں نے سلام کیا اور ایک نے آگے بڑھ کر ڈیرے کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ رفاقت باجوہ اندر چلا گیا۔ تعفن کے بھبکے نے اس کا دماغ سُن کر دیا۔ ننگے فرش پر وہ تینوں پڑے ہوئے تھے۔

پتہ نہیں وہ مدہوش تھے یا سو رہے تھے۔ رفاقت باجوہ نے جاتے ہی رب نواز کے ٹھوکر ماری تو ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

"ک.....ک.....کون.....؟"

"تیرا باپ ہوں۔ اٹھ۔" اس نے سختی سے کہا۔ تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کی آواز سن کر سیدو اور ڈرائیور بھی اٹھ گئے۔ کمرے کے اندر جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں ان کا رنگ پیلا ہوتا ہوا واضح محسوس ہوا۔ وہ شاید ذہنی طور پر تشدد کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

"اس وقت رات کے ساڑھے تین ہو رہے ہیں۔ اور تم لوگوں کو پتہ ہے کہ میں کیوں آیا ہوں؟"

"رفاقت باجوہ کے لہجے میں ایسی غراہٹ تھی جس سے وہ خوف زدہ ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا تو اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ اب بھی اپنے باپ سیدن شاہ کا نام نہیں لو گے۔"

"ہم اگر نام لیتے ہیں تو صرف ہم ہی نہیں ہمارے بچے بھی مر جائیں گے۔" سیدو نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"یہ تو پہلے سوچنا تھا نا، تمہارا کیا خیال ہے، تم لوگ پھانسی سے بچ جاؤ گے۔ میں اگر تم لوگوں کی مار کر یہیں دبا دوں تو مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ مگر وہ بے غیرت بچ جائے گا جو اصل مجرم ہے۔"

"ہم مجبور ہیں مائی باپ، آپ صبح ہمیں عدالت میں پیش کر دیں۔ ہم خان محمد کا قتل قبول کر لیں گے۔"

"تم قبول کرو نہ کرو..... لیکن یہ رب نواز تو قبول کرے گا۔" رفاقت باجوہ کے لہجے میں طنز تھا۔

"یہ تمہاری بھول ہے ڈی ایس پی.....!" رب نواز نے کہا جو اب تک خود پر قابو پا چکا تھا۔

"اس کا نام نہیں لو گے نا، جس نے آج شام تیری بہن مہرو کو تیرے ہی گھر سے اٹھوا لیا ہے۔ پیراں دتہ اسے حویلی چھوڑ آیا ہے۔"

"نہیں، تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"اگر یہ سچ ہوا تو.....؟ خیر.....! یہ تو بعد کی بات ہے کہ تم کیا کرو گے، پہلے میں تصدیق کروا دوں۔" یہ کہہ کر اس نے احمد بخش کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آیا تو انہیں دیکھ کر ایک دفعہ تو

خوف زدہ ہو گیا۔ تشدد سے ان کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔

"جی" احمد بخش نے صرف اتنا کہا۔

"بتا......! اس رب نواز کو بتا کہ تو کیا خبر لے کر آیا ہے۔" رفاقت باجوہ نے کہا تو احمد بخش نے تمام روداد کہہ دی۔ جیسے جیسے وہ سنتا چلا جا رہا تھا، اس کی حالت بدلتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی احمد بخش نے بات ختم کی تو وہ چیخ اٹھا۔

"جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ پیر سائیں ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ایسا ہو گیا ہے رب نواز......!" رفاقت باجوہ نے دھیرے سے کہا۔ چند لمحے اس کی طرف سے ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ بس ساکت سا رہا تو باجوہ نے کہا۔ "ذرا تصور کرو رب نواز جس بہن کی عزت کے لئے تم نے سانول کا قتل کر دیا تھا۔ وہ سانول جو اسے اپنی جائز بیوی بنانا چاہتا تھا۔ تمہاری وہی بہن مہرو......! تیرے پیر سائیں کی سیج پر ہو گی۔ کیا وہاں تیری بہن کی عزت محفوظ رہے گی یا پھر کوئی گھر کا پیر لے کر آ جائے گی۔ بول......! کہاں مر گئی تیری غیرت وہ پیر اگر تیری بہن کے ساتھ کھیلے گا تو اس کی عزت خراب نہیں ہو گی۔"

"بس کرو...... بس......" رب نواز چیخ اٹھا۔ "اگر ایسا ہوا تو میں سیدن شاہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"چل میرے ساتھ طے کر۔" رفاقت باجوہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر میری بات سچ ہوئی تو تم سیدن شاہ کے خلاف عدالت میں بیان دے دو گے۔ پھر میں جانوں یا سیدن شاہ۔ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانا میرا کام ہے۔"

"رب نواز نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا۔ "مجھے قسم ہے میری بہن کی عزت کی، میں اپنے وعدے سے نہیں پھروں گا۔"

"ٹھیک ہے، کل صبح تیرا باپ آ کر تجھے بتا دے گا کہ تیری بہن کو حویلی پہنچا دیا گیا ہے۔" رفاقت باجوہ نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے کھڑے کھڑے دوسروں پر نگاہ دوڑائی تو خوف سے ان کے رنگ زرد ہو چکے تھے۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا اور واپس چلا گیا۔ چوکیداروں نے اس کمرے کا دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ جس کے اندر پڑا رب نواز تلملا رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت دوپہر ہو جانے والی تھی جب سیدن شاہ کی لگژری کار ملک امتیاز کی وسیع و عریض کوٹھی کے پورچ میں رکی۔ ملک امتیاز اس کا استقبال کرنے کے لئے پہلے ہی کاریڈور میں

کھڑا تھا۔ پرجوش مصافحے کے بعد وہ اسے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جبکہ سیدن شاہ کے ساتھ آئے دوسرے لوگوں کو گیسٹ ہاؤس بھجوا دیا گیا۔ ڈرائنگ روم میں وہ دونوں تنہا تھے۔ ان کے سامنے مشروبات کے ساتھ دیگر لوازمات سجا دیئے گئے۔

"جی ملک صاحب! اب تک کوئی پیش رفت ہوئی۔" سیدن شاہ نے پہلو بدلتے ہوئے بظاہر تحمل سے کہا۔

"شاہ جی......! میری سب سے بات ہو گئی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب تو پہلے ہی سے مہربانی کر رہے ہیں ورنہ اب تک سارا کھیل ہی ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔ انہوں نے آج شام تک کے لئے باجوہ کو وارننگ دے دی ہے یا تو بندے پیش کر کے احکامات لے لے یا پھر ان بندوں کی گرفتاری ڈالے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ آج شام تک بندوں کی گرفتاری ڈال دی جائے گی۔" سیدن شاہ نے پوچھا۔

"بالکل مجھے پورا یقین ہے۔" ملک نے پورے اعتماد سے کہا۔

"ملک صاحب......! جب بندوں کی گرفتاری ہو گئی، پھر تو بات آگے کی آگے ہی نکل جائے گی۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ جس پر ملک ہنس دیا۔

"ارے شاہ جی......! گرفتاری کون سا باجوے نے ڈالنی ہے۔ وہ تو متعلقہ تھانے میں پیش ہوں گے۔ جہاں پر کارروائی انسپکٹر نے کرنی ہے۔ اسی دوران بندے غائب ہو جائیں گے۔ پھر نہ بندے ہاتھ آئیں گے اور نہ کوئی بات بڑھے گی۔ دو تین ماہ میں یہ سارا معاملہ ہی گول ہو جائے گا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" سیدن شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آج میں نے سارا دن یہی کیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ باجوہ کسی پر بھی اعتماد نہیں کر رہا ہے۔ اس نے بندے نجانے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ اس سے کوئی بات ہوئی ہے اور نہ ہی اسے کسی معاملے کی ہوا لگنے دی جا رہی ہے۔ بات میرے اور ڈی آئی جی صاحب کے درمیان ہے۔ انہوں نے ہی ذمہ داری لی ہے کہ سارا کام خوش اسلوبی سے ہو جائے گا۔"

"پھر تو وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔" سیدن شاہ نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھے ہیں یا نہیں، یہ تو رب ہی جانتا ہے۔ اصل میں وہ خود بھی آپ تک بات نہیں پہنچانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے آپ رکن اسمبلی ہیں۔ آپ کی گرفتاری سے قبل سو معاملے انہیں درپیش

ہوں گے۔ ان کے اچھے بھلے معاملات چل رہے ہیں وہ کیوں سر درد لیں۔'' ملک نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ معاملہ نمٹ جائے تو امین خان کو دیکھتے ہیں۔ میں اسے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دوں گا۔'' سیدن شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اصل میں شاہ جی آپ چھوٹے معاملات پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ شہر کی ساری سیاست کو وہ اپنے اردگرد گھما چکا ہے۔ حالانکہ یہ آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ یہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس نے محنت کی اور اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے الیکشن کے لئے وہ پوری دیوانگی کے ساتھ محنت کرتا چلا جا رہا ہے۔''

''ملک صاحب......! ٹھیک ہے کہ یہ سیٹ ہمارے خاندان کی آبائی سیٹ ہے۔ مگر یہ میرے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے لئے اپنی پوری جان لڑا دی جائے۔ میں نے اس بار سوچا ہے کہ اپنے بیٹے قاسم شاہ کو الیکشن لڑاؤں، اور خود یہ چھوٹے موٹے معاملات دیکھتا رہوں۔''

''آپ نے بہت ٹھیک سوچا ہے شاہ جی، دنیا بہت بدل گئی ہے۔ کہاں چند اخبار تھے جن کے صحافی ہمارے خرچ پر پلتے تھے اور کہاں آج ملک میں میڈیا کا انقلاب آ گیا ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ ہم جنوبی پنجاب کے پس ماندہ ترین علاقے میں ہیں اور اس عوام پر گرفت مضبوط رکھنے کے لئے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ جہالت کے اندھیرے میں ایک کرن بھی چمک اٹھی تو ہماری گرفت نہیں رہے گی۔ بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔''

''میں غافل نہیں ہو ملک صاحب......! ان سارے معاملات کو سمجھتا ہوں۔ بہرحال آپ تیار رہیں کہ اس بار ایم پی اے کا الیکشن آپ نے لڑنا ہے۔''

''نہ جی......! مجھے تو معاف رکھیں۔ ہاں بیٹا اگر چاہے گا تو ضرور حصہ لیں گے۔ ہم ایسے ہی آپ جیسے احباب کی خدمت کریں، یہی بہت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سیدن شاہ کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ''آئیں شاہ جی کھانا کھاتے ہیں۔''

دونوں اٹھ گئے اور کھانے کی میز تک گئے جہاں انتہائی پرتکلف کھانا چنا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران بھی یونہی ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ پھر ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ اگرچہ سیدن شاہ کے من میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اسے بہت کوفت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ کسی کے پاس آکر بیٹھا ہوا ہے اور اس کی باتیں سن رہا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ فون آ گیا۔ ملک امتیاز نے فون سکرین پر نمبر دیکھے اور چونک

گیا اور تیزی سے بولا۔

''ڈی آئی جی صاحب کا فون ہے۔''

''سنیں کیا کہتا ہے۔'' سیدن شاہ نے اپنا تجسس ضبط کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ تو ملک نے فون آن کر دیا۔ رسمی سی باتوں کے بعد اس نے سنا اور پھر ہوں، ہاں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر تاثرات بدل گئے تھے۔ چند منٹ گفتگو کے بعد وہ بولا۔

''ٹھیک ہے سر......! میں مشورہ کر کے ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اور انتہائی افسردہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس کیفیت میں رہنے کے بعد بولا۔

''شاہ جی سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہو گیا ہے۔ رفاقت باجوہ کامیاب ہو گیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ملک صاحب......؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ ڈی آئی جی نے باجوہ کو آج شام تک کا وقت دیا تھا۔ ابھی وہ ان کے پاس آیا ہے۔ بقول اس کے آپ کا ایک بندہ بک گیا ہے کہ انہوں نے قتل سیدن شاہ کے کہنے پر ہی کیے ہیں۔ باقی ابھی دو نہیں مانے۔''

''کون بکا ہے۔'' سیدن شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

''رب نواز نامی آدمی ہے۔'' ملک نے کہا اور پھر تیزی سے بولا۔ ''وہ یہی بتا رہے تھے کہ باجوہ باقاعدہ بیان لے کر آیا ہے۔ اور آپ کے خلاف احکامات مانگ رہا ہے۔''

''اسے کیا ہو گیا۔'' سیدن شاہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو ملک بولا۔

''یہ تو بعد میں سوچا جا سکتا ہے شاہ جی، اصل معاملہ تو یہ ہے کہ نا کہ اب اس صورت حال میں کیا کیا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے اسے ٹال سکتا ہے۔'' ملک نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''کیا کہتے ہو آپ......؟ کیا کرنا چاہیے۔'' سیدن شاہ نے پوچھا۔

''اس سارے معاملے کی جڑ کو پکڑنا ہو گا شاہ جی۔'' ملک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ہمیں امین خان سے بات کرنا ہو گی۔ وہ اگر مان گیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے وہ کچھ دو کچھ لو پر ہی معاملہ طے کرے گا۔''

''ہوں۔'' سیدن شاہ نے ہنکارا بھرا اور پھر صوفے پر سیدھا ہو گیا۔ پھر گہرے لہجے

میں بولا۔ ''کون کرے گا اس سے بات......اور پھر اتنی جلدی معاملہ کیسے حل ہو جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم ڈی آئی جی صاحب کو اس معاملے میں ڈال لیتے ہیں۔ انہیں تو ساری کہانی کا پتہ ہے اور پھر وہ ہم پر مہربانی بھی کر رہے ہیں۔ آفٹر آل وہ آفیسر ہے، بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر امین خان سے بات کرنا بھی پڑی تو وہی کریں گے۔ کیا خیال ہے؟''

''ملک صاحب......! جب آپ اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں تو پھر آپ ہی اسے حل کریں۔ جو کرنا ہے کریں۔ شام تک معاملہ حل ہو جانا چاہیے۔''

''میں بات کرتا ہوں۔'' ملک امتیاز نے فون ملایا اور ڈی آئی جی سے باتیں کرنے لگا، پھر گفتگو کا اختتام یہی پر ہوا کہ وہ خود ان کے پاس آ رہا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ڈی آئی جی بھی ان کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری تفصیل بتا کر کہا۔

''شاہ جی......! باجوہ مجھ پر اعتماد کر رہا ہے۔ لیکن بہت محتاط بھی ہے۔ وہ ایک ہی بندہ پیش کر رہا ہے جو اس وقت بھی میرے آفس میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو میرے سامنے بیان دے چکا ہے۔ اور یہ بیان تحریر کی صورت میں بھی آ گیا ہے۔ یہ دیکھیں اس کی فوٹو کاپی۔''

سیدن شاہ نے وہ بیان دکھایا اور پھر ملک امتیاز کی جانب بڑھا دیا۔ وہ پڑھ چکا تو ملک بولا۔

''اب اس کا حل کیا ہے سر......!''

''یہ تو ممکن ہے کہ بندہ عدالت میں جا کر اپنا بیان بدل دے لیکن مجھے نہیں لگتا۔ باجوہ بہت بااعتماد ہے اسے یقین ہے کہ وہ بندہ عدالت میں جا کر بیان نہیں بدلے گا۔''

''اس کے یقین کی وجہ......؟'' ملک نے پوچھا۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔ اس لئے اس نے باقی بندے پیش نہیں کیے۔''

''تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ جیسا کہ ہمارے درمیان طے تھا، بندے کو بھگا دیتے ہیں۔ آپ باجوہ سے ہینڈاور کر لیں یا پھر اسے پولیس مقابلے میں......'' ملک نے رائے دی۔

''باجوہ بہت سیانا بندہ نکلا ہے۔ وہ میڈیا کے سامنے بندے کو ہینڈاور کرنا چاہ رہا ہے۔ اسی لئے میں نے آپ سے دوبارہ رابطہ کیا ہے۔ کیونکہ وہی رب نواز سانول نامی کسی شخص کے قتل کا بھی اعتراف کر چکا ہے اور یہ قتل بھی شاہ صاحب کے کھاتے میں ڈال رہا ہے۔ اس معاملے پر ان کی بہت گرفت ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باجوے کے پیچھے کس بندے کا ہاتھ ہے۔''

''ٹھیک ہے......!'' سیدن شاہ اچانک بولا۔ ''کیا چاہتے ہیں وہ'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''میں نے اپنے طور پر امین خان سے بات کی تھی۔ ان دنوں میری اس سے خاصی ملاقاتیں رہی ہیں اس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ شاہ جی کی پگڑی اچھالی جائے۔ ظاہر ہے اگر شاہ جی ایک بار بھی پولیس کی حراست میں آ جاتے ہیں تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ یہ تو وہ بھی جانتے ہیں۔'' ڈی آئی جی نے صورت حال واضح کر دی تو سیدن شاہ نے پوچھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''امین خان سے بات......! ظاہر ہے وہ کوئی نہ کوئی شرط رکھے گا۔ آپ کو قبول ہوئی تو ٹھیک ورنہ پھر جو آپ حکم دیں گے، معاملہ تو ویسے ہی ہوگا۔ میں اسے یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ جب معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔'' اس نے اپنی پوزیشن واضح کر دی۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ بات کریں۔'' سیدن شاہ نے اپنا عندیہ دے دیا۔

''میں نہیں ملک صاحب کریں۔ انہوں نے کون سا اس سے بگاڑی ہوئی ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا تو ملک نے امین خان کے نمبر ملائے۔ لمحوں میں اسے سے رابطہ ہو گیا۔ رسمی سی باتوں کے بعد ملک نے کہا۔

''خان سائیں......! بندوں پر معاملات پڑتے ہی رہتے ہیں۔ آپ مہربانی کریں اور باجوہ سے ہاتھ اٹھا لیں۔ آپ جو حکم دیں گے، ہم ماننے کو تیار ہیں۔''

''دیکھیں ملک صاحب......! آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں کتنی انوسٹمنٹ ہوئی ہے۔ دو الیکشن میں ہار چکا ہوں، کیا آپ مجھے یہ حق ہی نہیں دیتے کہ میں بھی الیکشن جیتنے کے لئے محنت کروں۔''

''آپ فرمائیں ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''یہ باتیں فون پر تو نہیں ہو سکتی نا، آپ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں ملک صاحب۔'' امین خان کے لہجے میں غرور چھلک رہا تھا۔

''تو پھر آپ میرے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔ یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جن سے سیدھا معاملہ کیا جا سکتا ہے، آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

''میں سمجھ گیا ہوں۔ مجھے ملاقات میں کوئی عار نہیں ہے۔'' امین خان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”تو میں انتظار کروں گا۔“ ملک نے پوچھا۔

”میں آدھے گھنٹے میں آ رہا ہوں۔“ امین خان نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ملک نے تفصیل بتا دی۔

امین خان کے استقبال کے لئے ملک امتیاز خود پورچ تک گیا۔ اس کے ساتھ سیکورٹی کا ایک لشکر تھا۔ وہ اگر آیا تھا تو اپنا بندوبست کر کے آیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو امین خان ڈی آئی جی کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ سیدن شاہ کے گلے ملا۔ پرجوش مصافحہ کیا اور پھر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد بولا۔

”جی فرمائیں......! کیا حکم ہے میرے لئے۔“

”آپ ساری بات سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔“ ملک امتیاز نے بہت تحمل سے کہا۔

”دیکھیں ملک صاحب......! ہم سیاست دان ہیں۔ جیسا کہ فون پر بات ہوتی ہے۔ ہم یہ محنت کس لئے کرتے ہیں؟“ امین خاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم آپ کا سارا نقصان پورا کر دیتے ہیں۔ بولیں......!“ سیدن شاہ نے کہا۔

”شاہ جی......! جتنے آپ کے اثاثے ہیں، اس سے اگر دوگنے نہیں تو آپ کے برابر ضرور ہیں۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ ایسے دس الیکشن میں بھگا دوں تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟“ ملک امتیاز نے حتمی انداز میں پوچھا۔

”اس بار تو شاہ جی استعفیٰ دیں۔ اور آنے والے الیکشن میں حصہ نہ لیں۔ میرا مطلب ضمنی الیکشن سے ہے۔“

”بس یہی مطالبہ ہے۔“ سیدن شاہ نے پوچھا۔

”فی الحال تو اتنی سی بات ہے۔“ امین خان مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہو گیا......! میں ابھی استعفیٰ دیتا ہوں لیکن یہ کیا گارنٹی ہے کہ خان محمد والا معاملہ صاف ہو جائے گا۔“ سیدن شاہ نے پوچھا۔

”آدھے گھنٹے کے اندر بندے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ پھر آپ کا معاملہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ یا پھر آپ بتا دیں کہ آپ کیسی گارنٹی چاہتے ہیں؟“ امین خان نے گیند ان کے کورٹ میں پھینک دی۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی زبان پر بھروسہ ہے۔ میرا استعفیٰ ملک صاحب کے پاس

رہے گا۔ آپ بندے چھوڑ دیں۔ میں پریس کانفرنس میں استعفیٰ کا اعلان کر کے حویلی چلا جاؤں گا۔ شام ہونے سے پہلے استعفیٰ آپ سمیت سب کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔“

”اور اگلا الیکشن......؟“ امین خان نے وضاحت چاہی۔

”میں نہیں لڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔“ سیدن شاہ نے یقین دہانی کرائی۔ پھر ملک امتیاز کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ملک صاحب......! اپنے کسی بندے کو بلوائیں، وہ میرا استعفیٰ ٹائپ کرلائے۔ میں دستخط کر دیتا ہوں۔

معاملہ طے پاتے ہی ہر بندہ مصروف ہو گیا۔ ڈی آئی جی نے رفاقت باجوہ کو حکم دے دیا کہ وہ سارے بندے لے کر فوراً آفس پہنچے۔ امین خان نے اللہ بخش کو پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کا بندوبست کرنے کا کہا۔ ملک نے سیدن شاہ کا استعفیٰ ٹائپ کروایا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ جب امین خان فتح یاب ہو کر ملک کی کوٹھی سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سیدن شاہ کا استعفیٰ تھا۔ رفاقت باجوہ کو سمجھا بجھا کر اور ایک لمبی رقم دے کر منا لیا گیا تھا کہ بندے چھوڑ دے۔ وہ بندے گاڑی میں بیٹھ کر حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔ اور سیدن شاہ اپنے ذہن میں بہت ساری انتقامی سوچیں لئے واپس پلٹ پڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے ہزیمت اٹھائی تھی۔ اس دن اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی اسے شکست سے دوچار کر سکتا ہے۔ سورج ڈھل رہا تھا جب وہ شہر سے نکلا۔

☆☆☆

رب نواز گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا انتہائی بے تاب تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر حویلی پہنچ جائے۔ اس کے دل میں سیدن شاہ کے لئے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے تو چاہا تھا کہ سیدن شاہ کو عدالت میں بے نقاب کرے۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ رفاقت باجوہ نے ان سب کو جانے کے لئے کہہ دیا۔

”یہ سب کیا ہے باجوہ صاحب......! پہلے آپ نے ہم پر تشدد کی انتہا کر دی۔ لیکن ہم نہیں مانے۔ اب جبکہ میں پورے یقین سے، پورے خلوص کے ساتھ آپ کی مرضی کے مطابق چلنے کے لئے تیار ہوں تو آپ ہمیں کیوں بھیج رہے ہیں۔“ رب نواز نے انتہائی شک بھرے انداز میں باجوہ سے پوچھا تھا۔

”یہ دنیا ہے اور اس میں جو دنیا دار ہیں نا ان کے پاس خیر نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ میں بھی رشوت لینے پر مجبور ہوں۔ ورنہ کوئی بھی گولی مجھے اس لئے چاٹ سکتی ہے کہ میں باعتماد نہیں

رہوں گا۔تم جاؤ، تمہیں زندگی میں ایک موقع مل رہا ہے کوئی ایسا کام کرنا جس سے تمہارا ضمیر مطمئن ہو جائے۔'' رفاقت باجوہ نے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

''میں کیا کروں گا وہاں جا کر، پھر سے سیدن شاہ کی غلامی کرنا پڑے گی۔ایک عزت تھی وہ بھی......'' رب نواز کا لہجہ بھیگ گیا۔

''کوئی بھی اپنی عزت پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ایک سیدن شاہ ہے جس نے مجھے دھتکارانے کی حد تک بے عزت کیا ہے۔خیر......! میں دیکھ لوں گا، تم کم از کم اتنا تو کر سکتے ہو کہ اپنی بہن کو حویلی سے نکال لو۔''

''بہت مشکل ہوگا، اس کے گارڈز......''

''وہ ابھی شہر میں ہے، اس نے پریس کانفرنس کرنی ہے۔اس سے پہلے اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔تمہارے پاس وقت ہے۔'' رفاقت باجوہ نے کہا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر چل دیا......

ڈرائیور اپنی طرف سے کچے راستے پر بہت تیزی سے جا رہا تھا لیکن رب نواز کو وہ رفتار بھی سست لگ رہی تھی۔اور اس وقت سورج ڈھل رہا تھا جب وہ حویلی میں پہنچ گئے۔

رب نواز کو حویلی کے طور طریقوں کا پتہ تھا۔وہ سب لوگ بھی اسے جانتے تھے۔اس لئے رب نواز نے جاتے ہی ایک ملازم سے کہا۔

''داراں مائی سے کہیں......! میں اپنی بہن مہرو سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں پتہ کرتا ہوں، اگر اس نے اجازت دے دی تو'' ملازم یہ کہہ کر چلا گیا اور رب نواز انتہائی بے چینی میں مریدین والے بڑے کمرے میں انتظار کرنے لگا۔اسے ایک ایک لمحہ قیمتی لگ رہا تھا۔اسے یہ پورا یقین تھا کہ اگر سیدن شاہ آگیا تو پھر وہ ساری عمر بھی کوشش کرتا رہے، مہرو کو یہاں سے نہیں نکال سکتا تھا۔یہاں تک کہ خود سیدن شاہ نہ چاہے۔اسے کے پاس یہی ایک مختصر سا وقت تھا۔جس میں وہ مہرو کو نکال سکتا تھا، ورنہ اسے لاش میں تبدیل ہونے میں سیدن شاہ کا ایک ذرا حکم چاہیے تھا۔اسے نجانے کیوں گمان تھا کہ سیدن شاہ اس سے خوش نہیں ہوگا۔وقت لمحہ لمحہ کر کے گزرتا چلا جا رہا تھا۔اور رب نواز کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

''بھالا رب نواز تو کب آیا۔'' اس نے مہرو کی آواز سنی تو پلٹ کر دیکھا۔وہ سرخ جوڑا پہنے ہاتھوں میں مہندی رچائے۔کسی دلہن کی مانند اس کے سامنے کھڑی تھی۔ایک لمحے کے لئے رب نواز کا دل کٹ کر رہ گیا۔انتقام کی آگ نے اس کا دماغ پاگل کر دیا۔جبکہ مہرو اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔وہ آگے بڑھی اور اپنے بھائی کے گلے لگتے ہوئی بولی۔

''تو مجھے لینے کے لئے آگیا ہے نا، چلو، ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں عام سا تاثر تھا۔جس پر رب نواز نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''تم پر کوئی ظلم تو نہیں ہوا'' رب نواز روہانسا ہو رہا تھا۔اس وقت مہرو نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں بھالا رب نواز......! جو تم سمجھ رہے ہو وہ نہیں، میرے اللہ نے میری حفاظت کی ہے۔اگر میں یہاں رہی تو نجانے......'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ رب نواز کو یوں لگا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔اس نے مہرو کا بازو پکڑا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''تم اسے پیر سائیں کی اجازت کے بغیر نہیں لے جا سکتے!'' ایک چوکیدار نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا تو رب نواز نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر قدرے تحمل سے کہا۔

''مجھے جانے دو......!''

''نہیں پیر سائیں کی اجازت کے بغیر نہیں، تمہیں پتہ ہے کہ یہاں سے کوئی کسی کو نہیں لے جا سکتا۔'' چوکیدار اس کے سامنے ڈٹ گیا۔رب نواز نے اس کا جائزہ لیا۔اور پھر نجانے اس کے جسم میں طاقت کہاں سے آگئی۔اس نے مہرو کا ہاتھ چھوڑا، سیدھا چوکیدار کی گن پر ہاتھ ڈالا۔گن اس سے چھینی اور پھر پوری قوت سے چوکیدار کے سر پر دے ماری۔اس نے ایک سانس بھی نہ لی اور ڈکارتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔اب فقط لمحوں کا کھیل تھا۔اسے مہرو کو لے کر نکلنا تھا۔وہ تیزی سے نکلا۔اس کا رخ گیٹ کی طرف نہیں تھا۔بلکہ ایک طرف کی چار دیواری کی جانب تھا۔عین اس وقت جبکہ وہ چار دیواری کے قریب پہنچا۔اس کے عقب سے فائر ہونا شروع ہو گیا۔اس نے پوری قوت لگا کر مہرو کو دیوار پر چڑھایا تو مہرو دوسری جانب کود گئی۔رب نواز کو قدرے حوصلہ ہوا۔اس نے بھی فائر کھول دیا۔جس سے پوری حویلی لرز گئی۔پھر جیسے ہی فائر میں قدرے کمی آئی اس نے دیوار پھلانگی اور باہر کی جانب کود گیا۔جہاں مہرو اس کا انتظار کر رہی تھی۔وہ دونوں بہن بھائی بغیر سوچے سمجھے ایک جانب کو نکل پڑے۔یہاں تک کہ بھاگتے ہوئے ان کا سانس پھول گیا۔اگر انسان کو تھوڑی سی کامیابی مل جائے تو اس کا حوصلہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔یہی حال اس وقت رب نواز کا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی بہن کو اس قدر آسانی سے پا لے گا اور پھر یوں کہ اس کی عزت محفوظ تھی۔وہ اس وقت پورے زمانے سے لڑنے کا حوصلہ خود میں پا رہا تھا۔وہ دونوں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔یہاں تک کہ بے دم ہو کر ایک ٹیلے پر گر گئے۔

''بھالا......! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' مہرو نے پھولے ہوئے سانس سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں ہم کہاں جائیں گے۔لیکن یہاں سے ہمیں نکلنا ہے۔'' رب نواز نے تیزی سے کہا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ہوش ٹھکانے پر آگئے۔کوئی در ایسا نہیں تھا جہاں پر وہ جا سکے۔اگر وہ کچی بستی میں اپنے والدین کے پاس گیا تو نہ صرف وہ پکڑے جائیں گے بلکہ اس کے والدین بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔وہ سیدن شاہ کے منہ سے شکار چھین کر لایا تھا۔اس میں اس کی کتنی ہتک ہوگی کہ کوئی اس کی حویلی سے،اس کی اجازت کے بغیر اپنی بہن کو لے گیا ہے۔

''تم خاموش کیوں ہوگئے ہو۔'' مہرو نے پوچھا۔

''سچ تو یہ ہے مہرو،اس پورے علاقے میں کہیں بھی ایسا ٹھکانا نہیں ہے جہاں ہم محفوظ رہ سکیں۔ایک طرف اگر سیدن شاہ کے لوگ میرے پیچھے ہوں گے تو دوسری جانب خان محمد کے لوگوں سے نہیں بچ پاؤں گا۔میں کہاں جاؤں......!'' رب نواز روہانسا ہو کر ٹیلے پر بیٹھ گیا۔پوری دنیا اسے غیر محفوظ دکھائی دے رہی تھی جبکہ اندھیرا گہرے سے گہرا ہوتا چلا جارہا تھا۔تبھی مہرو نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''چلو......!ایک محفوظ ٹھکانا ہے۔'' مہرو نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ رب نواز کو امید ہوگئی وہ اس کے ساتھ چل دیا،وہ دونوں چلتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ کچی بستی کے باہر جنڈ کے درخت تلے پہنچ گئے۔سامنے علی عشاء نماز پڑھ کے صف پر بیٹھا ہوا تھا،اس کے قریب ہی درویش بابا بیٹھا ہوا تھا۔''بھلا......!یہی ہے محفوظ ٹھکانہ۔''

''یہ......!یہ کیسے ممکن ہے۔یہ لوگ تو خود کھلے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' رب نواز نے حیرت سے کہا تو لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ درویش بابا کی آواز آئی۔

''کون ہے......سامنے آجاؤ۔''

وہ دونوں چلتے ہوئے ان کے پاس چلے گئے۔تبھی علی نے پہچانتے ہوئے کہا۔

''رب نواز،تم......!اور مہرو......!''

''ہاں علی......!یہ مجھے سیدن شاہ کی حویلی سے لے آیا ہے۔اور اب......۔''

''فکر نہیں کرو۔تم محفوظ پناہ میں آگئی ہو۔اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔'' علی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ لفظ رب نواز کے دل میں اتر گئے۔

''غم نہ کرو بیٹی......!اب کم از کم دنیا کی کوئی طاقت تم پر ظلم نہیں کر سکے گی۔'' درویش بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو انہی لمحوں میں رب نواز نے فیصلہ کرلیا۔

''علی......!ممکن ہے میں کسی نہ کسی طرح تمہارا گنہگار ہوں۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم مجھے معاف کردو،لیکن تمہارے پاؤں پڑتا ہوں کہ میری بہن کی عزت......'' یہ کہتے ہوئے رو پڑا۔

''مہرو سے میرا تعلق انسانیت کا ہی نہیں،وہ روحانی تعلق ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔تم بے فکر ہوجاؤ۔''

''علی......!تو پھر یہ مہرو تیرے حوالے،میں جارہا ہوں۔میں ایک آخری کام کر کے مرنا چاہتا ہوں۔دعا کرنا میں سرخرو ہوجاؤں۔'' رب نواز نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔پھر مہرو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک طرف اندھیرے میں بڑھ گیا۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مہرو اس ویرانے میں علی کے پاس ہوگی۔علی نے اسے مدرسے کی چاردیواری کے اندر بھیج دیا۔اور درویش بابا اس کے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگا۔علی کو محسوس ہوگیا کہ جیسے دنیا تبدیل ہورہی ہے۔وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

فرزانہ کے لئے وہ صبح اک عجیب سا احساس لے کر آئی تھی۔رات اس نے ایک خواب دیکھا تھا،اس خواب میں اس نے جو بھی دیکھا تھا اس بارے وہ کوئی منطقی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ اس خواب کو برا کہے یا خوشگوار۔وہ جو کچھ بھی تھا فرزانہ اس بارے پریشان تھی کہ خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔نجانے رات کا وہ کونسا پہر تھا جب اس نے خواب دیکھا اور پھر بہت دیر تک وہ کھوئی رہی۔دوبارہ اس نے سونے کی کوشش بھی کی لیکن وہ نیند میں بھی بے چین رہی تھی اور یہی بے چینی ناشتے کی میز پر پہنچ کر بھی تھی۔آج وہ خلاف معمول ناشتے کی میز پر پہلے آگئی تھی۔اس کے بابا سائیں، ابھی باہر لان ہی میں ٹہل رہے تھے۔ملازم نے جب اسے جا کر بتایا کہ تو وہ بھی آگیا۔کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے فرزانہ کی جانب دیکھا اور پھر چونکتے ہوئے بولا۔

''بیٹی......!کیا بات ہے،کوئی پریشانی ہے۔''

''نن......نہیں تو......!بس رات نیند اچھی نہیں آئی۔میں ٹھیک ہوں۔'' فرزانہ نے بہانہ بنا دیا تو امین خان نے اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا......!آج اور ابھی ڈاکٹر سے کہو کہ وہ تمہیں دیکھنے کے لئے آئے۔اس میں کوتاہی نہیں چلے گی۔لگتا ہے تم نے کام کچھ زیادہ ہی کرنا شروع کردیا ہے۔''

''او نہیں بابا سائیں......!ابھی کام شروع ہی کہاں ہوا ہے۔'' پھر اپنے باپ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔''خیر......!آپ بہت خوش ہیں۔اپنی خوشی مجھ سے شیئر کریں گے۔''

"کیوں نہیں......! جب ایک طویل مدت کے بعد محنت رنگ لائے تو بندہ خوش تو ہوتا ہے۔ کیا اسے خوش نہیں ہونا چاہیے۔" امین خان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہم بھی تو سنیں، ایسی کون سی محنت تھی جو رنگ لے آئی ہے۔" فرزانہ نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

"سیدن شاہ کا استعفٰی، میری محنت کا نتیجہ ہے۔ تم نے آج کا اخبار پڑھا۔"

"نہیں تو......! میں اخبار دفتر میں دیکھتی ہوں۔ آپ نے کیا محنت کی تھی۔" فرزانہ نے عام سے لہجے میں پوچھا اور توس امین خان کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

"چھوڑو......! یہ سیاسی باتیں ہیں۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ سیاست بھی شطرنج کی بساط کی مانند ہوتی ہے۔ شہ مات دینے کے لئے کبھی پیادے اور کبھی فیل بھی مروانے پڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وزیر بھی مروا دیئے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔ کھیل ہے نا یہ۔" امین خان نے تصور ہی تصور میں سیدن شاہ کی ہزیمت کا مزہ لیتے ہوئے انتہائی سرور سے کہا پھر خود ہی چونکتے ہوئے بولا۔ "خیر چھوڑو......! تم ناشتہ کرو۔ اور ہاں آج ڈاکٹر کو ملے بغیر آفس مت جانا۔"

"بابا سائیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ویسے آپ کے حکم کے مطابق میں آج شام ہی ڈاکٹر سے مل لوں گی۔" فرزانہ نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پھر اچانک چونکتے ہوئے بولی۔

"بابا سائیں......! آپ ہمیشہ سیدن شاہ کے علاقے کی وجہ سے ہی ہارتے رہے ہیں۔ یہ علاقہ کون سا ہے؟"

"شہر کی حدود سے باہر نکلیں تو روہی کے اندر کی طرف کا یہ علاقہ ہے۔ ایک تو ہماری اپروچ وہاں تک اتنی نہیں ہوئی، دوسرا وہ لوگ اسے اپنا روحانی پیشوا......" امین خان کہتا چلا جا رہا تھا جبکہ اس کا دماغ حامد کی باتوں کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں کی صورت حال بتا چکا تھا۔ "تم میری بات سن رہی ہو نا۔" امین خان نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بابا سائیں بہت غور سے سن رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔ "بابا سائیں آپ شاید اسے کس نظر سے دیکھیں گے، مجھے نہیں معلوم مگر میں نے اس علاقے میں کام کی شروعات کر دی ہیں۔ تھوڑا عرصہ تو لگے گا لیکن آپ کی اپروچ بھی وہاں تک ہو جائے گی۔"

"کیا تم نے یہ سب سوچ سمجھ کر کیا ہے؟" امین خان نے کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر کہا۔

"ہاں......! اور اس کام کی شروعات آج سے ہوں گی۔" فرزانہ خان نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو امین خان سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں، تم اپنا کام کرو۔ اگر اس دوران کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔" امین خان نے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔ پھر دونوں کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔

اس وقت وہ دفتر کی جانب جا رہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی لئے جا رہا تھا لیکن فرزانہ کی ساری توجہ خواب کی طرف تھی۔ وہ خاردار جھاڑیوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ وہ وہاں سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔ وہ جس طرح آگے بڑھتی نوکیلے خار اسے اذیت دے رہے تھے۔ موسم میں شدید قسم کی گھٹن تھی۔ اچانک وہ میدان ختم ہو گیا اور اس کے سامنے دور تک صحرا ہی صحرا تھا۔ جس کی تیز ہوا اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر صحرائی ویرانے کو دیکھنا چاہتی تھی مگر وہ آنکھیں کھول ہی نہیں پا رہی تھی۔ ایک انجانی قوت اسے آگے ہی آگے بڑھتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں پر پاؤں کے نیچے پکی زمین تھی۔ وہ وہاں پر جم کر کھڑی ہو گئی، اسے دور ایک سیاہ نقطہ دکھائی دیا جو لمحوں میں بڑا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اسے وہ نقطہ اپنے پورے وجود میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ علی تھا، وہ اسے پہچان کر خوش ہو گئی۔ اور پھر جیسے ہی وہ بے تابانہ انداز میں اس کی جانب بڑھی، زمین ہی سے آگ کی ایک دیوار اٹھ کھڑی ہوئی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ علی اس کی طرف آنا چاہتا تھا اور وہ بھی اس کی جانب بڑھنا چاہتی تھی مگر آگ کی اس دیوار نے ان کی راہ روکی ہوئی تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، تبھی علی کے سے عقب آندھی اٹھی جو ہر طرف چھائی چلی گئی یہاں تک کہ اندھیرا چھا گیا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر علی کا لمس اسے محسوس ہو رہا تھا، اسی احساس میں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

خواب کا یہ اثر دفتر پہنچ جانے تک رہا۔ پھر جیسے ہی وہ دفتری معاملات میں کھوئی، خواب کا سارا تاثر زائل ہو گیا۔ وہ بھول گئی۔ اس وقت دن کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے جب اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے سکرین پر نمبر دیکھا تو وہ حامد کا تھا۔ پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ روہی کی جانب جاتے ہوئے جائزہ اسے انتظام کرنا چاہتا ہوگا۔ اس نے فوراً آن کیا اور ہیلو کہہ دیا تو دوسری جانب سے حامد کہہ رہا تھا۔

"میڈم میں اس وقت روہی میں اس مقام پر ہوں جس کے بارے میں، ہم نے تعین کیا تھا۔"

"کیا تم وہاں پر پہنچ بھی گئے ہو۔" فرزانہ نے حیرت سے کہا۔

"جی، میں نے سوچا کہ صبح وقت پر پہنچ جاؤں تو میرا تقریباً ایک دن بچ جائے گا۔ خیر......! میں آپ کو یہاں کی صورت حال سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بولو......!" فرزانہ نے دھیرے سے کہا۔

"یہاں پر جو نگران ہیں فقیر سائیں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" حامد نے کہا تو فرزانہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ دل کے دھڑکنے کا انداز وہی تھا۔ جس طرح یہ علی کے نام پر دھڑکتا تھا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور پھر دھیرے سے ہی کہا۔

"ہاں بات کراؤ۔" فرزانہ نے کہا تو چند لمحوں بعد دوسری طرف سے آواز گونجی۔

"آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے یہاں تک محض خدمت خلق کے لئے رسائی کی۔ آپ یہاں انوسٹمنٹ کریں گی۔ کیا میں اپنی محسن کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں......!"

"کیا ہماری تنظیم کے نمائندے نے آپ کو تعارف نہیں کرایا جو یہاں آپ کے پاس موجود ہے۔" فرزانہ نے لہجے پر غور کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"ہاں......! اس نے تو بتایا ہے مگر میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فرزانہ خان ہیں، سردار امین خان کی بیٹی۔"

"جی، کیا آپ مجھے جانتے ہیں۔"

"آپ کو کون نہیں جانتا، پورا علاقہ آپ کے خاندان سے متعارف ہے۔ خیر......! آپ سے تعارف کی تصدیق میں نے اس لئے کی ہے کہ آپ سے ایک درخواست ہے۔" علی نے بہت تحمل سے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فرمائیں......!" فرزانہ ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھی، اسے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ لہجہ اس نے بہت سنا ہے۔ کہاں سنا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا اسے وہ بہت اپنا اپنا سا لگا تھا۔

"کیا آپ کسی مظلوم لڑکی کو کچھ عرصے کے لئے پناہ دے سکتی ہیں، میرا مطلب ہے آپ کی این جی او خواتین کے حقوق کے لئے بھی کام کرتی ہے؟"

"آج سے بلکہ ابھی سے کرے گی۔ آپ اس خاتون کو ہمارے ہاں بھیج دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ذرا سی ہمت کی اور پوچھا۔

"کیا وہ لڑکی واقعی ہی مظلوم ہے، میرا مطلب ہے، اس میں کوئی قانونی رکاوٹ، یا وہ کوئی کسی الزام میں......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"جب میں نے اسے مظلوم کہا ہے تو وہ مظلوم ہے۔ آپ نے اس کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اس کی کوئی قانونی مدد کریں۔ اسے بس تحفظ چاہیے۔" علی نے اسی طرح ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا ہے نا کہ ایک لڑکی کو ہم پناہ دیں اور اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ اس کے بارے میں......"

"فرزانہ......! میں علی بات کر رہا ہوں۔" علی نے کہا تو فرزانہ کے ہاتھ سے فون چھوٹتے ہوئے بچا، اسے یہ احساس ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے آفس میں بیٹھی ہے۔ یہ چند لفظ اس کے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ طویل خاموشی کی وجہ سے علی نے پوچھا۔ "تم میری بات سن رہی ہو؟"

"ہاں......ہاں......! علی......ہاں......کہو، تم کہو......پلیز......تم کہو......مجھے بتاؤ...... تم وہاں کیوں ہو۔ تم کس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو۔ خدا کے لئے......"

"میں اسی لئے اپنا تعارف نہیں کرانا چاہتا تھا کہ تم اپنی کہو گی، میری نہیں سنو گی۔"

"میں سنوں گی، پلیز مجھے بتاؤ......میں اب تمہاری ہی سنوں گی۔" فرزانہ نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ تفصیلات پھر کبھی سہی۔ میں تمہارے پاس مہرو کو بھیج رہا ہوں۔ اس کی حفاظت خود سے بھی زیادہ کرنا، اور اپنے باپ کو بھی معلوم نہیں ہونے دینا۔ یہ میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ مظلوم ہے۔" علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میرے سر آنکھوں پر۔ کیا میں اسے لینے کے لئے آ جاؤں۔" فرزانہ نے جذبات میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"نہیں......! میں اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ حامد لے آئے گا ابھی۔" علی نے واضح انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، حامد سے میری بات کروادو۔" فرزانہ نے کہا تو ایک لمحے بعد حامد لائین پر تھا۔ تب اس نے کہا۔ "حامد......! تم جو کیش لے کر گئے تھے وہ سارا انہیں دے دو۔ اور تمہارے ساتھ جس لڑکی کو بھیجیں، اسے پوری حفاظت کے ساتھ فوراً یہاں میرے پاس آفس میں لے آؤ۔"

"میڈم میرے دوسرے ساتھی......"

"انہیں بھی واپس لے آؤ۔ جیسا یہ کہیں ویسا ہی کرنا۔" فرزانہ نے قدرے سختی سے کہا۔

"جی میڈم......!" حامد نے تیزی سے کہا۔

"او کے خدا حافظ......!" فرزانہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا لی۔ وہ خود پر قابو پانا چاہتی تھی۔ اس کا بدن دھیرے سے لرز رہا تھا۔ کوئی بھی سوچ اس کے دماغ میں جم نہیں رہی تھی۔ ہیولے سائیں سائیں کرتے ہوئے اس کے دماغ میں شور مچا رہے تھے۔ وہ خالی الذہن ہو جانا چاہتی تھی۔ اس لئے سارے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر علی کا تصور کرنے لگی۔ تبھی ایک لفظ اس کے دماغ سے چپک گیا۔ "فقیر سائیں" تو کیا علی......؟ اس سے آگے وہ نہ سوچ سکی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اسے اپنے گنہگار ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ آنسو اس کے پلکوں سے لرز کر اس کے گال بھگوتے اچانک اسے خواب یاد آ گیا جس نے رات سے ہی اسے بے چین کیا ہوا تھا، وہ جس قدر سوچتی چلی جا رہی تھی، اسی قدر اسے سمجھ آ رہی تھی۔ اگرچہ بہت سارے پہلو اس کی سمجھ میں نہ آئے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ اس کا خواب ایک اشارہ تھا، جسے اس نے سمجھا تھا۔ اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور علی کی طرف سے بھیجی گئی مہمان کا شایان شان استقبال کرنے کے لئے اٹھ گئی۔ وہ مظلوم تھی یا نہیں یا اس کی حیثیت کیا تھی، فرزانہ کو اس سے بھی غرض نہیں تھی، اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے علی نے بھیجا ہے۔ زندگی میں پہلی بار علی نے کسی قابل سمجھا تھا اسے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

جس طرح روہی پر رات کا اندھیر چھایا ہوا تھا، اسی طرح سیدن شاہ کی حویلی پر بھی رات اتری ہوئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ صحرا میں روشنی کہیں نہیں تھی لیکن حویلی میں برقی قمقمے روشن تھے۔ اس رات حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ سیدن شاہ جس نے ہمیشہ جیت دیکھی تھی، ہارنے کا مزہ جس نے چکھا ہی نہیں تھا، وہ کسی زخمی شیر کی مانند اپنے کمرہ خاص میں، اپنے بستر پر پڑا بے چین ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے جس کی بنا پر اتنی بڑی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ وہ شخص جو ووٹوں کے حصول میں الیکشن کے میدان اور طاقت کے لحاظ سے کسی بھی طرح اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس نے بہت چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ اس سے استعفیٰ لے لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے آئندہ الیکشن نہ لڑنے کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ اس کی طاقت، اس کے تعلقات اور اس کی رسائیاں کسی کام نہیں آ سکی تھیں۔ کیا اس نے خان محمد کے قتل کا حکم دے کر غلطی کی تھی؟ اس غلطی کو نہ سیدن شاہ کا دماغ مان رہا تھا اور نہ دل۔ کچھ ایسا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی قسمت ہار رہی تھی۔ ورنہ جب وہ پچھلی بار اپنی حویلی میں آیا تھا تو اسے آتے ہی یہ خبر ملی تھی کہ رب

نواز اپنی بہن مہرو کو لے جا چکا ہے، اس نے چوکیدار کو بھی زخمی کیا اور فائرنگ کرتا ہوا بھاگ گیا۔

حویلی کے سارے ملازمین یہ توقع کر رہے تھے کہ سیدن شاہ ایک طوفان کھڑا کر دے گا، نجانے کس کس پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹیں گے۔ داراں مائی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چوکیدار اپنے انجام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے یہ خبر سنی اور خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ پھر پوری رات گزر گئی۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ سیدن شاہ کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ خاص ملازمائیں جو کھانے پینے کا سامان لے کر جاتی تھیں، ویسے ہی واپس لے آتی تھیں۔ یہ دوسری رات تھی، شاید اس نے اپنی شکست کو ابھی تک قبول نہیں کیا تھا، اور اگر قبول کر لیا تھا تو برداشت کے لئے اسے وقت چاہیے تھا۔ وہ بے چین تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہو گیا۔

"سائیں......! پیراں دتہ آپ سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہے۔" ایک ملازمہ نے اس کے قریب آ کر ڈرتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا تو سیدن شاہ چونک گیا۔ چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے کہا۔

"ہاں......! بلاؤ اسے۔"

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ ملازمہ تیزی سے باہر چلی گئی۔ پھر چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ پیراں دتہ اندر آ گیا۔ جیسے وہ باہر دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ وہ سیدن شاہ کے بیڈ کی پائینتی کی جانب آ کر کھڑا ہو گیا۔ سیدن شاہ نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔

"ہاں پیراں دتہ......! بولو، کس لئے آئے ہو؟"

"پیر سائیں......! آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ خدا کے لئے آپ......"

"میں مر تو نہیں گیا پیراں دتہ، ابھی زندہ ہوں۔ آج تک ہم ہی ان پر راج کرتے آئے ہیں۔ کیا ہوا جو انہوں نے ہماری غلطی ہی کی وجہ سے ہمیں شکست دینے کی کوشش کی۔ ہم ہی ان پر راج کریں گے اور کرتے رہیں گے۔ ان کی یہ وقتی کامیابی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"تو پھر یوں پیر سائیں......!" پیراں دتہ کہتے کہتے رک گیا۔

"دیکھو میں سیاست دان نہیں ہوں، اس پورے علاقے کا مالک ہوں۔ اور جس وجہ سے میری ان پر ملکیت ہے وہ بنیاد ہے میرے پاس۔ بس کسی طرح یہ عرس گزر جانے دو۔ اس کے بعد میں اپنے دشمنوں کو یوں بھگا بھگا کر ماروں گا۔ جیسے کوئی شکاری کسی ہرن کو بھگا کر تھکا کر شکار کرتا ہے۔" اس نے یہ کہا اور پھر چونکتے ہوئے بولا۔ "رب نواز کا پتہ چلا، پکڑ لیا ہے اسے؟"

"نہیں سائیں......!" پیراں دتے نے لرزتے ہوئے کہا۔ "وہ مہرو کے ساتھ اس طرح غائب ہوا ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔ روہی کا ہر کونا چھان مارا ہے۔ لگتا ہے وہ روہی چھوڑ کر نکل گیا ہے۔"

"ہوں......!" سیدن شاہ نے ہنکارا بھرا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "رب نواز کو جب دیکھو اور جہاں دیکھو اسے گولی مار دو۔ اس کی یہی سزا ہے۔ پہلی بار اس حویلی سے کوئی لڑکی میرے بستر پر آنے سے پہلے بھاگ گئی ہے۔ جب تک وہ دوبارہ واپس نہیں آجاتی مجھے چین نہیں آئے گا۔ وہ ہر حال میں واپس آنی چاہیے۔ میرے خلاف بولنے کی یہی سزا ہے۔ میرا ہی کتا مجھی پر بھونکا۔"

"سائیں......! میں اس معاملے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، کل رات سے لیکر آج تک روہی چھان ماری ہے لیکن دونوں کا پتہ نہیں مل رہا۔ کوئی سراغ نہیں ملا ان کا، نجانے انہیں زمین نگل گئی ہے یا آسمان۔ وہ دونوں بچ کر نہیں جاسکتے۔ میں انہیں تلاش کر کے لاؤں گا، چاہے مجھے ان کے پیچھے کہیں بھی جانا پڑے۔ سیدو نے مجھے ساری بات بتا دی ہے کہ اس نے ہی باجوہ کو بیان دیا تھا۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔" سیدن شاہ نے غراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو پیراں دتہ......! اس پورے علاقے میں جو بھی ہمارا دشمن ہے یا تو اسے ختم کر دو یا پھر یہاں سے بھگا دو۔ عرس کی تقریبات پر میں کسی قسم کی کوئی حرکت برداشت نہیں کروں گا۔"

"پیر سائیں......! اس پورے علاقے میں ایک خان محمد مضبوط آدمی تھا، جسے آپ نے ختم کروا دیا، اب کئی برسوں تک وہ لوگ نہیں اٹھ سکیں گے۔ آپ بھی ان پر ہاتھ رکھ دیجیے گا۔ اب صرف ایک شخص یہاں موجود ہے اور وہ ہے علی......!"

"ہوں......!" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج تک اسے اہمیت نہیں دی۔ اسے صرف اس لئے نظر انداز کرتا رہا ہوں کہ وہ خود ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ یا پھر اگر وہ کسی کے لئے کام کر رہا ہے وہ سامنے آجائے گا۔ تم نے کوئی ایسی بات دیکھی۔"

"ایسا تو کچھ نہیں ہے پیر سائیں۔ مگر......"

"مگر کیا......!" سیدن شاہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آج تک احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میاں جی کتنی بڑی ہستی ہیں۔ ہم انہیں یونہی فقیر درویش سمجھتے رہے ہیں۔ وہ جاتے ہوئے علی کو بہت کچھ دے گئے ہیں۔ اس کی کرامات......"

پیراں دتہ پھر سے کہتا کہتا رک گیا۔

"اس کی کرامات کو بے نقاب کرنے کا وقت نہیں ہے پیراں دتہ......! وہ ہماری طرح لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ نہ اس کے پاس طاقت ہے اور نہ وسائل۔ تم کوشش کرو کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ اگر نہیں مانتا ہے تو اسے بھی گولی مار دو......اور یاد رکھو، اس بار نشانہ چوکنا نہیں چاہیے۔ ورنہ میں تمہیں ختم کر دوں گا۔" سیدن شاہ کے لہجے میں کچھ ایسی کرختگی تھی کہ پیراں دتہ پوری جان سے لرز گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ خاموش رہا۔ تبھی وہ بولا۔ "یہ سب کچھ غیر محسوس انداز میں ہونا چاہیے اور کل صبح سے عرس کے انتظامات بھی شروع ہو جانے چاہئیں۔"

"جیسے حکم سائیں کا۔" پیراں دتے نے تقریباً جھکتے ہوئے کہا۔

"اب جاؤ، صبح ملاقات ہوگی۔" سیدن شاہ نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ واپس چلا گیا تو تنہائی پاتے ہی سیدن شاہ نے خود میں بے چینی ختم ہوتی ہوئی محسوس کی۔ ہزیمت کے احساس کا غبار چھٹا تو اسے سمجھ آنے لگی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ پھر وہ رات گئے تک سوچتا رہا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس تناظر میں اسے امین خان کی سیاست ایک بچگانہ کھیل لگی۔ وہ مسکرا دیا۔ اب وہ خود بھی چاہتا تو امین خان اس کے عتاب سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن سے سارے خیالات کو نکالا اور پرسکون نیند کے لئے بستر پر پھیل گیا۔

☆☆☆

جنڈ کے درخت تلے صف بچھا کر بیٹھا ہوا علی ان مزدوروں اور کاریگروں کو دیکھ رہا تھا جو کام میں مصروف تھے۔ احمد بخش ان کے ساتھ پوری طرح مگن تھا۔ جبکہ درویش بابا اپنی ڈیوٹی نبھانے کے لئے مدرسے ہی کے کسی کونے میں تھا۔ اس لمحے اسے پوری طرح احساس تھا کہ یہ کس کا سرمایہ دیواروں میں تبدیل ہو رہا ہے۔ قسمت اسے اچانک اس موڑ پر لے آئی تھی جہاں فرزانہ خود چل کر اس کی مدد کو پہنچی تھی۔ جس وقت اس نے حامد کو عندیہ دیا تھا، اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس سرمایے کے پیچھے فرزانہ بھی ہو سکتی ہے۔ علی کو بالکل افسوس نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ تو خوش تھا کہ اس کی ذات پر نہیں کسی ٹھیک مقصد کے لئے یہ پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔ کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ اسے یہی بہت خوشی تھی کہ میاں جی کی وصیت پوری کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ حامد نے کل جب کیش اسے دینا چاہا تھا، تب اس نے درویش بابا کو بلا کر پوچھا تھا۔

"درویش بابا......! مدرسے کی تعمیر کے لئے یہ صاحب رقم دے رہے ہیں۔ کیا خیال ہے میں یہ لے لوں یا شکریے کے ساتھ واپس کر دوں۔"

"کیا آپ نے یہ رقم ان سے مانگی تھی؟" درویش بابا نے پوچھا۔
"نہیں......! یہ خود ہی لے کر آئے ہیں۔" علی نے تحمل سے کہا۔
"تو پھر قبول کر لینے میں کیا حرج ہے۔ درویش مانگتا نہیں، سوائے اللہ کی ذات سے، اگر کوئی دے تو اسے قبول کرتا ہے اور اپنے پاس نہیں رکھتا۔" درویش بابا نے عام سے انداز میں فقیر کا رویہ بتا دیا۔ وہ نشانی بتادی جس سے ایک فقیر پہچانا جاتا ہے۔
"تو پھر قبول کیجیے۔ اور اپنی مرضی سے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔" علی نے درویش بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو بابا نے وہ رقم پکڑ لی۔ "آپ احمد بخش کو لے لیں اور علاقے سے مزدوروں کا بندوبست کر لیں۔"
"جیسے حکم فقیر سائیں۔" درویش بابا نے گہری سنجیدگی سے کہا اور ایک طرف کو چل دیا۔
اس وقت سے وہ ٹک کر نہیں بیٹھا تھا۔ رات گئے لوٹا تھا اور پھر فجر کے بعد ہی سے ان مزدوروں کا انتظار کرنے لگا تھا۔ علی اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا اور اسے مہرو کی طرف سے بھی اطمینان تھا کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ نہ صرف فرزانہ اس کی قدر کرے گی بلکہ کوئی تکلیف نہیں آنے دے گی۔

علی انہی سوچوں میں تھا کہ دور سے اسے گاڑیوں کا ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ یہ اس لئے بھی واضح ہو رہا تھا کہ گاڑیوں کی وجہ سے اٹھتی ہوئی دھول نے بگولے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہیں وہ راستہ بدل کر کچی بستی کی طرف چلیں جائیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا، گاڑیوں کا وہ قافلہ قریب سے قریب تر آتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حامد کی گاڑی واضح ہو گئی۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ ان کے قریب آ کر رک گئے۔ حامد کی وین کے پیچھے قیمتی جیپ تھی۔ جس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے فرزانہ باہر نکل آئی۔ قیمتی گاگلز لگائے سر کو سیاہ حجاب سے ڈھانپے، پیازی رنگ کے لباس میں ملبوس فرزانہ جب اس کے قریب آئی اس نے گاگلز اتار کر علی کو دیکھا تو علی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ پہلے والی فرزانہ ہی نہیں تھی۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ، آنکھوں کے گرد حلقے، اور سب سے بڑی بات اس کی آنکھوں میں تھی۔ وہ بے باکی، احساس تفاخر اور تیکھا پن نہیں تھا جو کبھی فرزانہ کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں حیا، دھیما پن، عاجزی اور ایک پیاس موجزن تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو کتنے ہی لمحوں تک یونہی دیکھتے رہے۔ شاید وہ بھی اس علی کو تلاش کر رہی تھی جو کبھی یونیورسٹی میں اس کا کلاس فیلو ہوا کرتا تھا، اب تو اس کے سامنے پیوند لگے کپڑوں، ٹوٹے ہوئے جوتوں، بے ترتیب داڑھی،

الجھے ہوئے بالوں والا شخص کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں بے پناہ توانائی تھی۔ ایسی توانائی جو کسی کو اندر تک دیکھ سکے۔ فرزانہ اسے دیکھ کر اندر سے لرز گئی تھی۔ اپنے گنہگار ہونے کا احساس شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے خود پر بہت قابو پایا لیکن برداشت نہ کر پائی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس آنکھوں سے اشک بن کر بہنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ فرزانہ کو معلوم تھا کہ بہت سارے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ خود کو، اپنے تعلق کو اور اپنے اس احساس کو تماشہ نہیں بنانا چاہتی تھی اس لئے آگے بڑھی اور اس نے علی کا ہاتھ تھام کر اپنے ماتھے سے لگا لیا۔ تبھی اشک علی کی ہتھیلی کی پشت پر ٹپک گئے۔

نمی کے احساس کے ساتھ ہی علی کو یوں لگا جیسے ایک صحرا کی پیاس انہیں اشکوں سے بجھ گئی ہو۔ ان اشکوں کا احساس اس کے خون کی روانی میں شامل ہو گیا۔ جیسے فرزانہ لفظوں میں اور اشکوں سے اپنا مدعا کہہ رہی ہو۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے یہی احساس اس کے پورے بدن میں سرائیت کر گیا تھا۔ بس ایک لمحے کے لئے اس نے علی کی ہتھیلی اپنے ماتھے سے لگائی تھی اور پھر اسے چوم لیا۔ علی کو لگا جیسے صدیوں کی پیاس اس کے بدن میں منتقل ہو گئی ہو۔ دو جلتے ہوئے لب، سمندر میں ڈوب کر اپنی بے تابیاں ختم کرنے کے لئے تڑپ رہے ہوں۔ بس ایک لمحے میں لمس کے احساس نے، اشکوں کی تپش نے علی تک وہ ساری بات پہنچا دی جسے کہنے کے لئے فرزانہ نجانے کتنی راتوں سے سوچ رہی تھی۔
"آؤ بیٹھو......!" علی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے صف کی جانب اشارہ کیا تو وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔ فرزانہ کے بیٹھنے کا انداز یوں تھا جیسے کوئی سالک اپنے شیخ کے سامنے زانوئے تہہ کرتا ہے۔ شاید فرزانہ نے اپنے ساتھ آئے لوگوں کو پہلے سے سمجھا دیا تھا۔ اس لئے وہاں کوئی نہیں رہا سب مدرسے کی طرف چلے گئے اور وہاں جنڈ کے درخت کے نیچے فرزانہ خاں اور علی رہ گئے۔
"کیسی ہو......؟" علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ویسی نہیں ہوں، جیسے تم چھوڑ کر آئے تھے۔" فرزانہ نے دھیرے سے کہا۔ لہجے میں نہ کوئی شکوہ تھا اور نہ شکایت، بس بھیگا ہوا لہجہ تھا۔
"کیوں......!" علی نے پوچھا تو اس نے سر اٹھایا اور بڑے تحمل سے کہا۔
"علی......! تم مجھے آدھی بات کہہ کر آئے ہو۔ اسی کا مجھے شکوہ ہے۔ ورنہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔"

''آدھی بات......!وہ کیا؟''علی نے عام سے انداز میں پوچھا۔

''تم مجھے یہ تو کہہ آئے تھے کہ میں محبت کی اہل نہیں ہوں۔ یہ آدھی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ پوری بات تو یہ ہوتی نا کہ جب تم مجھے یہ بھی بتا کر آتے کہ محبت کے لئے اہل کیسے بنتے ہیں؟'' فرزانہ کے لہجے میں قدرے تیزی آگئی تھی جیسے لفظوں کے ساتھ، انتظار کی اذیت بھی وہ اس کے سامنے رکھ دینا چاہتی تھی۔اس پر علی مسکرایا اور دھیرے سے بولا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ تم اب بھی محبت کی اہل نہیں ہوئی ہو؟''

''اللہ جانے......!یا پھر تم جانو......میری تو جو سمجھ میں آیا، میں کرتی چلی گئی۔''اس نے انجان سے لہجے میں کہا جس میں لاپرواہی ٹپک رہی تھی۔

''نہیں فرزانہ......!تم محبت کی اہل ہو، جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں، وہ تو محبت سے بڑھ کر عشق کے اہل ہو جاتے ہیں۔تمہیں معلوم ہے کہ اہل عشق کا درجہ کیا ہوتا ہے؟''علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''علی......!میں نہیں جانتی کہ محبت کیا ہوتی ہے اور اہل عشق کون ہوتے ہیں۔میرے لئے تو عشق بھی تم ہو، محبت بھی تم ہو۔ہاں مجھے پہلے یہ سمجھ نہیں تھی کہ جس سے عشق کرتے ہیں اسے اپنے معیار پر نہیں لاتے۔اسے اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھالا جاتا اور نہ ہی ان پر کوئی حکم چلتا ہے۔یہ تو اب پتہ چلا ہے کہ خود کو ان کے معیار پر لایا جاتا ہے۔ان کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھالا جاتا ہے اور ان کے حکم کا انتظار کیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ اپنا آپ بھی ان پر وار دیا جاتا ہے۔پھر بھی اس سے کوئی گلہ نہیں ہوتا۔کوئی شکایت نہیں کی جاتی وہ چاہے تو قبول کرلے اور چاہے تو نہ کرے۔''فرزانہ نے بہت ہی نرم لہجے میں دھیرے دھیرے لفظ لفظ اپنی بات کہی تو علی ایک دم سے نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔وہ دیکھ رہا تھا کہ یونیورسٹی کے کاریڈور میں پورے وقار اور انا سے چلنے والی لڑکی اس وقت ریت پر پڑی صف کے اوپر بیٹھی کس قدر نرم اور عاجزانہ لہجے میں بات کر رہی ہے۔وہ مسکرا دیا اور بڑے پیار سے بولا۔

''ہاں فرزانہ......!میں بھی محبت کی روح کو نہیں سمجھتا تھا، ہاں مگر انسان کی قدر ضرور کرنا چاہتا تھا۔میں بھی غلط تھا کہ ہندسوں میں الجھے ہوئے لوگوں سے نفرت کرتا تھا اور لفظوں کے کھیل کو حرفِ آخر جانتا تھا، لیکن یہ میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھ پر کرم کیا۔اپنا عشق دے دیا۔لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے چن لیا۔خیر......!تم بتاؤ، تم اس ویرانے میں کہاں چلی آئی۔مجھے حکم دیا ہوتا میں چلا آتا۔''

''نہیں علی......!حکم دینے والی فرزانہ کب کی دفن ہو چکی، اب تو حکم ماننے والی فرزانہ ہے یہ حکم چاہے میرے اللہ کا ہو، میرے نبی ﷺ کا ہو یا پھر اس کا جس نے مجھے یہ راہ دکھائی ہے۔باقی رہا یہاں آنے کا سوال تو میں اسے لئے آئی ہوں علی......!مجھے بتاؤ محبت کے لئے اہل کیسے بنتے ہیں۔میں محبت کے لئے خود کو اہل ثابت کرنا چاہتی ہوں۔''

''اللہ رب العزت......!جب کسی کو عشق کے لئے چن لیتا ہے نا تو اس بندے کو خود احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اہل تھا اس لئے اسے چنا گیا۔اب یہ بندے پر ہے کہ وہ خود کو اہل ثابت کر سکتا ہے یا نہیں۔تمام تر عنایات اور توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے وہ جسے جتنا چاہے دے دے۔''علی نے کہا تو فرزانہ کتنی دیر تک خاموش رہی۔وہ سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہی تھی۔پھر دھیرے سے اس نے سر اٹھایا اور بولی۔

''علی......!میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں تمہاری گنہگار ہوں۔میں اگر غلط نہ سوچتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔تم اس ویرانے میں نہ پڑے ہوتے اور میں یوں اس ویرانے میں تمہارے سامنے شرمندہ ہو کر نہ بیٹھی ہوتی۔میری ایک بات مانو گے؟''

''کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔''علی نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے معاف کر دو......!میرے یہاں آنے کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ تم سے معافی مانگوں اور اپنی بے چین روح کو پرسکون کروں۔کیا تم مجھے معاف کر دو گے۔''فرزانہ نے انتہائی بے چارگی سے کہا تو علی دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔

''میں نے تمہیں اس دن معاف کر دیا تھا جب عشق کی پہلی چنگاری میرے من میں بھڑکی تھی یا شاید اس سے بھی پہلے۔عشق وہاں آ ہی نہیں سکتا، جہاں پر تعفن ہو۔بغض، منافقت حرص اور لالچ یہ سب تعفن ہی تو ہیں۔عشق کو زندگی ملتی ہے پاکیزگی سے۔میں نے تمہیں یونیورسٹی کے کاریڈور میں بھی کہا تھا کہ میں نے سب کو معاف کر دیا ہے۔تمہاری بے چینی ختم ہو جانی چاہیے۔تم اپنی روح کو پرسکون کرلو......!میں نے تمہیں معاف کیا۔''

''نہیں علی......!تم نے مجھے پورے دل سے معاف نہیں کیا، لیکن تم کہتے ہو تو میں مان لیتی ہوں۔مجھے سکون نہیں آئے گا۔میں نہ چاہتے ہوئے بھی بے چین رہوں گی۔ایسا کیوں ہے میں اس وقت تم سے قطعاً ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔بس ایک درخواست کروں گی کہ تم سوچنا، میں نے ایسا کیوں کیا کہ تم نے مجھے پورے دل سے معاف نہیں کیا۔''

''پاگل ہو تم......!''علی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بات بدلتے

ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بتاؤ......! مہرو کا دل لگ گیا ہے وہاں پر، کیا محسوس کر رہی ہے وہ۔''

''بہت معصوم اور بھولی ہے مہرو۔ مجھے تو بہت اچھی لگی ہے۔ میں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے لئے ڈھیر سارے کپڑے خریدے اور......'' بڑے مزے سے کہہ رہی تھی کہ علی نے ٹوک دیا۔

''تمہیں کیا الہام ہو گیا تھا اس کے سائز کا؟'' علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں......! سیل فون جدید الہام ہی ہے۔ میں نے حامد کے ساتھ آئی روبینہ سے پوچھا تھا۔ خیر......! جب وہ آئی تو میں نے وہ ساری شاپنگ اسے دی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ میں نے دفتر کے ہی اوپر والے پورشن میں اسے ٹھہرایا ہے۔ دو خادمائیں اس کے لئے مخصوص کر دی ہیں۔ جو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ اور وہ......! نماز، تلاوت اور ذکر و اذکار کے علاوہ کوئی اور کام ہی نہیں کرتی ہے۔ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ تھوڑی سی کھسکی ہوئی ہے۔'' فرزانہ نے عام سے لہجے میں کہا تو علی نے بولا۔

''وہ ڈوب چکی ہے، اپنے ہی من میں ڈوب گئی ہے۔ سمجھ لو کہ وہ چکوری ہے اور چاند کی چاہ میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ خیر......! تم اس کا بہت خیال رکھنا۔ میں شاید اسے تمہارے پاس نہ بھیجتا لیکن یہاں کا ایک بہت ہی طاقتور آدمی اس کی جان اور عزت کے درپے ہے، اس لئے......''

''اس نے بھولپن میں ہی سہی، لیکن بہت کچھ بتا دیا ہے۔'' فرزانہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسی لمحے درویش بابا آ گئے۔ اس کے ہاتھ میں تازہ ٹھنڈا کیا ہوا دودھ تھا۔ وہ اس نے فرزانہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹی......! تمہارے شایان شان تو ہمارے پاس یہی ایک نعمت ہے۔ قبول فرماؤ۔'' بابا نے کہا تو اس نے بسم اللہ کہہ کر وہ پیالہ تھام لیا۔ پھر ایک لمبا سا گھونٹ لے کر بولی۔

''علی......! یہ یاد رکھنا کہ مجھے جاتے ہوئے سانول کی قبر پر فاتحہ ضرور پڑھنی ہے۔''

فرزانہ کے یوں کہنے پر علی چونک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مہرو نے انجانے میں اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر خم تسلیم کیا تو فرزانہ کو اس پر بہت پیار آیا، مگر وہ اس کا اظہار نہ کر سکی اور جلدی سے پیالہ منہ کو لگا لیا۔ چند گھونٹ میں اس نے پیالہ خالی کیا اور پھر علی کے ساتھ مدرسہ دیکھنے کے لئے چل دی۔ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہنے کے بعد وہ بولی۔

''جتنا میں نے سوچا تھا، یہ تو اس سے بھی کم خرچ میں تعمیر ہو جائے گا۔ علی......! تم ایسا کرو، دو گنے مزدور اور لگا دو۔ جتنی جلدی یہ کام ختم ہو جائے اچھا ہے۔''

''تمہیں اس کام کے جلدی ختم ہو جانے میں کیا دلچسپی ہے۔'' علی نے عام سے انداز میں پوچھا۔

''کہنے کو تو میں بہت ساری باتیں کہہ سکتی ہوں۔ یہ کہ جتنی جلدی کام ختم ہو جائے اچھا ہے، بچے جلدی پڑھنا شروع کر دیں گے۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب یہ کام ختم ہو جائے گا تو میں پھر سے آؤں گی، تاکہ تم سے ایک بات پوچھ سکوں۔'' فرزانہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو علی خاموش رہا۔ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر درویش بابا کو بلا کر کہا۔

''میڈم کی یہ خواہش ہے کہ یہاں مزدوروں اور معماروں کی تعداد جس قدر بڑھائی جا سکے، بڑھا دیں۔ اور جتنی جلدی کام ختم ہو سکتا ہے ختم کریں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی......! جیسا حکم ہے، ویسا ہی ہوگا۔'' درویش بابا نے کہا تو فرزانہ بولی۔

''دل تو نہیں چاہتا کہ یہاں سے جاؤں، لیکن دفتر کے وقت میں ہی مجھے واپس جانا ہوگا۔ ورنہ بابا سائیں کے سامنے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے یہاں آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔''

''ہاں......! تمہارا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' علی نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی سی دیر میں سب جمع ہو گئے۔ قافلہ واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ علی نے احمد بخش کو ساتھ بھیج دیا تاکہ وہ سانول کی قبر کے بارے میں بتا سکے۔ اس وقت ظہر ہو گئی تھی۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ علی اس وقت تک انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

☆☆☆

اس وقت شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ دو دن سے حویلی میں سیدن شاہ نہیں تھا۔ ان دو دنوں میں مریدین کے علاوہ علاقے کے بہت سارے لوگ اسے ملنے کے لئے آئے تھے ہر آنے والے کو یہی پتہ ملتا تھا کہ سیدن شاہ سائیں حویلی میں نہیں ہیں بلکہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ اس کے مریدین تو زیارت کے لئے آ رہے تھے لیکن علاقے کے لوگ اس خبر کی تصدیق کرنے اور وجہ معلوم کرنے کے لئے آ رہے تھے کہ پیر سیدن شاہ نے اچانک استعفیٰ کیوں دے دیا۔ ظاہر ہے وہ لوگ جنہوں نے الیکشن میں سیدن شاہ کا ساتھ دیا تھا، ان میں تو بے چینی پھیلنا ہی تھی۔ ان لوگوں کے مفادات وابستہ تھے۔ انہیں یہ تجسس تھا کہ آخر ایسی کیا مجبوری بن گئی جو سیدن شاہ نے استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ خان محمد کے قتل کے ساتھ ہی یہ افواہ پورے علاقے میں پھیل گئی تھی کہ یہ سب پیر

سائیں کے ایماء پر ہوا ہے۔ لیکن جتنے لوگ یہ افواہ اڑانے والے تھے، اتنے ہی اس افواہ کو غلط قرار بھی دے رہے تھے۔ یوں کوئی صحیح صورت حال ان پر واضح نہیں تھی۔ وہ لوگ آئے مگر گومگو کی کیفیت میں مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس بار جب وہ شہر گیا تھا تو پیراں دتے کو حویلی میں چھوڑ گیا تھا۔ ایک طرح سے وہ تنہا ہی شہر گیا تھا، اس کے ساتھ محض چند گارڈ ہی تھے۔ شہر میں اس کی کیا مصروفیات تھیں یہاں حویلی میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پیراں دتہ ایک لمحے کے لئے بھی حویلی سے نہیں گیا۔ اس شام جب کہ سورج غروب ہونے کو تھا، پیراں دتہ باہر کاریڈور میں بیٹھا ہوا لاشعوری طور پر سیدن شاہ کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اس کا اندازہ درست نکلا، آفتاب کے غروب ہونے کے ساتھ ہی بڑے گیٹ سے سیدن شاہ کی گاڑی اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ پیراں دتہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ اور جس وقت گاڑی پورچ میں رکی، وہ تقریباً بھاگتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے لپکا۔

"ہر طرح سے خیر خیریت ہے نا۔" سیدن شاہ نے زمین پر پاؤں رکھتے ہی پیراں دتے سے پوچھا اور پھر سیدھا ہو کر حویلی کی طرف چل دیا۔ تبھی پیراں دتہ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"حویلی میں ہر طرح سے خیریت ہے۔ آپ کی دعا سے ایک پتہ بھی نہیں ہلا۔"

"کوئی اور خبر......!" سیدن شاہ نے پوچھا اور حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

"پیر سائیں......! ایک بہت ہی اہم خبر ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"وہ کیا۔" سیدن شاہ صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سائیں......! آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ علی کے پیچھے کوئی ہے۔ اس کی تصدیق کل ہو گئی ہے۔"

"کون ہے؟" سیدن شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"وہی سردار امین خاں......! کل اس کی بیٹی یہاں پر آئی تھی۔ کافی دیر تک وہ یہاں رہی ہے۔ اس نے جس طرح مدرسے کا معائنہ کیا ہے، اس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مدرسہ وہی بنوا رہے ہیں۔" پیراں دتہ نے تفصیل بتائی تو سیدن شاہ نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پہلے یہ کام وہ خاں محمد سے کروانا چاہ رہا تھے۔ اور اب سیدھے خود ہی یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس کی بیٹی نے کوئی فلاحی تنظیم بنائی ہے۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو پیراں دتہ فوراً بولا۔

"پیر سائیں......! پھر حکم دیجیے۔ میں ابھی علی والا معاملہ صاف کراتا ہوں۔"

"اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" سیدن شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "خاں محمد والے معاملے پر ہمیں نقصان ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے انہوں نے کیا سازش تیار کی ہوئی تھی۔ اب جو انہوں نے ایک آسان شکار سامنے رکھا ہوا ہے، جب تک اس کی پوری سمجھ نہیں آ جاتی، کچھ نہیں کرنا، اور پھر......! ممکن ہے اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" سیدن شاہ نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا اور پھر فون لانے کے لئے کہا۔ ذرا سی دیر میں فون اس کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ اس نے نمبر ملائے اور رابطہ ہو جانے پر ہنستے ہوئے بولا۔

"جی میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں...... ہاں جی......! فون میں نے اس لئے بھی کیا ہے کہ یہاں آتے ہی ایک بڑی دلچسپ خبر سننے کو ملی ہے...... ہاں میں نے سوچا کہ وہ خبر میں آپ کے ساتھ شیئر کر لوں...... خبر یہ ہے کہ اپنے سردار امین خاں کی صاحبزادی نے اپنی فلاحی تنظیم کا کام میرے ہی علاقے سے شروع کیا ہے...... ابھی معلوم ہوا ہے۔ ممکن ہے انہیں پتہ چل گیا ہو کہ میں یہاں پر نہیں ہوں...... خیر کوئی بات نہیں، میں انتظار کروں گا...... جی ہاں میں خوشخبری کا انتظار کروں گا۔ اب یہ ذمے داری آپ کی ہے اور مجھے آپ پر یقین ہے...... ٹھیک ہے آپ جب چاہے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اللہ حافظ......۔" سیدن شاہ نے بات ختم کی اور فون رکھ دیا۔ پیراں دتہ اس کی جانب بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا پیر سائیں یونہی دو دن شہر میں نہیں رہا بلکہ کوئی بہت ہی اہم ذمہ داری کسی کو دے آیا ہے۔ یہ تو ممکن یہ نہیں تھا کہ کوئی سیدن شاہ کو نقصان پہنچا جائے اور وہ اس سے بدلہ نہ لے۔ پیراں دتہ اسے بچپن ہی سے جانتا تھا۔ سیدن شاہ ہر بات دل میں رکھتا تھا، جلد یا بعد میں جب بھی اسے موقعہ ملتا وہ بدلہ لے لیتا۔ سردار امین خاں نے جو ایک گہری سازش سے سیدن شاہ کو نقصان پہنچایا تھا، اس کے لئے وہ کبھی بھی اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ پیراں دتہ کی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ پوچھ سکے۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ اس سے بات ضرور کرے گا۔ اس لئے اپنے اندر کے تجسس کو دبائے وہ خاموش کھڑا رہا۔ جب کافی دیر تک خاموشی رہی تو اس نے پوچھا۔

"پیر سائیں، میرے لئے کوئی حکم......!"

"کچھ نہیں، تم جاؤ، آرام کرو......! میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے یہ دو دن بہت مصروفیت میں گزرے ہیں۔ رات بھی اچھی طرح نہیں سو سکا تھا۔ اور ہاں......! کل صبح عرس کی تیاریوں کے بارے میں پوچھوں گا۔ اب جاؤ۔" سیدن شاہ نے کہا اور اپنے کمرہ خاص کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ پیراں دتہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں صرف مہرو چھائی ہوئی تھی۔ جس

کا وہ اظہار نہیں کر پایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہرو کی بات کر کے سیدن شاہ کے زخم کو چھیڑے وہ اسے شہر تک ڈھونڈنے کا حکم دے دے۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ مہرو یوں غائب نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہ اسے علی نے چھپایا ہوگا۔ اس کا شک یقین میں اس وقت بدلا تھا جب امین خاں کی بیٹی علی کے پاس آئی تھی۔ وہ دل میں مسوس کر رہ گیا۔ پھر صبح بات کرنے کا سوچ کر حویلی سے نکلتا چلا گیا۔ مہرو اس کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی مانند نکل چکی تھی۔

☆☆☆

اس رات سردار امین خاں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے سامنے حالات بہت الجھ گئے تھے۔ فطری سی بات ہے کہ بگاڑ یا تخریب بڑی آسان ہوتی ہے، کوئی بھی شے توڑنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے بہ نسبت اس کے تعمیر کرنے میں۔ بناؤ اور تعمیر مشکل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ امین خاں نے اگر سیدن شاہ کو نیچا دکھانے کے لئے بڑی محنت اور صبر سے کام لیا تھا۔ اس نے جو سوچا تھا وہ ہو بھی گیا تھا لیکن اس کے نتائج پر اس کی نگاہ نہیں تھی۔ سیدن شاہ وا سہنے کے بعد بالکل ہی خاموش ہوگیا تھا۔ امین خاں کو یہی خاموشی بہت کھل رہی تھی۔ یہ خاموشی اسے ایسے ہی محسوس ہو رہی تھی جیسے سمندر میں طوفان آنے سے پہلے خاموشی ہوتی ہے۔ اگرچہ استعفیٰ سے ضمنی الیکشن تک کا سارا پراسس اس پر واضح تھا۔ اب دنوں کی بات تھی کہ وہ رکن اسمبلی منتخب ہوسکتا تھا، لیکن اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ اس بار وہ سامنے نہ آئے۔ وہ مقامی اور مرکزی سیاست کو بخوبی سمجھتا تھا، جس طرح اس کا اپنا ایک حلقہ تھا، اس طرح سیدن شاہ کا بھی تھا۔ یہ خبر ان حلقوں میں نہ صرف بہت تیزی سے پھیلی تھی بلکہ اس پر بڑا تیز تبصرہ ہوا تھا۔ ان سب کا مجموعی تاثر یہی تھا کہ اخلاقی طور پر یہ اچھا نہیں ہوا۔ ایک غبار کی طرح یہ تاثر اس کے اردگرد پھیل گیا تھا۔ جس میں واضح سوچ سامنے نہیں آرہی تھی۔

شہ مات کے لئے شطرنج کی بساط پر مہرے پٹوا دینا ایک الگ بات ہے جبکہ سیاست کے میدان میں کامیابی کے حصول اور مفادات کی جنگ میں اپنے ہی ساتھیوں کی قربانی دینا بالکل الگ حقیقت ہے۔ تکلیف تو اسے ہوتی ہے جس پر وار ہوتا ہے۔ خان محمد کا قتل اگرچہ سیدن شاہ کی ہزیمت کا باعث بن گیا تھا لیکن اسے جس طرح امین خاں نے استعمال کیا تھا وہ بہرحال اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہی نہیں بلکہ خون کا سودا کر دینے والی بات تھی۔ فدا حسین ایک ایسا شخص تھا جو خان محمد کے قریبی ساتھیوں اور جانثاروں میں سے ایک تھا۔ وہ اسی دن شک میں پڑ گیا تھا جب رفاقت باجوہ نے بڑی چالاکی سے مجرموں کو چھپا لیا تھا اور نامعلوم قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر

درج کروائی تھی۔ اس نے اپنے اس شک کا اظہار کئی بار رفاقت باجوہ سے کیا تھا اور ہر بار اسے یہی باور کرایا جاتا رہا کہ سیدن شاہ جو کہ اصل قاتل ہے اسے کس طرح سلاخوں کو پیچھے لایا جائے گا۔ اس کا یہی ایک واحد راستہ ہے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہی فدا حسین آج دوپہر امین خاں سے ملا تھا، اس کے لہجے میں موجود آگ کی تپش اس نے محسوس کر لی تھی۔

''ٹھیک ہے خان صاحب......! آپ بڑے آدمی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے خان کی موت کا آپ سودا کر لیں اور ہم خاموش رہیں۔ مجھے ساری کہانی کی سمجھ آگئی ہے کہ آپ نے کیا کیا ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو، میرا اس میں کیا عمل دخل۔'' امین خاں نے واضح جھوٹ بول دیا۔

''پانی ہمیشہ جڑوں سے لگتا ہے، اوپر سے آنے والے پانی کا اعتبار نہیں ہوتا خان صاحب......! مجھے پتہ ہے کہ اب کوئی نہ کوئی انجانی گولی میرا کام تمام کر دے گی، اور میں اس گولی کا اب انتظار کروں گا، میں اپنے خان کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔'' فدا حسین نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''دیکھو......! میں مانتا ہوں کہ خان محمد میرا ساتھی تھا، سیاست میں ایسے لوگ اپنے مفادات کے لئے ساتھ دیتے ہیں۔ کوئی احسان نہیں کرتے۔ وہ اگر مارا گیا ہے اور اس کے قاتل فرار ہو گئے ہیں تو یہ دھمکیاں مجھے کیوں دے رہے ہو۔'' امین خاں نے اسے جواب دیتے ہوئے عام سے انداز میں کہا۔

''ایسا ممکن نہیں کہ پانی آپ کے پلوں کے نیچے سے نہ ہو کر گزرے۔ آج آپ کا چہرہ واضح نہیں ہے تو کل ہو جائے گا۔ اگر ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ نے ہمارے خان کے خون کا سودا کیا ہے تو ہم انتقام لیں گے۔''

''وہ وقت کبھی نہیں آئے گا فدا حسین۔ تم اگر چاہتے ہو کہ خان محمد کے قاتل پکڑے جائیں۔ انہیں واقعی ہی سزا ملے تو مجھ پر اپنی توانائی ضائع مت کرو۔ اس کے اور بہت سارے راستے ہیں۔ مجھے بتاؤ میں کیا تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم مجھے دھمکیاں دو گے تو میں تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کروں گا۔''

''بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے خان صاحب، جب ہر چیز واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔ اس میں اگر آپ ننگے ہو گئے تو پھر مجھے الزام مت دیجیے گا۔'' فدا حسین نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے الوداعی رسمی جملے کہنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ یہ اس کی نفرت کا اظہار تھا۔

فدا حسین کے چلے جانے کے بعد امین خان کو ایک انجانے خطرے نے گھیر لیا۔ پتہ نہیں وہ انتقام لینے کی قوت رکھتا بھی تھا یا نہیں، لیکن امین خان کے سر پر تو ایک تلوار لٹک گئی تھی۔

سیدن شاہ کے استعفیٰ دے دینے سے مقامی سیاست میں تھوڑی بہت ہلچل ہوئی تھی لیکن مرکزی طور پر کچھ زیادہ تبدیلی محسوس نہیں کی گئی۔ سیدن شاہ حکومت میں شامل تھا۔ وہ انہیں ہر طرح سے مطمئن کر سکتا تھا، وہاں پر اس کی ایک اہمیت تھی، لیکن امین خان اپوزیشن پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ بالفرض محال وہ رکن اسمبلی بن بھی جاتا تو کیا ہوتا تھا؟ کچھ فرق نہیں پڑنے والا تھا ہاں مگر اتنا تھا کہ اس کے نام کے ساتھ رکن اسمبلی کا سابقہ یا لاحقہ لگ جاتا۔

ایک اور اہم پہلو اس کی بے چینی کا سبب یہ تھا کہ اب جبکہ وہ سیدن شاہ پر وار کر چکا تھا۔ اب اسے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ سیدن شاہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو کسی کو معاف کر دیں۔ اس نے وار کا بدلہ لینا ہی تھا، کیسے لیتا تھا؟ یہ اس کے گمان میں نہیں تھا۔

امین خاں کے ذہن میں سب کچھ تھا، اسے بے چینی بھی تھی، وہ خطرات میں بھی گھر گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ حوصلہ ہار جاتا، یا خوف کے مارے میدان خالی کر دیتا۔ اسے میدان میں رہنا تھا، مقامی سیاست پر اس کی گرفت تھی۔ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کے ملازم نے اللہ بخش کے آنے کی اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر بعد اللہ بخش بغل میں فائلیں دبائے آ گیا۔ اور آتے ہی سلام کے بعد کہا۔

”سائیں......! اس وقت آنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن ایک ضروری اطلاع دینا چاہتا تھا۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے اللہ بخش؟“ امین خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات یہ ہے سائیں کہ آپ نے چھوٹی بی بی سیئن کو اتنا فری ہینڈ دے دیا ہے کہ وہ جو چاہے سو کر سکتی ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا اللہ بخش، جو کہنا ہے کھل کر کہو۔“

”سائیں......! شہر کی حد تک تو ٹھیک ہے وہ جو مرضی کرتی رہیں لیکن روہی میں......“

”ہاں......! روہی میں اس نے ایک پراجیکٹ شروع کیا ہے۔“ امین خاں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیا روہی میں جانے کی اجازت بھی دی ہے آپ نے؟“ اللہ بخش نے اپنی بات کہہ دی۔

”کیا مطلب! فرزانہ روہی میں گئی تھی۔“ اس نے انتہائی حیرت سے کہا

”صرف روہی میں نہیں بلکہ اس علاقے میں گئیں تھیں جو سیدن شاہ کا مخصوص علاقہ ہے۔ وہاں تو اس کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ خدانخواستہ......“ اللہ بخش کہتے کہتے رک گیا تو امین خاں کی نہ صرف آنکھیں پھیل گئیں بلکہ وہ ایک لمحے کے لئے تڑپ کر رہ گیا۔ وہ خاموش رہا تو اللہ بخش نے پوری تفصیل بیان کر دی کہ وہ پراجیکٹ دیکھنے وہاں تک چلی گئی تھیں۔ اس ساری کہانی میں اللہ بخش کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ تو علی کی چاہ میں کھینچی چلی گئی تھی۔

”نہیں......! فرزانہ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔“ امین خاں نے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اسے لگا جیسے ایک طوفان آ کے گزر گیا ہو۔ پھر اللہ بخش کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ہاں......کوئی اور بات۔“

”نہیں سائیں......! مجھے یہ بات ابھی معلوم ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے آپ کے گوش گزار کر دی۔“

”اچھا کیا۔“ امین خاں نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اللہ بخش چلا گیا تو وہ سوچنے لگا کہ فرزانہ کو کس طرح سمجھایا جائے کہ وہاں جانا اس کا ٹھیک نہیں۔ اس نے صبح ہی اس سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

جنڈ کے درخت سے ذرا فاصلے پر کچی مسجد کے خدوخال واضح ہو چکے تھے۔ اس کی چھت پڑ چکی تھی اور صحن بھی ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس دن صبح فجر کے وقت ایک اور نمازی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ معمار تھا جو وہیں رات رہ گیا تھا۔ اور صبح فجر کی نماز اس نے ان تینوں کے ساتھ ہی پڑھی تھی۔ مشرقی افق نارنجی ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے میں احمد بخش نے کہا۔

”علی بھائی......! الحمدللہ......! مسجد کی تعمیر تقریباً مکمل ہو گئی ہے اور اب ساری توجہ مدرسے پر ہو گی۔ پتہ نہیں یہ کب مکمل ہو گا۔“

”جب بھی اللہ کو منظور ہوا ہو جائے گا، مگر اس وقت تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں آیا۔“ علی نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"اس بار کافی دن ہو گئے ہیں کام مسلسل ہو رہا ہے، سیدن شاہ کے کسی بندے نے آ کر رکاوٹ نہیں ڈالی۔ کیا انہیں خبر نہیں ہے یا......" احمد بخش کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"انہیں خبر ہے۔ لیکن وہ اب کچھ نہیں کر پائیں گے۔ بات یہ نہیں ہے کہ میرے بھائی کہ اس میں کسی بندے کا کمال ہے، نہیں، بلکہ میرے اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بہت کچھ کیا، ہم نے صبر کیا۔"

"لیکن ان کی طرف سے اتنی خاموشی کیوں ہے؟ انہوں نے اپنے علاقے میں کبھی کوئی تعلیمی ادارہ نہیں بننے دیا اور اگر بن بھی گیا تو اسے تالا لگوا دیا ہے۔ یہاں پڑھنے کون آئے گا۔" احمد بخش کے لہجے میں عجیب طرح کی بے چینی تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"کیوں گھبراتے ہو بابا......!" درویش بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا یہی جگہ ویران اور سپاٹ نہیں تھی۔ اس جگہ میاں جی جیسے بزرگ دفن ہو گئے۔ میٹھے پانی کا کنواں موجود ہے، مسجد بن گئی۔ ہم یہاں پر بیٹھے ہیں تو یہاں بچے بھی پڑھنے آئیں گے۔ تم دیکھ لینا، ایک دن ایسا آئے گا جب تم سے ان کا انتظام نہیں ہو پائے گا۔ تم ان کی خدمت کرتے کرتے تھک کر چور ہو جایا کرو گے۔" درویش بابا نے مستقبل کا نقشہ پیش کیا تو علی بھی مسکرا دیا۔ پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"نعمت یہ نہیں ہے کہ رزق کی فراوانی ہو جائے۔ طاقت اور قوت میں ہم بڑھ جائیں۔ یہ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ جہاں رزق کی ضرورت ہے رزق مانگنا چاہیے۔ جہاں قوت کی ضرورت ہو وہاں نہ صرف قوت مانگنی چاہیے بلکہ اس کے استعمال کی توفیق بھی مانگنی چاہیے۔ یہ ایک طرح کی نعمتیں ہیں۔ لیکن کچھ نعمتیں ایسی بھی ہیں جن پر ہماری نگاہ بہت کم جاتی ہے۔ ابھی جیسے میں نے کہا تھا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تو کیا یہ نعمت کم ہے کہ اللہ کا ساتھ ہمیں مل رہا ہے۔ شرط ہے صبر کی۔ جب اللہ کے لئے صبر کیا جائے تو پھر معاملہ خود اللہ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اصل میں ہم بنیادی باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتے ہم میں سے کتنے لوگوں کو پتہ ہے کہ آخر صبر ہے کیا؟"

"اس کا مطلب ہے، ہم کوئی کوشش ہی نہ کریں۔ کوئی ہمارے تھپڑ مار دے تو کیا ہم صبر کیے بیٹھے رہیں، اسلام یہ بات تو نہیں سکھاتا۔" معمار نے تنگ کر کہا۔

"بے شک اسلام میں بدلہ لینے کا پورا پورا حق موجود ہے لیکن معاف کر دینے والے کو افضل گردانا گیا ہے۔ آپ شاید میری بات پوری طرح نہیں سن پائے۔ میں نے کہا تھا کہ اللہ کے لئے صبر کرنا، اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ کوشش نہ کریں۔ مسلسل کوشش میں لگے رہنا بھی تو صبر ہے۔ مقصد کیا ہے آپ کا؟ اگر آپ کا مقصد اللہ کی رضا ہے تو اس کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں پر

صبر کریں۔ ذرا سی سمجھ کا فرق ہے، صبر اس وقت کیا جاتا ہے جب بے بسی ہو۔ کوششیں بارآور نہ ہوں۔ پھر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اسی سے مدد چاہنا صبر ہے۔ میرا تو یقین ہے کہ اللہ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔" علی نے کہا تو وہ معمار سر ہلانے لگ گیا جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ لیکن علی کہتا چلا گیا۔ "اصل معاملہ دل کا ہے، کیا وہ اللہ کی رضا پر راضی ہے؟ یہ یقین ہے کہ اس کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں، مصیبتوں کا اجر ہے۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہوا تو درویش بابا نے کہا۔

"فقیر سائیں......! یہ دل کا معاملہ کیا ہے؟"

"دل......!" علی نے یوں کہا جیسے اس موضوع پر سوچنا ہی اسے لطف دے دیا ہو۔ وہ مسکرا دیا تو درویش بابا نے کہا۔

"ہاں ہاں دل......! کیا حقیقت ہے اس کی؟"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دل وہ ہوتا ہے جو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور ہمارے بدن کے اندر دھڑک رہا ہے؟"

"بظاہر تو یہی بات ہے فقیر سائیں، ہم اسے ہی دل کہتے ہیں۔" درویش بابا نے کہا۔

"تو من کیا ہے؟" علی نے کہا اور پھر لمحہ بھر کو توقف کیا، وہ سب خاموش رہے۔ تو علی نے کہا۔ "میرے نزدیک من، دل یا قلب ایک ہی چیز ہیں ٹھیک ہے گوشت کا لوتھڑا دھڑک رہا ہے، وہ ٹھیک ہے تو سارا صبر ٹھیک ہے۔ اسی طرح اگر من میں پاکیزگی ہے۔ یعنی دل ہے تو سب ٹھیک ہے۔ اصل معاملہ ہے ہی دل کا، روحانی مقام ہو یا انسانی معاملات، ان کا منبع دل ہی ہے۔ جو دل کی حقیقت کو سمجھ گیا، وہی مراد پا گیا۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب دل ہی کسی کا ہو گیا تو پھر اپنے پاس کیا بچا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا وہ دل قابل احترام ہوتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" علی نے الجھتے ہوئے کہا۔

"فرض کریں، میرا دل آپ پر آ گیا۔ میری حیثیت تو کچھ بھی نہ رہی۔ کیا آپ میرے دل کا احترام کریں گے؟ درویش بابا نجانے اسے کون سی بات سمجھانا چاہ رہے تھے۔"

"ہاں......! وہ دل محترم ہے جو کس کے لئے دھڑکتا ہے۔"

"تو بس میں یہی بات کہنا چاہ رہا تھا، آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔" درویش بابا نے ایک خاص لہجے میں کہا تو علی چونک گیا۔ درویش بابا بہت پتے کی بات کہہ گئے تھے۔ وہ ایک سمت دے گئے تھے جس پر علی کو سوچنا تھا۔ اس سے پہلے کہ علی کوئی بات کرتا، درویش بابا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تو چلوں......!ابھی دوست آنے والے ہوں گے۔"

درویش بابا اشارے میں بہت نکتے کی بات کر گیا تھا۔

☆☆☆

اس وقت دوپہر ہونے کو تھی۔ موسم کی تبدیلی کے باعث ان دنوں تپش اتنی نہیں تھی جیسے کہ روہی کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا۔ اس دن آسمان بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے موسم خوشگوار تھا۔ اس لئے سیدن شاہ کا مزاج بھی اچھا تھا۔ وہ علی الصبح اپنے باپ کے مزار پر گیا تھا جو اس کی حویلی سے قدرے فاصلے پر آبائی قبرستان میں واقع تھا۔ وہاں پر ہر سال عرس کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ جو تین دن تک رہتا تھا۔ اس دوران بہت ساری رسمیں ہوتی تھیں، جن میں گدی نشین کا ہونا بہت ضروری ہوتا تھا۔ سیدن شاہ چونکہ گدی نشین تھا، اس لئے رسموں میں شمولیت سے لیکر تمام انتظامات اسی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہ عرس ایک طرح سے اس کی سیاسی طاقت کا اظہار بھی ہوا کرتا تھا۔ ان تین دنوں میں پورے علاقے سے مریدین اور زائرین کی تعداد کے علاوہ پورے علاقے کے معززین کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔ خصوصاً سرکاری مشینری کے تمام اہم لوگ یہاں ضرور آتے تھے۔ اس بار سیدن شاہ کو تھوڑی محنت کی ضرورت تھی۔ وہ رکن اسمبلی نہیں رہا تھا اور شہر کی مقامی سیاست پر امین خاں کی گرفت تھی۔ یوں انتظامات میں وہ سرکاری مشینری کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ عرس کے معاملات میں اسے پریشان کا سامنا تھا۔ ورنہ پہلے وہ چند لوگوں پر وہ معاملات چھوڑ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔

عرس کی تقریبات شروع ہونے میں محض دو ہفتے رہ گئے تھے۔ وہ کام جو چند دن پہلے ہو جانے چاہیں تھے وہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ خان محمد کے قتل کے بعد وہ پے در پے معاملات کی وجہ سے چکرا کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ اس قدر مضبوط اعصاب کا آدمی ایسے معاملات کو اہمیت ہی نہیں دیتا تھا۔ ایسے ہی گزشتہ رات وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو گیا ہوا ہے؟ کہیں وہ بوڑھا تو نہیں ہو گیا جو اس کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں اور سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا لیکن اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ آج جب وہ مزار پر گیا تھا تو اس کے ساتھ حویلی کے ملازمین کے علاوہ علاقے کے معززین کی بھی کافی تعداد تھی۔ وہیں مزار کے احاطے میں ہی بیٹھ کر طے ہوا تھا کہ کس نے کیا انتظام کرنا ہے۔ عرس کی تقریبات کے سلسلے میں شروعات اچھی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گزشتہ رات والی سوچ پر مسکرایا بھی تھا کہ وہ ابھی ایسا نہیں ہوا، بس حالات کے دباؤ نے ہی اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ خاص میں

بیٹھا یہ سب سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے تو اپنے بیٹے قاسم شاہ کو فون کرنا تھا۔ اس نے قریب پڑے ہوئے فون کو اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں رابطہ ہو گیا۔ قاسم شاہ ابھی تک سو رہا تھا۔ رسمی سی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم لوگوں کے آنے کا پروگرام کب تک ہے۔"

"بابا سائیں......!ابھی تو پورے دو ہفتے پڑے ہیں عرس میں، آجائیں گے ایک دن پہلے۔" قاسم شاہ نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"نہیں، جس قدر جلدی ممکن ہو سکے تم لوگ آجاؤ، سیٹیں بک کروالی ہیں تم نے؟" سیدن شاہ نے پوچھا۔

"بس ایک دو دن میں ہو جائیں گی۔" قاسم شاہ نے اختصار سے کہا۔

"نہیں، اس دفعہ تم نے ایسا نہیں کرنا، تم فوراً چلے آؤ۔ اور یہ ذہن میں رکھ کر آنا کہ تمہیں کم از کم تین ماہ یہاں رہنا ہے۔"

"بابا سائیں......!یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو، وہاں کے اپنے سارے معاملات سمیٹ کر آنا۔ تمہاری ماما اور بہن چاہیں تو چند دن بعد آسکتی ہیں، لیکن تم فوراً آجاؤ۔"

"بابا سائیں......! آپ مجھے بتائیں گے نہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے خیریت تو ہے نا، آپ کا حکم ہے تو میں پہلی ملنے والی فلائٹ سے آجاتا ہوں لیکن پلیز بابا سائیں، مجھے کچھ تو پتہ چلے۔" قاسم شاہ نے پریشانی سے کہا۔

"دیکھو بیٹا......! کچھ سیاسی معاملات ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے استعفیٰ دینا پڑا اور میں نے وہ دے دیا۔ استعفیٰ قبول بھی ہو چکا ہے۔ ایک آدھ دن میں نیا شیڈول آنے والا ہے الیکشن کا۔ اب ایسا تو نہیں ہے کہ ہم اپنی آبائی نشست کھو دیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔ لیکن یہ نہیں کہا کہ میرے خاندان سے کوئی الیکشن نہیں لڑے گا۔ تم آؤ۔ اور آکر رابطے کرو، میں عرس میں مصروف ہوں۔ اس دوران کاغذات بھی جمع ہونے ہیں۔ یہ ساری صورت حال ہے۔ اس لئے تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔"

"تو یہ بات ہے......! مجھے ویسے خبر ملی تھی کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا ہے، میں نے اسے محض سیاسی بیان سمجھا تھا۔ پر آپ نے استعفیٰ دیا کیوں؟"

"تم یہاں آؤ، یہاں ساری تفصیل تمہیں معلوم ہو جائے گی۔ ویسے بھی تم یہاں کے

معاملات کو سمجھنا شروع کرو۔ بس آجاؤ باقی باتیں یہاں ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ماما اور بہنا کو تو آنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ وہ تو ابھی آنے کے موڈ میں ہی نہیں ہیں۔ میں بہر حال پہلی ممکن فلائیٹ سے یہاں آ رہا ہوں۔"

"آجاؤ بیٹا......! مجھے بھی ایک سال ہو گیا ہے تمہیں دیکھے ہوئے۔" سیدن شاہ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو قاسم شاہ فوراً بولا۔

"بابا سائیں......! میں آ رہا ہوں۔ میں آج ہی کوشش کرتا ہوں کہ ایک دو دن میں مجھے نشست مل جائے۔ میں آپ کو فون کر کے بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔" اس نے فون رکھا۔ چند لمحے جذباتی کیفیت میں ڈوبا رہا پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ملازم خاص کو بلایا اور اسے داراں مائی کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اس کے سامنے موجود تھے۔

"حکم سائیں......!" داراں مائی نے انتہائی ادب سے کہا۔

"ابھی میری چھوٹے سائیں سے بات ہوئی ہے وہ دو تین دن میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ تم نے کیا کرنا ہے۔"

"جی پیر سائیں، میں سمجھ گئی ہوں۔"

"میں ابھی کچھ دیر میں شہر جا رہا ہوں۔ پیراں دتہ سے کہو کہ وہ یہاں رہے اور مجھ سے رابطہ رکھے، کل شام تک حویلی چھوٹے سائیں کے شایان شان سجا دی جائے۔"

"جیسے حکم سائیں کا۔" داراں مائی۔ نے قدرے جھکتے ہوئے کہا تو سیدن شاہ نے اپنے ملازم سے کہا۔

"ڈرائیور لوگوں کو بلاؤ، مجھے شہر جانا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ پلٹ گیا۔ داراں مائی بھی چلی گئی اور سیدن شاہ شہر جانے کے لئے اٹھ گیا۔

☆☆☆

اس شام بادل خوب گھرے آئے تھے۔ سرمئی بادل نیلے آسمان کو ڈھک چکے تھے۔ گرمی کی شدت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر جس وقت وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تو بارش شروع ہو گئی۔ اتنی بارش ہوئی کہ ہر طرف جل تھل ہو گئی تھی۔ احمد بخش، درویش بابا اور علی تینوں مسجد میں ہی بیٹھے رہے تھے۔ بارش تھمی تو وہ تینوں ہی اٹھ گئے۔

"آؤ ایک نظر دیکھ لیں۔ کہیں کوئی کمرہ ٹپکا تو نہیں۔"

"نہیں فقیر سائیں......! ایسا کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ کام ہی اس طرح سے ہوا ہے۔ ویسے آپ چاہیں تو اطمینان کر لیں۔"

"اگر آپ کہتے ہیں درویش بابا تو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ خیر......! اللہ نے ہمیں توفیق دی اور یہ سارا کام مکمل ہو گیا۔ میاں جی کی وصیت پوری ہو گئی، میرے لئے یہی بہت بڑی سعادت ہے۔"

"ان آخری دنوں میں تو یوں کام ہوا ہے جیسے کوئی طوفان آ گیا ہو، اتنے مزدور، اتنے معماریوں جیسے وہ سب انہی دنوں میں کام کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ محض دو ہفتوں میں یہ سارا کام ختم ہو گیا، جس کے لئے اتنا انتظار تھا۔" احمد بخش کے لہجے میں خوشی بھری ہوئی تھی۔

"یہ سب اللہ کی توفیق سے ہوا، جب اس نے یہ چاہا تو دنوں میں مکمل ہو گیا۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا تو مسجد سے باہر نکلتے ہوئے درویش بابا نے کہا۔

"فقیر سائیں......! شاید آپ میری باتوں پر غور نہیں کرتے، اگر کرتے ہیں تو نظر انداز نہ کر جاتے۔ کیا میں کوئی بات نہ کروں۔" اس پر علی بے اختیار چونکا اور تیزی سے بولا۔

"نہ......نہ درویش بابا......! ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں آپ کی ہر بات سوچتا ہوں اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ نے یہ شکوہ کیوں کیا۔"

"فقیر سائیں......! آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ میاں جی کی وصیت پورے کرنے کے لئے وسیلہ کون بنا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس کو بنانے میں پورے صبر اور حوصلے سے کوشش کرتے رہے لیکن ہوا کیا، کس وسیلے کو قبولیت حاصل ہوئی کہ دنوں میں یہ کام مکمل ہو گیا۔ کیا وہ وسیلہ جو قبولیت کے درجے پر فائز ہو گیا ہے کیا وہ معتبر نہیں ہے؟"

"ہے......درویش بابا ہے......" علی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں......! ہم نے تو یہی کہنا تھا، کہہ دیا۔" درویش بابا مسکرائے تو علی بھی مسکرا دیا اور دھیرے سے بولا۔

"آپ بھی جانتے ہیں کہ اب ہماری مرضی کہاں۔"

علی کے یوں کہنے پر درویش بابا نے پھر سر ہلا دیا۔

باہر کا موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا، لیکن درویش بابا دستر خوان سجا چکے تھے۔ انہوں نے اپنے حجرے میں دونوں کو بلا لیا۔ لالٹین روشن تھی۔ تینوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا اور وہیں کچھ دیر بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران احمد بخش نے برتن اٹھائے اور دھونے چلا گیا۔

"درویش بابا......! کام تو سارا مکمل ہوگیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اب کوئی مزید کام رہتا ہے۔" علی نے تصدیق چاہی۔

"ویسے تو سب مکمل ہے، کچی عمارت میں جتنا ہو سکتا تھا وہ ہوگیا۔ اب بس کمی ہے تو ان بچوں کی جنہوں نے یہاں پڑھنا ہے۔ علم کے نور سے مستفید ہونا ہے۔" درویش بابا نے کہا۔

"وہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے، یہاں بیٹھ کر تو لوگوں کا انتظار نہیں کیا جا سکتا، ہمیں ان کے پاس جانا ہوگا۔ اس پورے علاقے میں بستی بستی، ٹوبہ ٹوبہ گھومنا ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ ہماری بات ہی نہ سنیں اور یہ بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ لوگ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔" علی نے ذہنی طور پر درویش بابا کو تیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہو جائیں......!" درویش بابا نے لاپرواہی سے کہا۔ "دیکھو فقیر سائیں......! ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہماری دوستی ذاتی ہے، ہماری دوستی اور دشمنی فقط اللہ کے لئے ہے۔ وہ کیسے ہوگی، یہ راستہ رحمت العالمین نے بتایا ہے، کس سے کس طرح دشمنی کرنی ہے اور کیسے دوستی۔ ہم اپنی کوشش کریں گے، نتیجہ میرا مالک جانے، وہی کارساز ہے۔"

"ٹھیک ہے درویش بابا......! کل سے ہم کچی بستی میں نکلیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ یہاں مدرسہ بن گیا ہے اور......"

"کل آئے گی نا فقیر سائیں تو دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو عشاء کی تیاری کریں۔" درویش بابا نے اس کی بات کاٹ دی تو علی دھیرے سے مسکرا دیا۔

عشاء کے بعد علی اپنے معمولات میں کھویا ہوا تھا۔ میاں جی کا دیا ہوا سبق دہرا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ باہر بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن اس رات موسم کے سرد ہو جانے کی وجہ سے ایک خالی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ احمد بخش اپنے گھر چلا گیا تھا اور درویش بابا اپنے حجرے میں تھے۔ ہر جانب سکون تھا۔ یوں علی کو ذکر کے دوران ہی نیند آنے لگی، حالانکہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، دو چار نیند کے جھونکوں میں اسے یہی لگا تھا کہ موسم کا اثر ہے۔ جو اسے سو جانے پر مجبور کر رہا ہے لیکن پھر وہ جیسے بے بس ہوگیا۔ وہیں جائے نماز پر سیدھا ہوا اور اسے اپنی ہوش نہ رہی کہ وہ کہاں پر ہے۔

وہ پھر سے سنہری ریت پر سنہری دھوپ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ ہر شے روشن تھی۔ تیز دھوپ ہونے کے باوجود تپش کا احساس نہیں تھا۔ اور وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ سنہری ریت اس کے پاؤں تلے ریشمی قالین کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا لباس انتہائی بیش قیمت تھا۔ سفید لباس جس پر سنہری زرتار سے کام ہوا تھا۔ سر پر سبز رنگ کا عمامہ تھا اور وہ خود بے خود ہو رہا تھا۔ اس کی منزل

کہاں تھی، یہ بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ بس وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کسی ایسے منظر سے گزرا تھا لیکن اس بار اہتمام ہی کچھ اور تھا۔ بنیادی طور پر فرق اس وقت میں اور اس وقت کی کیفیتوں میں تھا۔ اس بار وہ مطمئن اور پرسکون تھا۔ نجانے کتنی دیر تک اس نے سفر کیا تھا کہ اچانک وہ ایک ایسے ٹیلے کے سرے پر آیا جہاں نشیب میں اسے ایک بہت بڑا نخلستان دکھائی دیا۔ سرسبز و شاداب درختوں کا جھنڈ، جس پر پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہی اس کی منزل تھی۔

وہ نخلستان میں داخل ہوا تو سرخ قالین اس کے پاؤں کے نیچے تھا۔ پرندوں کی دھیمی دھیمی سریلی آوازیں کسی نغمے کی طرح اس کو سرور بخشنے لگی۔ رنگین اور خوشنما پھولوں کی مہک نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ وہ چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ اسے ایک سنہری مسند دکھائی دی جس پر میاں جی تشریف فرما تھے۔ وہ ان کے قریب پہنچا تو جیسے ہوش میں آ گیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد میاں جی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مسند کی دوسری جانب بٹھا دیا۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ پھر میاں جی گویا ہوئے۔

"علی بیٹا......! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نہ صرف میری وصیت کو پورا کرنے میں کامیاب رہے ہو بلکہ اس دوران جو تم نے حوصلہ اور عزم دکھایا ہے، وہ بھی قابل تعریف ہے۔"

"یہ آپ ہی کا حکم تھا میاں جی۔" علی نے دھیرے سے کہا۔

"بہت سارے احکام ایسے ہوتے ہیں علی کہ اس میں کسی کی ذاتی مرضی شامل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کائنات کے نظام میں اس کا حصہ ہوتا ہے، جو بھی احکام اسے مل رہے ہوتے ہیں۔ اب یہ اس کی قسمت ہے کہ وہ اس نظام میں اپنا کردار ادا کر پاتا ہے یا نہیں۔ یہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے محوِ سفر ہے، چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے وہ اللہ کی مرضی کے تابع ہے، ایک معمولی سا اختیار انسان کو بھی ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپنی ذاتی منفعت کے لئے استعمال کر سکتا ہے یا نہیں۔ ذاتی منفعت سے میری مراد آخرت کو سنوارنا ہے۔"

"کیا میں کائنات کے اس نظام میں اپنا کردار ادا کر پایا ہوں۔" علی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا......! اب تک جو تمہارے ذمے تھا، اسے تم نے خوب نبھایا، تم نے خلوص نیت سے کوشش کی تو اللہ کی مدد بھی تمہارے شامل حال رہی ہے۔ اور پتہ ہے آج میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" میاں جی نے بہت ہی لاڈ سے کہا۔

"آپ بہتر جانتے ہیں۔" علی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کرسکوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوئے اور پھر کہتے چلے گئے۔ "دیکھو......! زندگی جمود کا نام نہیں ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو دوسروں کے لئے جیتے ہیں وہ چاہے کہیں بھی ہوں، ان کا مقصد وہی رہتا ہے۔ یہاں پر تمہارا کام ختم ہوگیا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ تم جوان ہو، زندگی میں تمہیں بہت کچھ کرنا ہے، یہاں تمہاری بنیادی تربیت ہوگئی ہے۔ علی، اب تم اس دنیا میں شامل ہو جاؤ، تمہاری پہچان الگ رہے گی، تمہارا مقصد وہی رہے گا، لیکن اس وقت وہاں پر تمہاری ضرورت ہے اس وقت امت پر جو وقت آگیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ حجروں میں بند ہو کر نہیں بیٹھا جاسکتا۔ ویرانوں میں ریاضتیں نہیں کرنی۔ بلکہ لوگوں میں رہ کر انہیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلاؤ، جس سے اللہ کے ہاں قبولیت ہوتی ہے۔ اور اس قبولیت کے لئے جو رستہ ہے، سنت نبی ﷺ کا وہ راستہ بتاؤ۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم کیا انداز اپناتے ہو۔"

"اور یہاں کا معاملہ......؟" علی نے دھیرے سے پوچھا۔

"یہ وہی چلائے گا جو ساری کائنات کو چلا رہا ہے۔ تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔"

"میاں جی......! میں اتنی بڑی دنیا میں رہتے ہوئے خود کو کس طرح بچا پاؤں گا۔" علی نے پوچھا۔

"اس کی تمہیں سمجھ خود ہی آئے گی۔ کیا تمہیں فنا اور بقا کی سمجھ نہیں آئی۔" میاں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ تو آئی۔" علی نے اعتراف کیا۔

"بس یاد رکھنا......! سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس شخص کو بہت مت بھولنا جس نے سیڑھیوں کی نشاندہی کی تھی۔ یہی ظرف ہے اور یہی اخلاقی قدر۔" میاں جی نے کہا اور اٹھ گئے۔ اسی لمحے علی کو بھی اٹھنا پڑا۔

تبھی علی کی آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں۔ پھر دھیرے دھیرے اسے خواب کا سارا منظر یاد آتا چلا گیا۔ اور وہ حکم بھی اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا جو اسے مل چکا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ رات ابھی اندھیری تھی لیکن ستارے بتا رہے تھے کہ فجر کا وقت ہونے کو ہے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا اور پھر تہجد پڑھنے کے لئے تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

سردار امین خاں کی ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ اسے یہ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ محض ایک دن پہلے فدا حسین نے فون کر کے اسے دھمکی دے دی تھی کہ وہ جس قدر چاہے اپنا تحفظ کر لے۔ اسے معلوم ہوگیا ہے کہ تم نے میرے خان کے خون کا سودا کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے خان محمد کی موت بھوت بن کر اس سے چمٹ گئی ہے۔ وہ جب تک کوئی ٹونہ ٹوٹکا کر کے، دھونی رما کے اس کو راضی نہیں کرے گا۔ یہ بھوت اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہے۔ ورنہ یہ اس کی جان لے کر ہی رہے گا۔ دوپہر کے وقت یہ دھمکی آئی تھی اور پھر شام تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بہت سوچ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ڈی آئی جی سے ملے اور اس سے مدد مانگے۔ جونہی اس کی سمجھ میں یہ بات آئی۔ اس نے فوراً فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شام ہوتے ہی وہ ڈی آئی جی کے گھر والے لان میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

"خان صاحب......! آپ برا مت منائیے گا، لیکن یہ حقیقت بہت تلخ ہے کہ ہم لوگ تو فقط آپ جیسے بڑے لوگوں کے درمیان مہرے بن کر رہ گئے ہیں۔ اگرچہ ہماری ذمہ داری عوام کی بھلائی اور خدمت ہے لیکن آپ جیسے لوگوں کے بنائے ہوئے اس سسٹم میں آپ ہی کے مفادات کی چوکیداری کے لئے رہ گئے ہیں۔" ڈی آئی جی نے قدرے تلخی سے کہا۔

"ہمارا تحفظ بھی تو آپ کی ذمے داری ہے نا، ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ ہمارا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ہم لوگوں کو روزگار کی فراہمی کا باعث بنتے ہیں۔" امین خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں جو بات کررہا ہوں شاید وہ آپ سمجھ نہیں رہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے خان صاحب کہ ہم یہاں پر عام آدمی کے لئے نہیں آپ کی خدمت کے لئے ہی رہ گئے ہیں۔ تحفظ ہو، مفاد ہو تو وہ آپ کا۔" ڈی آئی جی نے قدرے۔ لاپرواہی سے کہا تھا تو امین خان چونک گیا۔ پھر بولا۔

"جب سیدن شاہ کا معاملہ تھا تو آ ، نے قاتلوں تک کو بھگانے میں مدد دی۔ اب جبکہ میں اپنے لئے تحفظ مانگ رہا ہوں تو آپ عوامی معاملات کی بات کررہے ہیں۔ اسے میں کیا سمجھوں؟"

"آپ کچھ بھی سمجھئے، یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ جہاں تک سیدن شاہ کا معاملہ تھا، اس میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ کل وہ آجائیں گے آپ کے خلاف کچھ کرنے کے لئے۔" ڈی آئی جی نے اسی انداز میں کہا تو امین خاں قدرے بھڑک گیا۔

"دیکھیں......! آپ نے اگر میرے لئے کچھ نہیں کرنا ہے تو صاف کہہ دیں۔ میں نہ صرف اپنا تحفظ کرنا جانتا ہوں بلکہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہوں جو آپ کے گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ آپ مجھے نظرانداز کر کے اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

"خان صاحب......! آپ اپنا تحفظ کہاں تک کر پائیں گے۔ آپ نے جس بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال لیا ہے، اب اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ آج میں آپ کو خان محمد کے لوگوں سے تحفظ دوں گا۔ کل اور دوسرے آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ میری آپ کو ایک صلاح ہے کہ آپ سیدن شاہ سے دوستی کر لیں۔ بہت اچھا رہے گا۔"

"میں اسے کیسا سمجھوں؟" خان محمد نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"عقل مندی......!" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کاش آپ میرا اشارہ سمجھ سکیں۔" ڈی آئی جی نے قدرے صاف انداز میں کہا تو امین خان کافی کچھ سمجھتے ہوئے بولا۔

"مطلب، سیدن شاہ نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ چلیں دیکھتے ہیں، کون کس سے صلح کرتا ہے میرے ہاتھ میں چند اور معاملات بھی ہیں۔ آپ ہی کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ میرے پاس آتے تھے میں ان سے بات کر لوں گا۔"

"ضرور کیجیے گا، لیکن اتنا دھیان میں رہے کہ سیدن شاہ رکن اسمبلی نہ رہ کر بھی سوا لاکھ کا ہاتھی بن گیا ہے۔ اس کی پارٹی حکومت میں ہے اور بہت ساری ایجنسیاں حکومت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ حکومت بدلنے کا انتظار کریں۔ پھر جو بھی کرنا ہو کیجیے گا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو خان محمد کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی اس کی چھٹی حس اسے صحیح خبردار کر رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس وقت وہ میدان بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی بھاگ سکتا تھا۔ شہر میں ہونے والی کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی اس کے خلاف جانے والی تھی۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اگر ایجنسیوں کی تحقیقات کی لپیٹ میں آ گیا تو بہت کچھ سامنے آ جانے والا تھا۔ وہ ساری رات بے چین رہا اور صبح اخبار کے انتظار میں نہ جانے کب سے کاریڈور میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ اس وقت بھی سوچوں میں گم تھا۔ جب اس نے کاندھے پر نرم ہاتھ محسوس کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، فرزانہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر آنچل سے ڈھانپا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کب کی جاگی ہوئی ہے۔

"تم......!" امین خان کے منہ سے فقط اتنا نکلا۔

"ہاں بابا سائیں میں......! میں نماز پڑھنے کے بعد کھڑکی میں آئی تو آپ کو قدرے بے چین دیکھا۔ کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"جب بندہ بہت سارے دشمنوں میں گھر جاتا ہے نا تو پریشانی ہوتی ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"میں کسی حد تک سمجھتی ہوں کہ کیا بات ہو سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ یونہی خوف زدہ ہوتے رہیں۔ بلکہ وہ خوف جو بھی مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ اس کو سوچ کر پریشان ہوتے رہیں۔ پریشانی کے عالم میں کوئی بھی حل سمجھ میں نہیں آتا۔" فرزانہ نے دھیرے دھیرے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گی کہ یہ کیا معاملات ہیں۔ تم سناؤ تمہاری این جی او کا کام کیسے چل رہا ہے۔" اس نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک چل رہا ہے، مگر آپ میری بات بدلنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔"

"وہ اس لئے کہ تم میری پریشانی کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ سیاسی معاملات ہیں، انہیں مجھ تک ہی محدود رہنے دو۔" امین خان نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"اچھا آپ میری ایک بات مانیں گے بابا سائیں۔"

"بولو......!"

"آپ ایسا کریں۔ کچھ دنوں کے لئے اسد بھائی کے پاس چلے جائیں۔ وہاں پر آپ فریش ہو جائیں گے۔ تبدیلی......"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔" امین خان نے پیار سے کہا، پھر جذباتی سے انداز میں بولا۔ "دیکھو بیٹی......! اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو اپنے بھائی کا بہت خیال رکھنا۔"

"بابا سائیں......! آپ جو اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ لگتا ہے کوئی سنگین معاملہ ہے۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے نہیں؟" فرزانہ نے پریشانی میں کہا۔

"کہنا تا نہیں......! یہ میری پریشانی ہے، اسے مجھ تک ہی محدود رہنے دو۔" امین خان نے کہا اور اٹھ گیا۔ "آؤ......! ناشتہ کرتے ہیں۔"

"لیکن ابھی ناشتے کا وقت نہیں ہوا۔" فرزانہ نے قدرے بے رخی سے کہا اور اٹھ گئی۔

امین خان اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی پریشانی اپنی بیٹی کو

بتائے یا نہیں۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اچانک اسے ایک نیا خیال سوجھ گیا، جس پر اس نے فوراً عمل کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اس وقت وہ ناشتے کے بعد اخبار پڑھ رہا تھا۔ فرزانہ اپنے آفس جا چکی تھی ایسے وقت میں اس کا وکیل بیرسٹر سلمان آ گیا۔

"آیئے سلمان صاحب......! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"خیریت تو ہے نا امین خان صاحب......! اتنی تیزی میں اور اتنی جلدی مجھے یاد فرمایا ہے۔"

"سلمان صاحب......! کیا آپ کو اپنی زندگی کا اعتبار ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کسی کو بھی نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسے وقت میں جبکہ دھمکیاں مل رہی ہوں، نامساعد حالات ہوں تو میرا خیال ہے۔ اتنی بڑی جائیداد کے بارے کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کر دینا چاہیے۔"

"ہاں......! آپ نے ٹھیک سوچا۔ تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ اپنی جائیداد کے بارے میں وصیت چھوڑنا چاہ رہے ہیں۔"

"بالکل......!" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر بولا۔ "جائیداد کی تفصیل وغیرہ تو میرا ملازم آپ کے پاس لے کر آئے گا۔ تاہم میں زبانی آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرے دو ہی بچے ہیں، ایک میری بیٹی ہے فرزانہ اور دوسرا اسد ہے۔ ان دونوں میں جائیداد برابر کی تقسیم ہو گی۔ میں اس تفصیل میں یہ بھی لکھ دینا چاہتا ہوں کہ کس کو کیا ملے گا۔ آپ کاغذات تیار کیجیے۔" امین خان نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل، میں کاغذات تیار کر لیتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ ایک اور بات ہے، میں یا میرا بیٹا، ہم دونوں کی عدم موجودگی میں تمام تر فیصلے کا اختیار فرزانہ کو ہو گا۔ وہ چاہے تو جائیداد بیچ دے یا اس کا جو مصرف بھی کرے۔"

"یہ بھی ہو جائے گا۔ لیکن کیا آپ اپنی بیٹی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کیا وہ سب سنبھال پائے گی۔"

"ہاں......! وہ سنبھال لے گی۔ آپ وہی کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ جو دوسری بات میں نے آپ سے کہی ہے یہ تو محض حفظ ماتقدم کے طور پر ہے۔" امین خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار صاحب......! آپ ایسا کیجیے تفصیل بھجوا دیجیے گا۔ میں کاغذات تیار کر لوں گا۔" بیرسٹر نے کہا تو ملازم چائے رکھ کر چلا گیا۔ ابھی وہ چائے پی ہی رہے تھے کہ اللہ بخش آ گیا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا اور ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ تبھی امین خان نے بیرسٹر سلمان سے ہونے والی باتوں کی ساری تفصیل اسے بتائی۔ اور پھر کہا۔

"آج تمہارا یہی کام ہے۔ دوپہر ہونے سے پہلے تک ساری جائیداد کی تفصیل لے آؤ مجھے دکھاؤ، میں ان کی تقسیم کروں گا اور جو بھی جہاں بھی جتنی جائیداد ہے۔ وہ سب قانونی لحاظ سے درست ہو۔ میرے بچوں کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔" امین خان نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"جیسے حکم ہے سائیں۔" اللہ بخش نے پہلی بار یہ کہتے ہوئے دکھ محسوس کیا تھا۔ بیرسٹر چلا گیا تو اللہ بخش کو بھی جانے کے لئے کہہ دیا گیا۔ پھر امین خان سوچ میں پڑ گیا۔ اب کا بہت سارا بوجھ کم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی اور شہر کی سڑکوں پر رونق ماند پڑ چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں لوٹ چکے تھے۔ بارش ہونے کے بعد سورج چمکا تو حبس بڑھ گیا تھا۔ ایسے میں علی اپنے گھر کے باہر گیٹ پر آیا تو ایک لمحے کے لئے اسے اپنا وجود بھی اجنبی لگا۔ اس کا بیل کی جانب بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا تھا۔ اس کا حلیہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ پرانے پیوند لگے شلوار قمیض، بڑھی ہوئی شیو، لمبے بال اور سیاہ ہوتا ہوا چہرہ۔ اس کا یہ حلیہ اپنی جگہ لیکن وہ کسی کو کیا بتائے گا کہ وہ اتنے دن کہاں رہا ہے؟ کیا وہ جواب دے پائے گا۔ بہرحال انہیں سب کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ اس لئے اس نے بیل دے دی۔ کچھ دیر بعد احسن دروازے پر آیا تو وہ علی کو پہچان ہی نہیں سکا۔ قدرے غصے میں معاف کرو بابا کہنے ہی والا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ چند لمحے ساکت سا وہ علی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس سے لپٹ گیا۔

"علی بھائی......! کہاں چلے گئے تھے آپ، اور...... اور...... یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔" احسن نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا تم دروازے پر آئے ہو۔ ابھی اندر مت بتانا کہ میں آیا ہوں۔ باہر والا دروازہ کھولو......" یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا پھر ایک لمحے بعد بولا۔ "بلکہ تم ایسا کرو کہ میرے اچھے سے کپڑے لے آؤ میں حلیہ درست کر کے ہی امی کے سامنے جاؤں گا۔"

"یہ...... یہ سب کیا ہے بھائی...... میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو نا، امی مجھے اس حال میں دیکھیں گی تو پریشان ہوں گی۔" علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو احسن کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس چلا گیا۔ پتہ نہیں اس نے اندر جا کر کیا کہا ہوگا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد وہ علی کے کپڑے لے کر آ گیا۔ وہ اسے تھماتے ہوئے بولا۔

"آپ ٹھہرو......! میں بائیک لے کر آ رہا ہوں۔ اکٹھے چلتے ہیں۔" احسن نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بھائی وہاں سے کسی سیلون کی جانب نکل گئے۔

عصر کے بعد وہ دونوں جب گھر میں داخل ہوئے تو نگہت بیگم، غلام نبی اور فائزہ صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی پر نگاہ پڑتے ہی ان کے فکر مند چہرے حیرت زدہ رہ گئے۔ نگہت بیگم یہاں بیٹھی تھیں وہیں ساکت ہو گئیں۔ غلام نبی نے علی کے گلے لگایا تو وہ کتنی دیر تک اپنے باپ کے گلے لگا رہا۔ پھر اپنی ماں کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"امی میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے۔ میں لوٹ آیا ہوں، کیا آپ اپنے بیٹے کو معاف نہیں کریں گی۔"

"کروں گی معاف، کیوں نہیں کروں گی میرے جگر کے ٹکڑے......" نگہت بیگم نے بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔ کافی دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ علی کو بھی یوں محسوس ہوا جیسے کہ وہ ٹھنڈی چھاؤں میں آ گیا ہے۔ ماں سے الگ ہونے کے بعد وہ بہن سے ملا اور اسے پیار دیا

"تو اچانک کہاں چلا گیا تھا۔" غلام نبی نے پوچھا۔

"موصوف کا حلیہ درست کروانے گیا تھا، میں نے سوچا آپ اسے اس حالت میں دیکھیں گے، جس حالت میں یہ یہاں آئے تھے تو آپ ڈر جائیں۔ یہ تو خوبصورت تراشے ہوئے بال، "خط کشیدہ" ڈاڑھی جس سے ان کا چہرہ مزین دکھائی دے رہا ہے، یہ ہلکی مونچھیں، خوب صاف ستھرے دکھائی دے رہے ہیں، یہ ایسے نہیں......"

"اب بس بھی کرو یار.....! تم تو نان سٹاپ ہوئے جا رہے ہو۔" علی نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"اب انہیں تو بتانا ہے نا بھائی۔ اصل میں جب سے آپ اچانک غائب ہوئے تھے، امی میرا بھروسہ ہی نہیں کرتی ہیں۔ ذرا دو چار منٹ اِدھر اُدھر ہوا انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔" احسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو فائزہ نے پوچھا۔

"بھائی......! آپ چلے کہاں گئے تھے جو اتنی بری حالت میں آئے ہیں واپس۔"

"بری حالت نہیں تھی، یہ خواہ مخواہ بات بنا رہا ہے اور آپ سب یقین مانیں، جس جگہ میں تھا، وہ بری نہیں تھی بلکہ میں سمجھتا ہوں وہ دنیا کی بہترین جگہ تھی۔" علی نے کھوئے لہجے میں کہا۔

"بہترین جگہ......!" احسن نے طنزیہ انداز میں کہا تو علی نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جس جگہ سے بندے کو شعور ملے، زندگی کا مقصد اور آگہی کا حصول ہو، وہ بہترین جگہ ہی ہوتی ہے۔"

"کیا کھویا کیا پایا۔" فائزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کھویا کچھ بھی نہیں، بس پایا ہی پایا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فائزہ سے کہا۔ "اب باتیں ہی کرتی رہو گی یا پھر کچھ کھانے پینے کا بھی پوچھو گی۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" علی نے اس موضوع سے خیال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی تم رہے کہاں؟" نگہت بیگم نے پھر وہی بات کہہ دی۔

"امی......! چھوڑیں اس موضوع کو۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ ٹھیک ہیں، صحت ٹھیک ہے۔" اس نے پھر سے اپنی ماں کو باتوں میں لگانا چاہا تو غلام نبی بھانپ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ تب اس نے کہا۔

"علی......! تمہیں معلوم ہے کہ صبح تمہارا رزلٹ آنے والا ہے۔"

"جی ابو......! مجھے معلوم ہے اور میں صبح جاؤں گا کیمپس۔" علی نے عام سے انداز میں کہا۔ تو احسن طنزیہ لہجے میں بولا۔

"شعور، آگہی، زندگی کا مقصد......! اتنا کچھ یہ جانتے ہیں تو انہیں اپنے رزلٹ کے بارے میں بھی پتہ ہوگا۔ کیوں بھائی پتہ ہے؟"

"ہاں پتہ ہے......! میں نے یونیورسٹی ہی نہیں، پورے ملک کی یونیورسٹیوں میں ٹاپ کیا ہے میں تمہیں اپنے نمبرز بھی بتا دیتا ہوں، لکھ لو، صبح دیکھ لینا۔" علی نے یونہی مسکراتے ہوئے کہا تو احسن کھلکھلا کر ہنس دیا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"یہ بہت بڑا راز افشاء کیا ہے انہوں نے۔ کل رزلٹ آنے والا ہے، کہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ بلکہ وہ جو پوزیشن ہولڈرز ہوتے ہیں۔ ان سے تو پہلے رابطہ ہوتا ہے۔ بھائی، کیا یہی ہے۔ شعور، آگہی، زندگی کا مقصد......؟" احسن نے کہا، اس سے پہلے کہ علی جواب دیتا اتنے میں فائزہ چائے کے ساتھ بسکٹ رکھ کر لے آئی۔ وہ بھی سن رہی تھی اس لئے مسکراتے ہوئے آئی۔ اتنے دنوں بعد اسے گھر کے صحن میں اپنوں کے درمیان بہت ہی اپنائیت والا ماحول ملا تھا۔ سو وہ

بھی موڈ میں آ گیا۔

''یہ لیں بھیا چائے......! فوراً تو یہ بسکٹ ہی پڑے تھے لے آتی ہوں۔ ابھی کھانا بناتی ہوں۔'' فائزہ نے کہا تو علی بولا۔

''وہ جو حلوہ کچن میں پڑا ہے، وہ کیوں نہیں لائی۔''

''حلوہ......؟'' فائزہ نے حیرت سے کہا۔ ''بھائی خیریت تو ہے، کچن میں آپ گئے نہیں۔ حلوہ ہوتا تو میں آپ کے لئے لاتی نا۔''

''ارے جاؤ دیکھو، انہیں شعور ہے، آگہی ہے۔'' احسن نے پھر سے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو فائزہ سچ مچ پلٹ گئی، پھر چند لمحوں بعد آئی تو چہرے پر حیرت اور ہاتھوں میں برتن پکڑا ہوا تھا جس میں گرم گرم حلوہ تھا۔

''یہ کیا......؟'' وہ حیرت سے بولی، اس کی آواز پھٹ رہی تھی جیسے اس سے بولا نہیں جا رہا ہے۔ احسن جو زور سے ہنس رہا تھا، اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ نگہت بیگم اور غلام نبی کی حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

''لاؤ نا، کھائیں۔'' علی نے اس کو حیرت سے نکالا۔

''مگر بھائی یہ آیا کہاں سے۔''

''خود ہی تو لائی ہو کچن سے۔ کیا چمچ لانا بھی بھول گئی ہو۔'' علی نے پھر کہا تو فائزہ جیسے نیند سے جاگ گئی۔ وہ لاشعوری طور پر واپس پلٹی اور پھر چمچ لے کر آ گئی۔

''لو امی کھاؤ۔''

''یہ......یہ کیا ہے بیٹا۔'' نگہت بیگم حیران تھی۔

''حلوہ ہے کھائیں نا۔'' علی نے چمچ بھر کے کھلایا۔ نگہت بیگم ڈرتے ڈرتے کھانے لگی۔ اسی طرح اپنے باپ کو دیا۔ احسن کی باری آئی تو علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ شعور، آگہی......لو دیکھو......!''

پھر علی نے بھی ایک دو چمچ لئے اور رکھ دیا۔ اور پھر بولا۔ ''جاؤ، اس برتن کو ویسے ہی واپس رکھ آؤ۔''

''نہ......میں نہیں جاتی۔'' فائزہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ علی نے احسن کو اشارہ کیا، وہ برتن کچن میں رکھ کر آ گیا۔ علی جب تک چائے پیتا رہا، وہ سب اس کی طرف حیرت سے دیکھتے رہے۔

''آپ سب میری جانب یوں کیا دیکھ رہے ہیں۔'' آخر علی نے کہا۔

''یہ کیا تھا بیٹا۔'' نگہت بیگم نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں اماں۔ ایویں ان بچوں کے ساتھ مذاق کیا تھا۔'' علی نے کہا تو اتنے میں اذان کی آواز سنائی دی۔ علی اٹھ گیا۔ اور وضو کرنے لگا۔ وہ سب اس کی طرف بڑے غور اور حیرت سے دیکھتے رہے۔ غلام نبی کو جب ہوش آیا تو وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس لئے وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں، ان کے ذہن سے یہ بات دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ علی صحن میں نہیں تھا، وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا، اس نے گرد آلود جائے نماز اٹھائی اسے جھاڑا اور بچھا کر اللہ کے حضور حاضر ہو گیا۔

☆☆☆

اگرچہ فرزانہ خاں اپنے آفس میں مصروف تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد وہ اب فائلیں دیکھ رہی تھی۔ کام اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن وہ خود کو خواہ مخواہ مصروف کیے ہوئے تھی۔ وہ لاشعوری طور پر حامد کی فون کال کی منتظر تھی جو صبح سے روہی گیا ہوا تھا۔ فرزانہ نے اسے خصوصاً تاکید کی تھی کہ وہ جاتے ہی علی سے بات کروائے مگر ابھی تک اس کا فون نہیں آیا تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی اسے یونیورسٹی بھی جانا تھا۔ اس دن ان کا رزلٹ آنا تھا۔ بہت سارے کلاس فیلوز نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے سب کو ٹریٹ دینے کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔ اک کمی تھی تو علی کی تھی۔ وہ پورے دل سے چاہ رہی تھی کہ علی بھی اس پارٹی میں ہو۔ وہ اس دن پورے خلوص سے اسے بلانا چاہتی تھی۔ فرزانہ کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس کے بلانے پر آ جائے گا، مگر پھر بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار اسے بلا کر تو دیکھے۔ ساری فائلیں بھی ختم ہو گئی تھیں اور وہ فارغ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے افسوس بھی ہونے لگا تھا کہ حامد کی اس سے بات نہیں ہو سکی ہے۔ اس نے کلاک پر وقت دیکھا اور اٹھ گئی۔

اس وقت وہ آفس سے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کے سیل فون پر حامد کی کال آ گئی۔ اس نے جلدی سے فون اٹینڈ کیا۔

''ہاں بولو حامد......!'' اس نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میڈم......! آپ نے علی صاحب سے بات کروانے کو کہا تھا لیکن یہاں سے پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''نکل گیا ہے، پر کدھر......!'' فرزانہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

''یہ تو انہیں بھی نہیں معلوم، بس وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔'' حامد نے بے چارگی سے

کہا تو فرزانہ نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ فون بند کر دیا۔ نجانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ علی ایک بار پھر گم ہو گیا ہے۔ اب اس سے ملاقات ہو گی بھی یا نہیں۔ اگر ہو گی تو اس میں پتہ نہیں کتنا دورانیہ ہو گا۔ اگر چہ علی نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن فرزانہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ اس راہ پر چل نکلا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ وہ جو خود میں بہت زیادہ تبدیلی محسوس کرتی تھی، اس کی وجہ وہ علی ہی کو سمجھتی تھی۔ بلاشبہ یہ اس کی دعاؤں یا اس کی چاہت کا نتیجہ تھا جو وہ آج ایک مختلف فرزانہ خاں تھی۔ اسے وہ دن بھی یاد تھے جب وہ یونیورسٹی جایا کرتی تھی لیکن ابھی تک علی اس کے دل سے نہیں اترا تھا۔ وہ ان دنوں سے آج کے دنوں میں خود کا موازنہ کرنے لگی تو اسے زمین و آسمان کا فرق محسوس ہوا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ بہت ساری باتوں میں غلط تھی۔ انہی سوچوں میں کھوئی ہوئی وہ یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ جا پہنچی۔

وہ بہت دنوں بعد یہاں آئی تھی۔ وہ آخری بار اس وقت آئی تھی جب اس کی علی سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے دھیرے سے سب کو معاف کر دیا تھا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عجیب غم ناک قسم کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے قدم سست ہو گئے یوں جیسے کسی بندے کا دھیان کسی طرف ہو اور وہ جا کدھر رہا ہو۔ وہ یوں چلتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور میں آ گئی جہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ وہاں کھڑی ہو گئی۔ گئے دنوں کی یادوں کا ہجوم اس کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔ اس میں وہ صرف علی ہی کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے کے لان، روشیں، سنگی بینچ، کینٹین کی خالی کرسیاں، دور لائبریری کی سیڑھیاں، اس سے بھی آگے بس سٹاپ، درخت وہ سب اس کی نگاہ میں تھے جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد جڑی ہوئی تھی۔ ایک ایک واقعہ اسے یاد آ رہا تھا علی کے ساتھ وہ ساری لڑائیاں، دھمکیاں اور ناراضگیاں اسے یاد آ رہی تھیں۔ جسے وہ بہت آسان خیال کر رہی تھی، وہ اتنا ہی مشکل ثابت ہوا تھا۔ اسے خود پر ضبط نہ رہا اور وہ ہچکی لے کر رو دی۔ ان لمحوں میں وہ کوئی تعین نہیں کر پائی تھی کہ یہ آنسو کیوں اس کی پلکوں پر اترے تھے۔ ندامت تھی، ہار جانے کا دکھ تھا، کھو دینے کا احساس تھا یا پھر خود کو فنا کر دینے کا ماتم تھا۔ انہی کھردرے لمحوں میں اس کے کاندھے پر کسی کے ہاتھ رکھنے کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے علی کھڑا مسکرا رہا تھا، اسے ایک لمحے کے لئے تو یقین نہیں آیا کہ اس کے سامنے علی کھڑا ہے۔ اس کی مسکراہٹ تو خواب کی مانند تھی ہی لیکن......! وہ کس قدر بدلا ہوا تھا، وہ روہی میں ملنے والا فقیر سائیں نہ جانے کہاں تھا۔ اس وقت تو بہترین سوٹ میں ملبوس، سلیقے سے سلجھے ہوئے بالوں اور چہرے کو مزین کرتی ہوئی داڑھی کے ساتھ وہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک

خاص قسم کی چمک تھی جسے وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ بس روہی کے فقیر سائیں کی ایک جھلک اس میں تھی، اس کا رنگ جھلسا ہوا تھا، جیسے سفید رنگ سے تانبے کے جیسا ہو گیا ہو۔ فرزانہ کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”تم رو رہی ہو فرزانہ......! کیا بات ہے؟“ علی نے اس قدر پریشان کن انداز میں پوچھا کہ فرزانہ کے رکتے ہوئے آنسو کسی طوفان کی مانند بہنے لگے۔ وہ احساس جس کے سننے کے لئے وہ تڑپ رہی تھی لفظوں کی صورت میں اس کی سماعتوں سے ٹکرا کر روح کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ ”پلیز فرزانہ......! تم یوں اس طرح...... پلیز، اپنے آنسو روکو، کوئی دیکھ لے گا......“

تب فرزانہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بے ساختگی سے کہا۔ ”مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے تو کسی بندے کی کیا پرواہ۔ آج میں نے اللہ سے جو مانگا مجھے مل گیا ہے، ساری دنیا میں اعلان کر دو علی کہ وہ سمیع و بصیر ہے، وہ سنتا ہے، ہر دکھی دل کی فریاد وہ سنتا ہے علی......“

”بے شک فرزانہ......! وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، لیکن تم نے جو بندوں سے نہ ڈرنے کی بات کی ہے تو یہ ہمارا مقام نہیں ہے۔ یہ غرور اور تکبر کی علامت ہے۔ اس سے بچنا چاہیے فرزانہ......! عاجزی اللہ کو پسند ہے۔“ علی نے اسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہا تو فرزانہ نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کر لئے۔

”تم یہاں...... کب آئے، فقیر سائیں روہی سے...... یہ...... علی کب بن گئے۔“ فرزانہ نے دھوپ چھاؤں جیسے احساس کے ساتھ قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس کا لہجہ اب بھی بھیگا ہوا تھا۔

”میں ہمیشہ سے علی تھا فرزانہ......! اب درویش بابا کی مرضی تھی کہ وہ فقیر سائیں کہتے تھے۔ مگر پلیز یہ بات بس خود تک محدود رکھنا، یہاں کہو گی تو مذاق بن جائے گا۔“

”نہیں...... نہیں...... میں جانتی ہوں علی......!“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہ پا رہی ہو۔ پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا، اور بولی۔ ”علی......! ایک بات کہوں ناراض تو نہیں ہو گے نا۔“

”کہو......! تم میری محسن ہو فرزانہ۔“

”محسن......! اور میں...... وہ کیسے؟“ فرزانہ نے حیرت سے کہا۔

”کسی دن وقت ملا تو بتاؤں گا۔ ابھی تو ہم رزلٹ معلوم کرنے آئے ہیں نا۔“ یہ کہہ کر وہ

رکا پھر جیسے اسے فرزانہ کا سوال یاد آ گیا۔ ''تم کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''تم نے خود ہی میری بات کا جواب دے دیا۔ جس دن تم مجھ سے باتیں کرو گے نا، اسی دن بتاؤں گی۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں، تم سے۔'' فرزانہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے ہم آج ہی کسی وقت باتیں کر لیں، یا پھر کل، میں مہرو سے بھی تو ملنا چاہوں گا۔ اب تمہاری اجازت کے بغیر تو نہیں مل سکتا۔ ویسے تمہارا آج کا پروگرام کیا ہے؟''

''کاش میں نے کلاس فیلوز کو دعوت نہ دی ہوتی تو میں ابھی تمہیں لے کر اپنے آفس چلی جاتی، تم مہرو سے بھی مل لیتے اور باتیں بھی ہو جاتیں۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو علی بولا۔

''ڈونٹ وری فرزانہ......! میں کل مل لوں گا۔ ویسے مہرو ٹھیک تو ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک ہے۔ اور وہ جو آپ لوگ اسے پاگل پاگل کہتے تھے، وہ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ وہ عام آدمی سے زیادہ عقل مند ہے، کہہ سکتے ہیں کہ وہ جینئس ہے۔ میں نے دو ڈاکٹرز سے اس کا علاج کروانے کی کوشش کی، وہ دونوں ہی یہ رائے رکھتے ہیں۔ اب اس کی عقل مندی یا جینئس پن کیا کرے گا، جب تک اس کا ذہن کسی خاص سمت میں لگے گا نہیں۔''

''اس کا ذہن ایک طرف تو لگا ہوا ہے؟'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہوں، وہ سانول کی بات کرتی ہے، آپ لوگوں کو لگتا یہی ہے، خیر......! میں اس وقت اس بارے بات اس لئے نہیں کروں گی کہ مجھے سمجھانا نہیں آئے گا، تم خود ڈاکٹرز سے مل لینا، وہ کچھ اصطلاحوں میں بات کرتے ہیں۔ وہ تم ہی سمجھنا۔'' فرزانہ نے قدرے بے بسی سے کہا۔

''اوکے، آؤ چلیں......!'' علی نے کہا اور پھر قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یا تو ہم بہت جلدی آ گئے ہیں یا پھر سب سے آخر میں آ گئے ہیں۔''

''چلیں، دیکھتے ہیں۔'' وہ بھی قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولی۔

بہت تھوڑے سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ تھے۔ سبھی چیئرمین کے کمرے میں تھے اور یونہی پرانی یادوں کو دہرا رہے تھے۔ چیئرمین سمیت اساتذہ بھی موجود تھے۔ ان دونوں کے آتے ہی حیرت کا تاثر اٹھا اور پھر ہلچل سی مچ گئی۔ تبھی ان کی ایک تیز سی کلاس فیلو نے کہا۔

''آیئے آیئے، ابھی آپ دونوں کا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا۔''

''خیریت......!'' فرزانہ نے پوچھا۔

''یہ تو امید تھی کہ آپ اور علی دونوں ہی آؤ گے لیکن یوں اکٹھے آنا بہر حال ایک حیران کن بات ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس پر دونوں کچھ نہیں بولے، سب سے ملنے کے بعد وہ بیٹھے تو چیئرمین نے کہا۔

''لو جی......! اب آپ وہ اہم نیوز سنو، جو میں تم لوگوں کو سنانا چاہ رہا تھا، آپ سب نے تو اپنا رزلٹ سن لیا۔ فرزانہ بھی فرسٹ کلاس میں پاس ہو گی ہے۔ اور علی......! اس نے ٹاپ کیا ہے۔''

''واؤ......!'' سب نے اپنے اپنے طور پر حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔ مبارک دی تو چیئرمین نے مزید کہا۔

''گولڈ میڈل اور باقاعدہ انعام وغیرہ تو تقریب میں ملیں گے۔ اس کے مارکس دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ دوسری یونیورسٹیز میں سے بھی ٹاپ کرے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے روئے سخن علی کی طرف کیا۔ ''میری وی سی صاحب سے بات ہوئی تھی، سینڈیکیٹ میں یہ طے ہوا تھا، ہم تمہیں یہاں کی لیکچرر شپ آفر کرتے ہیں۔''

''او سر میں اسے قبول کرتا ہوں۔ جب تک مجھے کوئی اور......''

وہ تمہارا حق ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے کیرئیر میں بہت آگے تک جاؤ گے۔ چیئرمین نے کہا۔ تو ان کے درمیان باتوں کا اک سلسلہ چل پڑا۔ کافی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ لنچ کے لئے اٹھ گئے جس کا اہتمام فرزانہ کی طرف سے مقامی ہوٹل میں تھا۔ اس دن علی اور فرزانہ کے درمیان کوئی بات نہیں ہو سکی۔

☆☆☆

وہ ائیر پورٹ شہر سے باہر اور اپنے منظر میں یوں لگتا ہے جیسے صحرا کے درمیان میں ہو۔ ممکن ہے مستقبل میں شہری آبادی اس کے قریب ہو جائے لیکن ان دنوں شہر اور ائیر پورٹ کے درمیان اچھا خاصا ویرانہ تھا۔ ائیر پورٹ پر کافی گہما گہمی تھی۔ فلائیٹ آنے والی تھی۔ اور اس کے مسافروں کو لے جانے کے لئے بہت سے افراد وہاں موجود تھے۔ ان میں، پیراں دتہ بھی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے چار باڈی گارڈ اسلحہ سمیت دو گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے جو ائیر پورٹ کے باہر بالکل تیار کھڑی تھیں۔ وہ سب قاسم شاہ کو لینے کے لئے آئے تھے۔

سیدن شاہ نے صبح سویرے ہی پیراں دتہ کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ قاسم شاہ کو ائیر

سے لے آئے۔ ہمیشہ وہ ہی لے کر آتا تھا اور سیدن شاہ گھر پر ہی ان کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی نے عرس سے محض دو دن پہلے آنا تھا۔ جبکہ اپنے بیٹے کو فوراً آ جانے کے بارے میں سیدن شاہ نے خود حکم دیا تھا۔ اور وہ اپنے باپ کے حکم کے تابع فوراً ہی روہی پہنچ رہا تھا۔

ایئر پورٹ کی عمارت کے اندر کھڑا ہوا پیراں دتہ جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے ساری زندگی اس خاندان کی غلامی کی تھی۔ اس نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ سیدن شاہ کا حکم جائز ہے یا ناجائز......! اس کی زندگی کا مقصد صرف یہی تک کہ وہ اپنے پیر سائیں کا حکم بجالائے۔ باقی وہ جانے اور اس کا کام۔ اس باعث وہ بڑھتی عمر کے ساتھ سیدن شاہ کا مرید خاص بن گیا تھا۔ قاسم شاہ کو اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ پھر بچپن ہی میں وہ اپنی ماں کے ساتھ برطانیہ چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب بھی آتا، وہ اس کی ذمہ داری بن جاتا تھا۔ اب وہ جتنی دیر بھی پاکستان میں رہتا، اس نے قاسم شاہ کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ بھی سیدن شاہ کا حکم تھا۔

فلائیٹ آ چکی تو مسافر آنے لگے۔ پیراں دتہ بے چینی سے قاسم شاہ کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ پیراں دتہ اپنی روایت کے مطابق اس کے گھٹنوں کو چھونے لگا تو قاسم شاہ نے جلدی سے اسے پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہو پیراں دتہ......! تم میرے بزرگوں کی جگہ ہو۔ میں نے کئی بار منع کیا ہے کہ ایسا مت کیا کرو۔"

"ہمارا تو فرض ہے نا چھوٹے سائیں۔ آپ منع کرتے ہیں تو ہم خود کو گنہگار محسوس کرتے ہیں۔" پیراں دتے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے انتہائی عاجزی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، یہ بتاؤ، سب ٹھیک ہے نا۔"

"جی چھوٹے سائیں، سب ٹھیک ہے، آپ چلیں، پیر سائیں آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے پھر اسی عاجزی سے کہا تو قاسم شاہ نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"یہ سامان رکھواؤ۔" قاسم شاہ یہ کہتے ہوئے ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر کی جانب چل دیا۔

"جی چھوٹے سائیں......!" پیراں دتے نے سامان اٹھایا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

ایئر پورٹ کی عمارت کے باہر گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی جھک کر گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ ان سے ملا اور پھر گاڑی میں سامان رکھا اور وہ چل دیئے۔ انہیں شہر کی طرف نہیں حویلی کی جانب جانا تھا۔ ایک گاڑی میں ڈرائیور، قاسم شاہ اور پیراں دتہ تھا۔ اور دوسری میں گارڈز

تھے۔ دو گاڑیوں کا یہ قافلہ جلد ہی صحرا کے درمیان آ گیا۔

"بہت افسوس ہوتا ہے، اس جگہ کو دیکھ کر اور بہت اچھا بھی لگتا ہے۔" قاسم شاہ نے لب کشائی کی۔

"وہ کیسے چھوٹے سائیں......؟" پیراں دتہ نے کہا۔

"افسوس اس لئے ہوتا ہے کہ یہ ویرانگی پتہ نہیں کب آباد ہو گی۔ کب اس طرف توجہ ہو گی، اتنی بڑی زمین بے آباد اور بنجر پڑی ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح قابل استعمال کرنا ہو گا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کب؟" اس نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"اور اچھا......!" اس نے جیسے یاد دلایا۔

"یہ میری دھرتی ہے پیار ہے مجھے اس سے۔ ٹھنڈے ملک سے، لوگوں کے ہجوم سے نکل کر جب یہاں آتا ہوں تو بہت سکون ملتا ہے۔ یہ ویرانہ بھی بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ پرسکون سناٹا کتنا پیارا لگتا ہے۔" وہ اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا۔

"سائیں......! یہ تو فطری بات ہے نا کہ ہر بندہ اپنی دھرتی سے پیار کرتا ہے۔"

"اب دیکھو......! ہماری جو زمین ہے، اس میں سے بہت زیادہ حصہ بنجر اور ویران پڑا ہے۔ اگر وہ قابل کاشت ہو جائے تو کتنے لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ کتنے گھر خوشحالی کی زندگی گزاریں۔" وہ پھر اپنی ہی رو میں کہنے لگا جس پر پیراں دتہ بولا۔

"سائیں......! اس بار آپ نے الیکشن لڑنا ہے۔ ایسی باتیں تقریروں میں تو اچھی لگتی ہیں۔ لیکن ایسے نہیں۔ ابھی آپ چھوٹے ہو۔ یہاں کے ماحول کو نہیں سمجھتے ہو۔ یہاں پر اگر حاکمیت رکھنی ہے تو لوگوں کو بس اتنا دو کہ وہ مریں نہیں۔ اگر یہ لوگ خوشحال ہو گئے تو پھر یہ کس کی بات سنیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو پیراں دتہ، لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ کمائیں گے کس کے لئے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو پیراں دتہ ہنس دیا۔ پھر ان کے درمیان خاموشی قدرے طویل ہو گئی۔

ان کا سفر جاری تھا کہ ایک جگہ پر قاسم شاہ نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائی تو پیراں دتہ نے فوراً پوچھا۔

"چھوٹے سائیں کیا بات ہے۔ رک کیوں گئے۔"

"بتاتا ہوں۔" یہ کہا اور منرل واٹر کی بوتل لئے وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ پھر دور تک دیکھتے ہوئے اس نے پانی کے چند گھونٹ لئے اور بوتل پیراں دتے کو تھماتے ہوئے بولا۔

''تمہیں یاد ہے پیراں دتہ......! ایک بار میں بچپن میں اپنے سکول کے دوستوں کے ساتھ یہاں پر شکار کے لئے آ گیا تھا۔'' اس نے یاد دلایا تو پیراں دتہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں......! اسی وجہ سے تو آپ کو برطانیہ بھیجا گیا تھا۔'' تو قاسم شاہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''کتنا خوفناک دن تھا وہ بھی۔ میں بابا سائیں کی گن سے کر آ گیا تھا۔ تم اگر اس دفعہ نہ ہوتے تو میں مر گیا ہوتا، ماما کتنی ناراض ہوئی تھی...... یہی جگہ تھی نا وہ، اب بھی ہرن ملتے ہیں یہاں۔''

''ہاں یہی جگہ ہے وہ......! ہرن نہیں ملتے اب۔ بہت زیادہ شکار ہونے کی وجہ سے وہ یہ علاقہ چھوڑ گئے ہیں۔'' وہ باتیں کر رہے تھے کہ دوسری گاڑی کے گارڈز بھی نیچے اتر آئے۔

''وہ بھی کیا دور تھا یار......! کتنا ضدی ہوتا تھا میں۔'' وہ اپنے بچپن کو یاد کرنے لگا تھا۔

''چھوٹے سائیں چلیں، پیر سائیں آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''چلتے ہیں یار......! وہاں جا کر کل تک حویلی سے باہر نہیں آیا جائے گا، میں ذرا اس ہوا کو اپنے سینے میں اتارتا ہوں۔ تمہیں احساس نہیں ہے پیراں دتہ......! مجھے یہ سب کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ممکن ہے چند دن بعد نہ لگے۔'' ابھی یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے۔ کہ پہلو کے ٹیلے سے چیتے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی شخص نکلا اور انتہائی تیزی سے لڑھکتا ہوا قاسم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے گن کی نالی اس کی گردن پر رکھ دی۔

''رب نواز تم......؟'' پیراں دتے نے انتہائی حیرت سے کہا تو وہ بولا۔

''ہاں، میں، اپنے لوگوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔''

''تم کون ہوں اور میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......!'' قاسم شاہ نے کہا، جس کا جواب دینا رب نواز نے مناسب ہی نہیں سمجھا۔ تبھی ایک پہلو سے آواز آئی۔

''ہتھیار پھینکو یا فوراً مرنا پسند کرو گے۔''

سب نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہاں دو اور لوگ گنیں تانے کھڑے تھے۔ صورت حال سمجھتے ہوئے پیراں دتے نے کہا۔

''دیکھو رب نواز، تمہاری جو دشمنی ہے وہ ہم سے ہے۔ ہمارے ساتھ جو چاہے کر لو، لیکن چھوٹے سائیں کو جانے دو۔''

''ابھی تک تمہارے لوگوں نے گنیں نہیں پھینکیں، لگتا ہے کہ یہی اس کو مروانے کے

چکر میں ہیں۔'' رب نواز نے طنزیہ انداز میں کہا تو پیراں دتے نے ہتھیار پھینکنے کو اشارہ کر دیا۔

''سب دور ہو جاؤ۔''

''دیکھو رب نواز......!''

''بکواس بند کرو کتے، بند کرو بھونکنا۔'' رب نواز نے کہا تو ٹیلے پر موجود دونوں لوگ نیچے آ گئے۔ انہوں نے ان گارڈز کی تلاشی لے کر اطمینان کیا۔ اور انہیں ایک طرف زمین پر لٹا کر گنیں سیدھی کر لیں۔

''سن اوئے پیراں دتہ......! میری تمہاری دشمنی ہے، تم مانتے ہو نا۔''

''ہاں......!......!'' اس نے بمشکل کہا۔

''اس لئے میں تمہیں یہاں نہیں ماروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا۔ یہ گارڈز بے چارے، ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن یہ ہماری جان لے سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں ختم کر دو۔''

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ صحرا کا پرسکون سناٹا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس میں ان گارڈز کی چیخیں بھی تھیں۔ جن کا خون پیاسی ریت نے پی لیا تھا۔ یہ بڑا دلدوز منظر تھا۔ قاسم شاہ کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔

''یہ ذرا قاسم شاہ کو سنبھالو،'' رب نواز نے اپنے ساتھیوں سے کہا تو رب نواز پیراں دتے کے پاس چلا گیا۔ پھر انتہائی غصے میں بولا۔

''تیرے جیسے کتے، ان پیروں کی غلامی میں ہر بندے پر نہ صرف بھونکتے ہیں، بلکہ انہیں کاٹتے بھی ہیں۔ میری قاسم شاہ سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں اسے کچھ نہیں کہوں گا، میری دشمنی تو تم سے ہے۔ میری معصوم بہن مہرو کو تم نے بے عزت کیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جنونی انداز میں برسٹ اس کی ٹانگوں پر مارا۔ وہ چیختے ہوئے ریت پر گرا اور تڑپنے لگا۔ وہ وحشیوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہذیانی انداز میں بولا۔ ''میں قاسم شاہ کو کچھ نہیں کہوں گا، بلکہ اسے وہ لوگ ماریں گے جس کے بھائی خان محمد کو اس کے بے عزت باپ نے مروایا تھا، میرے ہاتھوں...... ہم اسی کے انتظار میں خاموشی کے ساتھ دن گزار رہے تھے۔''

یہ کہہ کر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک دانت پیستے ہوئے بولا۔

''میرا بھائی تھا خان محمد......!'' یہ کہہ کر وہ قاسم شاہ پر پل پڑا۔ اس نے انتہائی بے دردی سے اسے مارنا شروع کر دیا۔ ''تیری نسل ختم کر دوں گا ... شاہ۔ سانپ کو بھی ماروں گا اس

کے سپنولیے کو بھی ختم کروں گا۔'' وہ وحشیوں کی طرح اسے مارتا رہا۔ جس وقت قاسم شاہ بے حال ہوگیا۔ تو اس نے گن کی نالی اس کے ماتھے پر رکھی۔

''نہ......نہ...... ماتھے پر نہیں۔ دل پر مارنا۔ ماتھے پر مارو گے تو کون پہچانے گا کہ یہ سیدن شاہ کا پلا ہے۔'' رب نواز نے تیزی سے کہا تو اس نے پہلا برسٹ اس کے سینے میں اتار دیا۔ رب نواز نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو خوف سے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

''نہیں ......مت ڈرو......! تمہیں مار دیا تو حویلی میں لاشیں لے کر کون جائے گا۔ اٹھاؤ ان کو۔'' وہ دونوں ڈرائیور لاشیں گاڑیوں میں رکھنے لگے۔ پیراں دتے کو اٹھانے لگے تو رب نواز نے روک دیا۔ ''نہ......اسے پڑا رہنے دو۔ اسے ابھی ہم نے مارنا ہے، اسے ہم لے جائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ڈرائیوران لاشوں کو لے کر چل دیئے تو رب نواز نے پیراں دتے کو اٹھایا اور اسے رینگنے کے لئے کہا۔ ذرا سے فاصلے پر ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں ڈالا اور چل دیئے۔ تنہائی پاتے ہی وہ اذیت ناک انداز میں معافیاں مانگنے لگا۔ وہ بولتا رہا، چیختا چلاتا رہا مگر ان تینوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ گاڑی چلتی رہی یہاں تک کہ وہ کچی بستی میں جا پہنچی۔ اور پھر عین چوک میں لا کر رک گئے۔ گاڑی رکتے ہی کچھ لوگوں نے اس کی جانب دیکھا۔ اور پھر جب رب نواز نے پیراں دتے کو گھسیٹ کر زمین پر پھینکا تو لوگ حیران رہ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں مجمع لگ گیا جس کے درمیان پیراں دتہ پڑا سسک رہا تھا۔

''کچی بستی کے لوگو، یہی تھا وہ شخص جس سے تم خوف زدہ رہتے تھے، جو تم پر ظلم کرتا تھا۔ ایک بے غیرت شخص کے کہنے پر، آج یہ مرے ہوئے کتے کی طرح یہاں پڑا ہے۔ جس جس نے بھی بدلہ لینا ہے، آؤ اسے ٹھوکر مارو......'' رب نواز نے کہا تو کئی لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے بے دردی سے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے تو وہ بولا۔

''اب کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، سیدن شاہ کا ڈنگ بھی نکال دیا ہے، بہت جلد اس کا پھن بھی کچل دیا جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نفرت سے ایک برسٹ مرتے ہوئے پیراں دتے پر مارا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر ایک سمت نکل گیا۔ کچی بستی کے لوگ حیران اور ششدر وہیں کھڑے رہے۔ کسی نے بھی لاش اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ انہیں کوئی افسوس نہیں تھا۔

☆☆☆

جس وقت علی فرزانہ کے دفتر میں گیا، اس وقت دوپہر ہونے والی تھی۔ فرزانہ صبح سے

ہی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی اسے علی کی آمد کے بارے میں پتہ چلا وہ سراپا مسرت ہوگئی۔ وہ اسے خود لے کر اپنے آفس میں آئی۔

''بہت اچھا آفس ہے تمہارا،'' علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''یہ آفس مزید اچھا ہو سکتا ہے؟'' فرزانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''فرزانہ......! آفس سجانے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل شے تو کام ہوتا ہے نا، اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ تم میرے کام آئی ہو۔'' علی نے کہا اور خاموش ہوگیا۔ تبھی اگلے ہی لمحے وہ یوں بولا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ ''میں نے کل تمہیں کہا تھا نا کہ تم میری محسن ہو تو وہ میں نے ٹھیک کہا تھا۔''

''دیکھو علی......! یہ جو خدمت خلق کی مصروفیت میں نے اپنائی ہے تو یہ یونہی نہیں ہوگیا، کوئی قوت ہے جو مجھ سے یہ سب کروا رہی ہے۔ ممکن ہے یہ تم ہو یا تمہارا عشق ہو۔''

''عشق......!'' علی دھیرے سے مسکرایا۔ ''کیا تم ابھی تک وہیں کھڑی ہو۔''

''نہیں......! اس سے بہت آگے آ چکی ہوں۔ اتنا آگے کہ تیرے نقش قدم میں نے تلاش کر لئے ہیں علی۔ اب میں اسی راہ پر ہوں، جس پر تم چل رہے ہو۔ کل تک مجھے احساس تھا کہ تم کھو جاؤ گے، شاید میں پھر دوبارہ کبھی پا نہیں سکوں گی، لیکن آج میری سوچ بدل چکی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سانس لینے کو رکی، علی خاموش رہا تو وہ کہتی چلی گئی۔ ''اب مجھے تمہارے کھو جانے کا ڈر نہیں رہا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کا وجود ہو تو ہی اس سے عشق کیا جاتا ہے۔ عشق تو احساس کا نام ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بھی انا، ضد اور غرور کے منفی جذبوں کے تحت سوچتی تھی لیکن آج نہیں۔ علی......! تم اگر میرے عشق کو قبول نہ بھی کرو تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ اور تم چاہو بھی تو مجھے میرے عشق سے باز نہیں رکھ سکتے ہو۔'' فرزانہ یہ سب کہتے ہوئے بہت جذباتی ہوگئی تھی۔ تب علی نے تحمل سے کہا۔

''تم ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ گئی ہو فرزانہ......! لیکن ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ تمہارے اور میرے درمیان اسٹیٹس......'' یہ کہتے ہوئے وہ چونک گیا۔ یوں جیسے کسی نے اسے جھڑک دیا ہو۔ وہ ایک لمحے میں اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہوں۔ اس پر فرزانہ مسکرا دی۔

''میں ہزار دلیلیں دے سکتی ہوں، تیرے اور میرے درمیان اسٹیٹس کی بات پر لیکن

نہیں، تمہیں جواب مل چکا ہے۔ میرے خیال میں اب مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا تو علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میں نے یوں سوچا ہی نہیں تھا۔ میری غلطی تھی، اللہ مجھے معاف فرمائے۔ تم ٹھیک ہو، میں اپنے محسن کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''فقط محسن ہونا ہی......؟'' فرزانہ نے کہا۔

''نہیں......! میں مانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ یہ بھی سن لو کہ میں کس لئے خاموش ہو گیا ہوں۔'' علی نے کہا تو فرزانہ سراپا تجسس بن گی۔ تب علی نے کہا۔ ''معبود کی پرستش اور عبادت میں فرق ہوتا ہے، فقط اللہ کو اپنی عبادت ہی مقصود نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب نبی ﷺ کے طریقے کو بھی فروغ ملے۔ میں غلط تھا کہ میں نے تمہارے بارے میں ہمیشہ سنت ﷺ کے معیار کو نہیں سوچا۔ بلکہ دنیا ہی کے معیار کو مدنظر رکھا۔ اب تیرے اور میرے تعلق میں دنیا تو حائل نہیں ہے۔ معیار ہی کچھ اور ہے۔ تمہاری تمام تر کوششیں قبول ہو گئی ہیں تو میں کون ہوتا ہوں انہیں قبول نہ کرنے والا۔ فرزانہ جیسا تم چاہو، ویسا ہی ہوگا۔'' علی نے واضح لفظوں میں اسے اپنا عندیہ دے دیا۔ جس پر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''احترام اور چاہت میں بہت فرق ہوتا ہے، وہی فرق جو پرستش اور عبادت میں ہوتا ہے۔ میں چاہوں گی کہ تم اپنے پورے من سے قبول کرو۔ اس کے لئے چاہیں صدیاں لگ جائیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا عشق یونہی پر بہار رہے گا۔'' لفظ فرزانہ کے منہ ہی میں تھے کہ دو عورتوں کی رہنمائی میں مہرو وہاں آ گئی۔ وہ علی کو وہاں دیکھ کر خوشگوار حیرت میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔

''علی سائیں تم......! میں نے تو پہچانا ہی نہیں تھا۔''

''آپ بیٹھو مہرو۔'' علی نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ وہ ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گئی اور پھر بڑی گہری سنجیدگی سے بولی۔

''علی سائیں......! تمہیں پتہ ہے، رات ختم ہو رہی ہے، اندھیر دور ہو رہا ہے۔ ظلم کی جو آندھی اٹھی ہوئی تھی اس کا زور ٹوٹ گیا ہے۔''

''مہرو، کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' فرزانہ نے پوچھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب ٹھنڈی ہوا چلے گی۔ لوگ سکون سے سوئیں گے۔ پیٹ بھرے گا تو وہ پیٹ سے نہیں، دماغ سے، دل سے سوچیں گے۔ میرے سانول کا خون رنگ لے آیا

ہے۔ اس کے خون سے بہار آئے گی۔ اندھیرا دور ہو گیا ہے علی سائیں......!'' مہرو نے یوں کہا جیسے وہ اپنی بات منوانا چاہ رہی ہو۔ علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت گہری بات کر رہی ہو۔ تبھی علی مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے تو وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''حامد کہاں ہے اس وقت، یہاں کا کوئی بندہ روہی میں ہے۔''

''ہاں......! کچھ لوگ گئے تو ہیں۔ میں نے سامان بھیجا تھا۔'' فرزانہ نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''فون کرو......! ان سے میری بات کراؤ۔'' علی نے دھیرے سے کہا۔

''میں جو کہہ رہی ہوں علی سائیں، مجھ پر یقین نہیں ہے۔'' مہرو نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

''ہے، میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو لیکن پوری صورت حال بھی تو معلوم ہونی چاہیے۔'' علی نے بہت ہی نرم لہجے میں کہا۔ فرزانہ فون کر رہی تھی۔ رابطہ ہو جانے پر اس نے پوچھا۔

''حامد......! کہاں پر ہو تم......؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے دوسری طرف سے سنا اور بولی۔ ''یہی بات دوبارہ کہو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون سپیکر کھول دیا۔ حامد کہہ رہا تھا۔

''میڈم......! یہاں ایک بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ ہم تو خیر نکل آئے ہیں۔''

''واقعہ کیا ہوا ہے۔'' فرزانہ نے پوچھا۔

''یہاں کے روحانی پیشوا ہیں نا سیدن شان، اس کے بیٹے کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ ائیر پورٹ سے حویلی جا رہا تھا کہ راستے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ چار اور لوگ مارے گئے ہیں۔ سیدن شاہ کا ایک قریبی ملازم پیراں دتہ کو کچی بستی میں لا کر مارا گیا ہے۔ لوگ کسی رب نواز کا نام لے رہے ہیں۔ جس نے انہیں قتل کیا ہے۔'' حامد نے ایک ہی سانس میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''قاتل پکڑا گیا ہے یا......''

''بھاگ گیا ہے۔ اس کے ساتھ دو اور لوگ بھی تھے۔ یہ سارے اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''لوگوں کا تاثر کیا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''مجھے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ میں لوگوں کے تاثر لوں، میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے نکل آیا ہوں۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم آ جاؤ۔'' فرزانہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ چند لمحے ان کے درمیان

خاموشی رہی، پھر مہرو بولی۔

''علی سائیں......! سانول کا خون بول رہا ہے نا۔ میرے سانول کا۔''

اس کے یوں کہنے پر علی نے بہت غور سے مہرو کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر سکون کے دیے روشن تھے اور وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اسے قطعاً یہ دکھ نہیں تھا کہ اس کا بھائی یوں قتل و غارت کر رہا ہے۔ علی نے آنکھیں بند کر کے خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ جبکہ فرزانہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''علی......! مہرو نے جو کچھ بتایا ہے یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ اس سے بھی پہلے بہت ساری باتیں کہہ چکی ہے۔'' فرزانہ نے کہا تو علی نے ایک دم سے موضوع بدل دیا۔

''مہرو......! تم یہاں ٹھیک تو ہونا۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ اس مائی نے بہت خدمت کی ہے میری۔ میرا اللہ اسے اجر دے گا، میں سانول سے کہوں گی۔ وہ اس کے لئے بہت سارے تحفے لے کر آئے گا۔ یہ مائی بہت اچھی ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ملازمین چائے اور لوازمات لے کر آ گئے۔ جب تک وہ میز بھرتے رہے، ان میں خاموشی رہی۔ جب وہ چلے گئے تو فرزانہ نے صوفے پر آ جانے کا اشارہ کیا۔

اس وقت وہ چائے پی رہے تھے۔ علی فطری طور پر خاموش ہو چکا تھا، وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ احمد بخش اور درویش بابا پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔ وہ قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ ایسے میں فرزانہ کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے سکرین دیکھی اور بولی۔

''بابا سائیں کا فون ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون سنا۔ چند لمحے دوسری جانب سے سنتی رہی۔ پھر بولی۔ ''جی، بابا سائیں......! میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے فون بند کیا اور علی سے بولی۔

''مجھے بابا سائیں نے فوراً بلایا ہے۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔''

''بس میں بھی چلتا ہوں، مہرو کی خیریت دریافت کر لی ہے۔'' علی نے کہا اور اٹھ گیا۔ پھر مہرو کو واپس بھجوا کر دونوں آفس سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

سیدن شاہ حویلی کے ہال میں اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مریدین والے کمرے میں عورتیں اور مرد بھرے ہوئے تھے۔ حویلی کے اندر ایک طرح سے گہما گہمی تھی۔ ملازمین بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا کہ وہ اسی ہال کمرے میں اپنے خاندان کے افراد کا

استقبال کرتا تھا۔ علاقے سے آئے ہوئے مریدین میں بے تحاشا لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ وہ یہاں بھی کھاتے اور اپنے ساتھ بھی لے کر جاتے تھے۔ کچھ خاص مریدین اور احباب کو تحفے تحائف بھی دیئے جاتے تھے۔ یہ سب اس لئے کیا جاتا تھا کہ وہ ان کا صدقہ دیتا تھا۔ سیدن شاہ کا خیال تھا کہ بہ خیریت آمد پر ان کا صدقہ دینا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ علاقے میں یہ بتانا بھی مقصود ہوتا تھا کہ اس کا خاندان بھی عرس میں شامل ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کی اکلوتی اولاد میں قاسم شاہ ہی تھا جس سے گدی نشین ہونا تھا۔ سب کچھ تیار تھا، باہر لنگر پک چکا تھا۔ جس کی اطلاع اسے ہو گئی تھی۔ تحفے تحائف بھی لا کر رکھ دیئے گئے تھے لیکن ابھی تک قاسم شاہ نہیں پہنچا تھا۔ سیدن شاہ کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ تب اس نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر کہا۔

''یہ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں ہیں۔ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا۔''

''پیر سائیں......! ممکن ہے ان کا جہاز لیٹ ہو گیا ہو۔''

''پیر سائیں......! میں نے معلوم کیا ہے، جہاز آ گیا ہے، وہ کہیں رستے میں ہیں۔ فوراً کسی کو بھیجو تا کہ وہ اسے لے آئیں۔''

''جیسے حکم پیر سائیں کا''۔ وہ ملازم یہ کہتے ہوئے تقریباً بھاگنے والے انداز میں باہر کی جانب لپکا۔ اور ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ حویلی پر یکدم خاموشی طاری ہو گئی۔ اتنی بھیانک خاموشی سیدن شاہ نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ تبھی وہی ملازم اندر آیا اور خاموشی سے اس کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اور چہرے پر وحشت تھی۔ ''کیا ہوا......! اس طرح کیوں آ کے کھڑے ہو گئے ہو'' سیدن شاہ نے انتہائی غصے میں پوچھا۔

''جی......جی......وہ......'' اس نے ہکلاتے ہوئے باہر کی سمت اشارہ کیا۔ سیدن شاہ کی چھٹی حس کسی انہونی کا اشارہ کر چکی تھی۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور باہر کی جانب بڑھا۔ وہ باہر آیا تو سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ قاسم شاہ کی نعش کو لوگ چارپائی پر ڈال چکے تھے۔ خون میں لتھڑا ہوا قاسم شاہ کا وجود اس کے لئے کسی انہونی سے کم نہیں تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لوگ اس کی چارپائی اٹھا کر سیدن شاہ کے پاس لے آئے۔ اور سیدن شاہ حیرت زدہ نگاہوں سے اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''قاسم شاہ......! بیٹا اٹھو......! میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا، یہ دیکھو اتنے مریدین تمہارے استقبال کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اٹھ......!'' سیدن شاہ نے انتہائی دلدوز لہجے میں

کہا تو اس طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی نعش کو دیکھے جا رہا تھا جیسے یہ سب خواب ہو۔ کتنی ہی دیر یونہی گزر گئی۔ تب مجمع کو چیرتا ہوا ایک شخص آیا اور سیدن شاہ سے کہا۔

''پیر سائیں......! چھوٹے سائیں کو رب نواز اور خان محمد کے لوگوں نے قتل کیا ہے۔''

اس پر سیدن شاہ نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بول رہا ہو۔ پھر انتہائی غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

''پیراں دتہ کہاں ہے؟''

''سائیں......! وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور کچی بستی میں لے کر بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔''

اس شخص نے کہا تو سیدن شاہ نے اپنے بیٹے قاسم شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا جس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ خون میں لتھڑا ہوا بدن یہ حقیقت بیان کر رہا تھا کہ قاسم شاہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ سیدن شاہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھ میں سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔ وہ خالی آنکھوں سے ایک ٹک قاسم شاہ کی طرف ہی دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کتنا وقت یونہی گزر گیا۔ پھر وہاں موجود لوگوں نے چارپائی اٹھائی اور اسے حویلی کے ہال میں لے گئے۔ اس کے ذاتی ملازموں نے سیدن شاہ کو پکڑا اور نعش کے قریب بٹھا دیا۔ حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان کے پیر سائیں پر ظلم ہو گیا تھا، لیکن سیدن شاہ سوچ رہا تھا کہ اسے کن گناہوں کی یہ سزا ملی ہے۔ تبھی اس نے ہاتھ بلند کیا اور صرف ایک لفظ کہا۔

''خاموش......!'' اسے کے یوں کہنے پر لوگ خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

سردار امین خاں کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ وہ ڈرائننگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ جبکہ احمد بخش ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ شاید ان میں کوئی بہت لمبی گفتگو ہو چکی تھی۔ اس لئے خاموشی تھی۔ امین خان کی بے چینی اس کے ٹہلنے کے انداز سے معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بار بار داخلی دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی فرزانہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ تیزی سے بولا۔

''آؤ...... آؤ بیٹی آؤ......! ادھر بیٹھو۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب وہ بھی اسی صوفے پر بیٹھ گئی تو وہ بولی۔

''بابا سائیں، خیریت تو ہے نا، آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں؟''

''بات ہی ایسی ہے بیٹا......! ابھی تھوڑی دیر پہلے فدا حسین کا فون آیا تھا۔'' امین خان نے کہا۔

''یہ فدا حسین کون ہے۔'' فرزانہ نے پوچھا۔

''وہ خان محمد کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔ میں انہی کی وجہ سے پریشان ہوں اور بہت پریشان ہوں۔'' امین خان نے تفصیل بتائی اور بولا۔ ''خان محمد قتل ہو گیا تھا اور اس کے لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ میرا اس میں ہاتھ ہے، خیر......! یہ سب سیاسی داؤ پیچ تھے جو آزمائے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے میرے قتل کی دھمکیاں بھی مجھے دینے لگے۔''

''اب مسئلہ کیا ہے، کیا کہا ہے اس نے فون پر؟'' فرزانہ نے سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ سیدن شاہ کے بیٹے کو قتل کر چکے ہیں۔ انہوں نے سیدن شاہ کو بھی مارنے کا عزم کر رکھا ہے، وہ جو اتنے بڑے اور اتنے طاقتور کو مار سکتے ہیں۔ میں تو ان کے لئے آسان شکار ثابت ہوں گا۔ شہر کی بھیڑ میں وہ کسی وقت بھی کچھ کر سکتے ہیں۔'' امین خان پریشانی میں کہتا چلا گیا۔

''بابا سائیں......! انسان جو بوتا ہے وہ تو اسے کاٹنا پڑتا ہے۔ یہاں نہیں تو آخرت میں جہاں تک سیدن شاہ کا معاملہ ہے۔ اس نے جس طرح کے ظلم کیے ہیں، جس طرح عوام کو دبا کر رکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ آپ اس حد تک ظالم ہو سکتے ہیں۔''

''یہ تم نصیحتیں چھوڑو......!'' امین خان نے درشتی سے کہا۔ ''وہ بات سنو، جس کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔''

''جی کہیں......!'' فرزانہ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

''ان حالات میں، جبکہ دشمن کا وار کسی بھی وقت چل سکتا ہے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے اسد کے پاس چلا جاؤں۔ ماحول بدلے گا تو ان سوچوں سے بھی جان چھوٹے گی۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ تم یہاں پر اکیلی رہ جاؤ گی۔ وہ اگر سیدن شاہ کے بیٹے قاسم شاہ کو مار سکتے ہیں تو تمہیں بھی...... اس لئے تم فوراً تیاری کرو، ہم آج رات ہی یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''بابا سائیں......! میں کیسے جا سکتی ہوں۔ اور میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ جو وہ......''

''مجھے بحث نہیں چاہیے، بس تم فوراً تیاری کرو۔ یہ اللہ بخش ہے نا یہاں پر، یہ سارے معاملات دیکھتا رہے گا، بیٹی......! اگر زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔'' امین خان نے اسے سمجھاتے

ہوئے کہا۔

''نہیں بابا سائیں......! میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' فرزانہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''ضد نہیں کرو......! یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔'' اس نے قدرے غصے میں کہا، پھر فوراً ہی نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پہلے ہی سوچا تھا، ان پریشانی کے دنوں میں وصیت بھی تیار کروالی تھی میں نے، میں نے یہی سوچا تھا کہ ان لوگوں کی دشمنی مجھ سے ہے تو وہ......خیر......! یہ چھوڑو وہ بچوں کو معاف نہیں کر رہے، اس لئے بیٹا، میری مانو اور تیاری کرو۔ مجھے اپنا پاسپورٹ دو۔ ہم نے آج رات یہاں سے ہر صورت میں نکلنا ہے۔''

''تو پھر بابا سائیں......! آپ اپنے فیصلے پر قائم رہیں۔ مجھے یہاں رہنے دیں۔ آپ یقین رکھیں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں کم از کم ان کی گولی سے نہیں مروں گی، ویسے میری موت آگئی تو وہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ آپ جائیں۔''

''تم اتنی ضدی کیوں ہو؟'' امین خان نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

''بابا سائیں......! میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا، آپ نے میری بات ہی نہیں سنی، اگر سن لیتے تو آپ کو باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''کہو......تم کہہ لو......!'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''آپ آج بھی سیاسی زندگی میں ہونے والی کوتاہیوں کی توبہ کرلیں۔ اور آئندہ ایسا کچھ نہ کرنے کا عہد کرلیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا کوئی اُن سے رابطہ ہوا ہے۔'' امین خان نے تیزی سے پوچھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بابا سائیں......! آپ مجھ پر بھروسہ کر کے دیکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کہیں نہیں جائیں۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں سیاسی میدان خالی کردوں۔ اور ان لوگوں سے معافی مانگ کر زندگی کی بھیک مانگوں۔'' امین خان نے حیرت سے کہا۔

''میں آپ کو سیاسی میدان چھوڑنے کا نہیں کہہ رہی، خدمت کی سیاست بھی تو ہوسکتی ہے نا۔ باقی رہی معافی تلافی کی بات، آپ کو کچھ نہیں کرنا، سب کچھ میں کروں گی۔ انہیں آپ کے

سامنے بٹھادوں گی۔ جیسا بھی ہوگا، یہ سارا قصہ ختم ہوگا۔ آپ اپنی بیٹی پر بھروسہ تو کر کے دیکھیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتا، تم کیا جانو یہاں کے معاملات، بس تم مجھے اپنا پاسپورٹ دو۔ میں اللہ بخش کو بھیجوں۔ تاکہ شام تک ساری تیاری مکمل ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے، میں پاسپورٹ دے دیتی ہوں۔'' فرزانہ خان نے اٹھتے ہوئے کہا تو امین خان نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ فرزانہ خان نے اپنے کمرے کی طرف رُخ کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جب اس کے اور علی کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی اسے ہی منظر سے غائب ہو جانا پڑے گا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور الماری سے اپنا پاسپورٹ اٹھایا۔ تب آنسو اس کے پلکوں تک آگئے۔ شاید علی اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ذہن میں خیال آیا۔

''فرزانہ اس قدر مایوس کیوں......؟ ابھی کچھ دیر پہلے تم بڑی باتیں کر رہی تھی۔ اگر علی تمہارے مقدر میں ہوا تو وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ نہیں ہے تو تم جو مرضی کرلو۔''

اس نے اپنے پاسپورٹ کی طرف دیکھا اور پھر اپنی پلکیں صاف کیں۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ جو اس کے بابا سائیں چاہئیں گے وہی ہوگا۔ وہ ڈرائینگ روم میں آگئی اور پاسپورٹ امین خان کو دیتے ہوئے بولی۔

''بابا سائیں......! یہ لیں اور مجھے تھوڑی دیر کے لئے اجازت دے دیں، میں ایک ذمہ داری......''

''نہیں بیٹی......! تم نہیں جاسکتی ہو۔ جو کام بھی ہے، مجھے بتاؤ، وہ ہو جائے گا۔ بس تم شام تک تیار رہنا۔''

امین خان نے کہا اور پاسپورٹ لے کر اللہ بخش کو دے دیا۔ تب فرزانہ نے ایک گہری سانس لی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے ذہن میں فقط ایک ہی بات تھی۔ وہ اگر چلی گئی تو مہرو کا کیا بنے گا۔ کوئی دوسرا شاید ہی اس کی حفاظت کر سکے۔

''اسے علی نے ہی تمہیں سونپا تھا، تم اسے اپنی مجبوری بتاؤ اور مہرو اسے واپس کردو۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے چند لمحے اس پر سوچا اور پھر علی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون فائزہ نے اٹھایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لائن پر تھا۔ فرزانہ نے ساری تفصیل اسے بتائی اور اس سے مشورہ مانگا۔

''تمہارا بہت شکریہ فرزانہ......! تم نے مہرو کی اتنے دنوں تک حفاظت کی۔ اب میں یہاں ہوں، وہ میرے گھر میں رہے گی۔'' علی نے کہا تو فرزانہ کے اندر اچانک کچھ ٹوٹ گیا۔ اسے

لگا تھا کہ مہرو کی بات کرتے ہوئے وہ اس کے جانے پر کوئی بات کہے گا۔ اسے روکنے کی کوشش کرے گا، کوئی حوصلہ دے گا، امید کی کوئی کرن دکھائے گا۔ لیکن ایسا اس نے کچھ نہیں کیا۔ تو وہ دھیرے سے بولی۔

”ٹھیک ہے، جانے سے پہلے میں ایک بار مہرو سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ ابھی میں اس کے پاس تو نہیں جاسکتی لیکن اسے اپنے پاس بلالوں گی، شام تک وہ میرے پاس رہے گی، میں تمہیں فون کروں گی، تم آکر اسے لے جانا اور میں بھی...... تمہیں دیکھ لوں گی۔“ آخری لفظ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں تیزی سے کہے تھے۔

”فرزانہ......! تم اللہ پر بھروسہ کیوں نہیں رکھتی ہو، حالات وہ نہیں ہیں جو دکھائی دے رہے ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ تم وہی کرو جو بابا سائیں کہتے ہیں۔ باقی اللہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے۔“ اس بار علی نے اسے حوصلہ دیا تو اس کی تسلی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی شرمندگی کا احساس اس کے من میں در آیا۔ وہ کس قدر مایوس ہوگئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میرے فون کا انتظار کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے وقت دیکھا، ظہر ہونے والی تھی۔ فرض کے ساتھ ساتھ اسے نفل بھی پڑھنا تھے۔ وہ ان لمحوں کا کفارہ ادا کرنا چاہ رہی تھی جو مایوسی کی حالت میں گزرے تھے۔

وہ فرض نماز اور نوافل ادا کر چکی تھی۔ ایسے لمحوں میں وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مہرو کو بلانے کے لئے کیسے کہے تاکہ وہ اسے یہاں تک چھوڑ جائے کہ اس کی ملازمہ کمرے میں آئی اور بڑے ادب سے بولی۔

”بی بی سئیں......! خان سائیں آپ کو یاد کر رہے ہیں کھانے پر۔“

”چلو، میں آتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر نیچے جانے کے لئے تیار ہوگئی۔

لنچ پر وہ دونوں باپ بیٹی ہی تھے اور ان کے درمیان خاموشی تھی۔ شاید کچھ دیر پہلے طویل بحث کے بعد ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا، یا پھر امین خان ہی اس قدر سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ لنچ سے فراغت کے بعد ابھی وہ میز پر ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ اللہ بخش کا فون آگیا۔ امین خان چند لمحے بات سنتا رہا پھر فون بند کر کے پٹخ دیا۔

”کیا ہوا بابا سائیں......!“

”میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ہے۔ تم جاسکتی ہو، میں نہیں۔“

”اور میں اپنے بابا سائیں کو یوں اکیلے چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہوں۔“ فرزانہ نے کہا تو امین خان نے انتہائی غصے میں اس کی طرف دیکھا اور میز پر سے یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ دیکھتا ہوں، کوئی کیا کرتا ہے۔“

”نہ بابا سائیں نہ......! صبر کریں اور انتظار کریں۔ اللہ بہت بہتری کرے گا۔ بس آپ میری بات پر غور کریں۔ پورے دل سے میری بات مان کر دیکھیں۔“ فرزانہ نے جذباتی انداز میں انتہائی بے چارگی سے کہا تو امین خان نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دیا تو وہ دھیرے سے مسکرادی۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ لیکن چاندنی میں جنڈ کا درخت واضح دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے عقب میں کچا مدرسہ پوری طرح روشن تھا۔ کھلے صحرا میں اکیلی عمارت بڑی روشن دکھائی دے رہی تھی۔ ایسے میں ایک جیپ مدرسے کے قریب آکر رکی جس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ جیپ بند ہوتے ہی اس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے رب نواز باہر آگیا۔ پھر اس کے ساتھ وہی دونو جوان باہر آئے جو دوپہر کے وقت اس کے ساتھ تھے۔ وہ تینوں بہت محتاط انداز میں مدرسے کے اندر چلے گئے۔ انہیں صرف ایک کمرے میں روشنی دکھائی دی تو وہ اس جانب بڑھ گئے۔ دروازے کے قریب جا کر رب نواز نے دھیرے سے آواز دی۔

”علی......!“

”آجاؤ......! اندر آجاؤ۔“ اندر سے درویش بابا کی آواز آئی تو ان میں سے ایک باہر کھڑا رہا اور دو اندر چلے گئے۔ درویش بابا جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہمیں علی سے ملنا ہے۔“ رب نواز نے کہا

”وہ تو یہاں سے چلے گئے ہیں۔“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”چلے گئے، کب......؟“ رب نواز نے حیرت اور بے چارگی سے کہا۔

”کافی دن ہوگئے ہیں۔“ انہوں نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

”بابا جی......! آپ کو تو پتہ ہوگا، میں نے اپنی بہن......“ رب نواز نے کہنا چاہا تو درویش بابا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”رب نواز......! مت گھبراؤ......! وہ جہاں بھی ہے، بالکل محفوظ ہے۔ علی نے اسی دن اسے ایک محفوظ جگہ پر بھجوا دیا تھا۔“

"کہاں ہے وہ محفوظ جگہ......! دیکھیں باباجی......! میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، میں بس آخری بار اپنی بہن سے مل لینا چاہتا ہوں۔اللہ کے لئے......"

"رب نواز......! میں تمہاری حالت سمجھتا ہوں۔سنو......! علی نے اس دن اسے فرزانہ کے پاس بھجوا دیا تھا، جس نے یہ مدرسہ بنوایا ہے، وہ شہر میں رہتی ہے۔"

"اس کا کوئی اتہ پتہ......!۔"

"تمہیں حیرت تو ہوگی، لیکن بتا دیتا ہوں۔مگر اس سے پہلے ایک بات کہنا چاہوں گا۔ اپنے محسنوں کا نقصان نہیں کرتے۔اگر کوئی توبہ کرلے تو اللہ بھی اسے معاف کر دیتا ہے۔" درویش بابا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا؟"

"صبر کرو گے نا تو بہت کچھ سمجھ میں آجائے گا۔یہ بات اس نوجوان کے لئے بھی ہے۔" درویش بابا نے اس دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔"فرزانہ بیٹی، شہر کے رئیس امین خان کی بیٹی ہے۔"

"سردار امین خان......!" دوسرا نوجوان چونک اٹھا۔"باباجی، وہ تو ہمارا دشمن ہے، اس نے ہی تو ہمارے خان سائیں کے خون پر سیاست کی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔اگر تم لوگ صبر سے کام لو گے، اور بہت سوچ کر قدم اٹھاؤ گے تو وہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔مہرو بیٹی سے ملو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔"

"باباجی......! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نوجوان نے کہا تو درویش بابا بولے۔

"بہت سارے فیصلے ہو چکے ہوتے ہیں۔جاؤ جا کر مہرو بیٹی سے ملو......! تمہاری سوچ بدل جائے گی۔اگر ایسا نہ ہوسکتا تو میں نے بتانا ہی نہیں تھا کہ مہرو بیٹی ہے کہاں پر۔بار بار سمجھا رہا ہوں کہ صبر سے کام لینا۔" درویش بابا نے کہا۔تو وہ دونوں ہی سوچ میں پڑ گئے۔"اب جاؤ۔اس صحرا سے نکل جاؤ۔"

انہوں نے کہا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔باباجی نے آنکھیں بند کیں اور اپنی ہی دنیا میں ڈوب گئے۔وہ تینوں مدرسے کے باہر آگئے۔جیپ میں بیٹھ جانے کے بعد ایک نوجوان نے پوچھا۔

"اب کدھر جانا ہے؟۔"

"سنا نہیں تھا، صحرا سے نکل جانے کو کہا گیا ہے۔مہرو سے ملنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ

کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔فدا حسین سے ملتے ہیں۔صبح ہونے تک شہر پہنچ جائیں گے۔" اس نوجوان نے کہا تو دوسرے نے جیپ کو گیئر لگا دیا۔لمحہ بہ لمحہ وہ مدرسے سے دور ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

قاسم شاہ کو دفن کیے تین دن ہو گئے تھے۔لوگوں کا ایک ہجوم آکر چلا گیا تھا۔اس صبح سورج ابھی طلوع ہونے کو تھا۔سیدن شاہ حویلی کے ہال کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔اس وقت ملازمین سارے ہی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے لیکن اتنی بھیانک خاموشی حویلی پر طاری تھی کہ خوف آتا تھا۔اکلوتے بیٹے کے قتل پر سیدن شاہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔یہاں تک کہ اس نے ایف آئی آر بھی درج نہیں کروائی تھی۔اپنے بیٹے کی نعش دیکھنے سے لے کر اب تک اس کی آنکھ سے آنسو نہیں بہا تھا۔اور نہ ہی اسے نیند آئی تھی۔کہتے ہیں کہ درندے آنسو نہیں بہایا کرتے۔جس وقت ان آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تب ان کے اندر کی درندگی ختم ہو جاتی ہے۔آنسو نہ بہانا ہی دراصل درندگی کی وجہ ہوتی ہے۔وہ پوری طرح سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔اس کی کہانی تو ختم ہو چکی تھی۔ایک بے مایا اور بے اہمیت شخص کے ہاتھوں اس کے وارث کے قتل نے سیدن شاہ کی پوری زندگی کی حکومت اور دبدبے پر لکیر پھیر دی تھی۔اس سے بڑی ہار اور کیا ہوسکتی تھی۔اس کے پاس بچا ہی کچھ نہیں تھا۔وہ سیدن شاہ جس کے خوف سے پورا علاقہ تھراجاتا تھا۔اکلوتے بیٹے کا ماتم بھی پوری طرح نہیں کر پایا تھا۔اس کی حویلی میں بہت لوگ آئے تھے وہ پاگل نہیں تھا کہ دیکھ نہ سکے، کس کی آنکھ میں ہمدردی ہے، بہت کم لوگ ایسے تھے، زیادہ تر اس کی بربادی کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ساری زندگی کیا کرتا ہے۔

"پیر سائیں......! باہر پولیس آئی ہے، ایک پولیس والا اپنا نام رفاقت باجوہ بتاتا ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" حویلی کے ایک ملازم نے بڑے دھیمے سے انداز میں بتایا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔پھر بولا۔

"ٹھہرو......! میں ابھی آتا ہوں، پھر اسے بلانا۔" سیدن شاہ نے کہا اور اپنے کمرہ خاص میں چلا گیا۔پھر تھوڑی دیر میں وہ واپس آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور ملازم سے کہا۔"جاؤ......! اسے بلا لاؤ۔"

ملازم واپس پلٹ گیا۔اور سیدن شاہ اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی سی دیر کے بعد رفاقت باجوہ اندر داخل ہوا۔

"مجھے معلوم تھا رفاقت باجوہ تم آنے والے ہو۔" سیدن شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر......! آپ آرہے ہیں میرے ساتھ۔" رفاقت باجوہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں......! مجھے گرفتار کرنے کا تمہارا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔ میں اب اور ذلت برداشت نہیں کرسکتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور نکالا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے وہ رفاقت باجوہ پر گولی چلا دے گا۔ وہ ابھی یہ سمجھ ہی نہ پایا تھا کہ سیدن شاہ نے اپنی کنپٹی پر نال رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ سیدن شاہ نے خودکشی کرلی تھی۔

☆☆☆

فرزانہ خاں کی لگژری جیپ روہی کی جانب رواں دواں تھی۔ جیسے ڈرائیور بہت محتاط انداز میں چلا رہا تھا۔ علی آگے بیٹھا ہوا تھا جبکہ پچھلی نشست پر فرزانہ اور مہرو بیٹھی ہوئیں تھیں۔ مدرسہ قریب آنے والا تھا۔ انہیں دور سے کچی بستی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر جیسے ہی انہوں نے کچی بستی پار کی جنڈ کے درخت تلے صف بچھائے درویش بابا بیٹھے ہوئے تھے جیسے ہی وہ جیپ سے اترے، انہیں دیکھ کر درویش بابا کھڑے ہوگئے۔ ملانے ملانے کے دوران احمد بخش بھی مدرسے کے اندر سے آگیا۔ وہ بھی ملا تو سبھی میاں جی کی قبر پر چلے گئے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ صف پر ہی بیٹھ گئے۔ تبھی مہرو نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندھیرا چھٹ جانے کے بعد روشنی کتنی اچھی لگتی ہے۔ میرا سانول تو بہت خوش ہوگا۔"

"ہاں مہرو......! وہ بہت خوش ہوگا۔"

"تو اب مجھے یہاں رہ کر کیا کرنا ہے، مجھے اپنے سانول کے پاس جانا چاہیے۔" اس نے کہا تو علی نے فوراً کہا۔

"نہیں......! ابھی نہیں جانا تم نے، جب اللہ چاہے گا نا، اس وقت جانا، ابھی تو تجھے بہت سارے کام کرنے ہیں۔ تم کہتی نہیں ہو کہ سانول کا خون رنگ لائے گا۔ بہار آئے گی۔ تو وہ کیسے آئے گی۔ تم یہاں رہو گی نا تبھی دیکھ سکو گی بہار۔"

"ہاں......! یہاں بچے پڑھیں گے، انہیں پورے علاقے سے میں ہی تو لاؤں گی۔ تم ٹھیک کہتے ہو علی میں ابھی سانول سے کہہ دوں گی، میں نے ابھی نہیں آنا۔ کچھ دن بعد آؤں گی۔"

"ہاں......! ایسا ہی کرنا ہے۔" علی نے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

تب علی نے درویش بابا سے پوچھا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں فقیر سائیں......!"

"اور احمد بخش تم۔" علی نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "درویش بابا بتا رہے تھے کہ رب نواز ایک رات یہاں آیا تھا، اب کہاں ہے؟"

"اس نے سیدن شاہ کی خودکشی سے پہلے ہی خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے پولیس اسے گرفتار کرنے آئی تھی۔ وہ اب جیل میں ہے۔" علی نے کہا تو مہرو بولی۔

"اس نے سب کو معاف کر دیا ہے، میں نے اسے کہا تھا، اب اللہ اسے معاف کر دے گا۔"

پھر کافی دیر یونہی باتوں کے بعد علی نے درویش بابا کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ نے مجھ سے اور میں نے آپ سے ایک بات کہنا تھی۔ میں آج وہی سننے کے لئے آیا ہوں۔"

"مجھے بھی انتظار تھا، فقیر سائیں......! پہلے میں کہتا ہوں، پھر آپ کہیے گا۔" یہ کہہ کر اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ بہت سارے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں۔ ان میں انسان چاہے بھی تو دخل نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ عشق ہے نا، جہاں بندے کو خود اپنا آپ بدلنے پر مجبور کرتا ہے، وہاں وہ اسے بھی بدل دیتا ہے جس سے وہ عشق کر رہا ہو۔ فرزانہ نے تمہیں بدل دیا۔ یہ مانتے ہو نا فقیر سائیں۔"

"بے شک۔" علی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ "میں نے پہلے ہی اس کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ تم میری محسن ہو۔ مجھے وہ عشق ملا۔ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"اب آپ کہیں۔" درویش بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو علی نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر کہا۔

"اس دنیا میں ہم کیا کرتے ہیں، عمل، وہ اچھا ہے یا برا، اور یہی شے آخرت میں جانے والی ہے۔ عمل......! جس کا عمل جو بھی ہے، جیسا بھی ہے وہی شمار ہوگا۔ یہ حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں جانے والا۔ ہمارے اعمال ہی آخرت میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تو درویش بابا جس کے اعمال قبول ہوگئے وہی سرخرو ہوا۔ اور عشق وہ تحریک ہے جو کسی عمل کو پورے خلوص سے مقبول بناتی ہے۔ بات محض قبولیت کی ہے۔ کسی کا ذرا سا عمل اللہ کو پسند آگیا تو کامیاب ٹھہرا۔ کسی کی

صدیوں کی ریاضت کو ایک جانب رکھ دے تو عشق کیا ہوا درویش بابا.....!''

''بلاشبہ عمل......!'' درویش بابا نے کہا تو علی نے کہا۔

''عشق کو غور سے دیکھیں، عشق کے عین کا مطلب، عمل ہے۔ جو کیا جاتا ہے، عشق کے شین کا مفہوم ہے شدت، یہ نہ ہو تو بندہ منافقت کی سرحدوں تک جا پہنچتا ہے۔ اور عشق کے قاف کا معنی ہے، قبولیت۔''

''یعنی عمل میں پورے خلوص سے شدت ہو تو قبولیت ہوتی ہے۔'' درویش بابا نے کہا تو علی مسکرا دیا۔ اور پھر بولا۔

''درویش بابا، گواہ رہنا، جس طرح میں نے فرزانہ کی محبت کو پوری شدت کے ساتھ قبول کیا، اسی طرح ہمارا مقصد بھی قبول ہو جائے۔ یہی ہماری نیت ہے۔''

''اللہ......! بہترین قبول کرنے والا ہے۔'' اس نے کہا اور شدت سے نعرہ لگایا۔ ''حق اللہ......حق حق حق......!''

وہاں موجود سب کو یہی لگا کہ یہ نعرہ پورے صحرا میں گونج گیا ہے۔

❁

علی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"یہ لو بیٹا ناشتہ......!"

"ٹھیک ہے۔" علی نے کہا اور اپنے سامنے پڑا ہوا پراٹھا کھانے لگا۔ اس نے بڑی نفاست سے ناشتہ کیا اور چائے کا کپ لے کر بولا۔ "امی بہت اچھا ناشتہ تھا۔"

اس کے یوں کہنے پر نگہت بیگم نے خوف ملے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔ "بیٹا......! تم پہلے والے علی کیوں نہیں ہو۔ اس قدر کیوں بدل گئے ہو کہ مجھے تم سے خوف آنے لگا ہے۔ کہیں خدانخواستہ......" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ جس پر اس نے بڑی مشکل سے قابو پایا تو علی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی......! ہم انسان کتنے لاپرواہ ہیں۔ کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ اپنے اچھے، برے کا خیال ہی نہیں کرتے۔ میں لاپرواہ تھا، لیکن پچھلے دنوں میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اتنا قریب سے کہ سمجھیں ایک بار مر کے دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ اچھا......! آپ کیا سمجھتی ہیں۔ جو بندہ موت کو اپنے قریب سے دیکھ لے تو کیا وہ پھر بھی لاپرواہ رہے؟"

"اللہ پاک نے تمہیں زندگی دی ہے۔ اس کا شکر ادا کرو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بالکل یوں ہو جاؤ کہ جیسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" نگہت بیگم کو کچھ کہنے کے لئے سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس دوران علی نے چائے کا کپ ایک جانب رکھ دیا۔

"دنیا......! اور اس کی حقیقت......" علی نے مسکراتے ہوئے کہا، "ہاں، آپ کی یہ بات ٹھیک ہے کہ اب مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور اب بس یہی کروں گا۔"

"کیا مطلب......؟"

"کچھ نہیں امی، آپ پریشان نہ ہوں۔" علی نے اٹھتے ہوئے کہا تو نگہت بیگم نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"ادھر بیٹھو......! اور مجھے صاف صاف بتاؤ تم کیا چاہ رہے ہو۔"

"امی......! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ میں جو کچھ بھی چاہوں گا، اچھا ہی چاہوں گا۔ اس میں کسی کا بھی نقصان نہیں ہوگا۔" علی نے کھڑے کھڑے کہا تو نگہت بیگم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس پر علی نے اپنی ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔ "امی......! آپ بتائیں، آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میرے

متعلق آپ کے ذہن میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا......! تم جاؤ ابھی، میرے پہلے والے علی بن کر آؤ، پھر میں تمہارے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔ ابھی جاؤ۔" نگہت بیگم نے لرزتی آواز میں کہا تو علی دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر اپنی ماں کے چہرے کی طرف بڑے پیار سے دیکھا اور اٹھ گیا۔

اسی رات جب وہ سارے کھانا کھا کر صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے تو فائزہ نے علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی......! ویسے آپ پہلے سے زیادہ سنجیدہ سے نہیں ہو گئے۔"

"تمہیں یہ کیسے محسوس ہوا؟" علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ آپ کا حلیہ درست ہوگا تو آپ پھر سے وہی پہلے والے علی بن جائیں گے، لیکن یہ سب ہونے کے بعد بھی آپ کے چہرے پر وہی سنجیدگی ہے۔ ایسا کیوں؟" فائزہ کہتے کہتے آخر میں زور دے کر بولی۔

"ویسے علی بھائی، آپ بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔" احسن نے شکوہ بھرے انداز میں کہا، "آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کتنے پریشان تھے۔"

"کیا سنو گے!" علی نے براہ راست احسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس سمجھ لو، ان تھوڑے سے دنوں میں زندگی کی ایک طویل مسافت طے کر لی ہے۔ اتنی لمبی مسافت کہ جہاں سے لوٹ کر آنا اب بہت مشکل ہے۔" اس نے کہا تو نگہت بیگم جیسے پھٹ پڑی۔

"تمہاری یہی الجھی ہوئی باتیں مجھے بہت خوف زدہ کر رہی ہیں علی......! تم بتا کیوں نہیں دیتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی ہے اور تم ایسے......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی، اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"امی......! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آپ سنیں گی تو آپ کو بہت دکھ ہوگا۔" علی نے دھیرے سے کہا۔

"لیکن بیٹا......! اس سے بہت سارے شک پیدا ہو رہے ہیں۔" غلام نبی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "شاید تم اس اذیت کو نہ سمجھ سکو جو ہم تھانے جا کر برداشت کر چکے ہیں۔ انہوں نے تمہارے بارے میں اتنی باتیں کی تھیں کہ شاید ہم تمہیں غلط سمجھنا شروع کر دیتے اگر ہمیں تم پر یقین نہ ہوتا تو۔"